

## مُقَدِّمَةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مسلمان کیا کریں؟

مسلمان اپنے مسلمان ہونے کا مطلب کچھ سمجھیں تو یہ سوال حیرت ناک و عبرتناک ہی نہیں انتہائی شرمناک بھی ہے! اسلام کے حق میں خود سراپا رسوائی راقم نابکار اپنے بھائیوں کی جن باتوں کو دیکھ سُن اور پڑھ کر گڑھتا ہے، ان میں اس سوال و بحث کا نمبر شاید سب سے بڑھ گیا۔ جب تک ہمارے بعض اجنار اٹ رسائل میں اس کا چرچا رہا جب کہیں نظر پڑ جاتی دل و دماغ پرتازہ بم پھٹتا۔

غضب خدا کا جس اسلام پر ہم کو ایمان کا دعویٰ ہے اور جس کا دعویٰ یہ ہے کہ "دین" و "نعمت" ہر جہت سے کامل و مکمل فرما کر رہتی دنیا تک انسان کی صلاح و فلاح کے لئے اپنی رضا مندی کو بالکل پیہ خدا نے اس کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، وہ معاذ اللہ چودہ سو سال کے اندر ہی ایسا فرسودہ و ناکارہ نکل گیا کہ خود اس کے نام لیوا بڑھواس پوچھتے پھر میں کہ مسلمان کیا کریں؟ اور جواب کے لئے اپنوں ہی نہیں پرائیوں تک کا منہ تکتے پھر میں کاش زمین پھٹ جاتی اور اسلام اور اس کے خدا و رسول کو رسوا کرنے والے ہم مسلمان اس میں دھنس جاتے۔

پھر جب سوال یہ ہے کہ مسلمان کیا کریں؟ تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جاسکتا ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر یا اپنی اسلامیت کے انفرادی واجتماعی



# فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۰	خدا کا سائنسی اور فلسفیانہ تصور	۵۶	ازمیت
۲۱	ایک اور نیم عقلی اور نیم مذہبی تصور	۱	والعصر
۲۱	مشرکانہ تصور	۱	عصر کے معنی اور اس کا مفہوم
۲۲	خدا کا کامل اور جامع تصور	۲	غلط نظریہ حیات
۲۲	خالقیت، ربوبیت اور قیومیت کی یک جہتی	۲	صحیح تصور حیات
۲۲	علم و حکمت کاملہ	۵	ان انسان لغی خمس
۲۲	کائنات کا ماضی و مستقبل دونوں حکمت	۵	توحید اور ایقان آخرت ایمان کی اساس ہے
۲۲	مشیت الہی کے ماتحت ہیں۔	۸	علت و معلول کے لزوم کا فلسفہ ختم ہو چکا
۲۴	اسی لئے "آج" سے زیادہ "کل" کے ایقان	۹	ہر فعل و اثر بالذات اور بلا شرکت غیر
۲۴	کا مطالبہ ہے	۹	خدا ہی کے قبضہ میں ہے
۲۹	مسلمانوں میں ایمان باللہ سے بھی زیادہ	۱۲	انسان کی ساری زندگی جلب منفعت
۲۹	"ایقان آخرت" پیدا کرنے کی ضرورت	۱۲	اور دفع مضرت کے درمیان متحرک ہے
۳۲	الذین امنوا و عملوا	۱۲	الالہ کے اقرار کا دہریہ و خارجی اثر
۳۲	الصلحت	۱۲	اس اقرار کی قوت
۳۲	ایمان اور عمل صالح میں صرف ایک	۱۴	ہمارے اہل علم و ذہد بھی توحید کے معاملہ
۳۲	حرف عطف کا فرق ہے	۱۴	میں عملاً کمزور ہی ہیں۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۹	مسلمانوں کی حکومتیں اپنی ذمہ داری سے آگاہ نہیں	۳۲	کوئی نظریہ دعوت اپنے عملی ظہور و طاقت کے بغیر موثر نہیں ہو سکتا۔
۴۹	محکم مسلمان بھی حاکم قوم پر اپنی سیرت سے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔	۳۳	ایمان سے عمل میں حرکت اور عمل سے ایمان میں قوت ہم دین کے معاملہ میں محض دعوتِ ایمان پر مطمئن ہیں۔
۵۰	اس کی چند تاریخی مثالیں	۳۷	
۵۳	چند صالح افراد سے ساری امت خیر امت نہیں بن سکتی۔	۳۸	ہمارے خواص کی حالت بھی حیرت و عبرت کا مجموعہ ہے
۵۳	امتِ مبعوثہ کی موجودہ زبوں حالی	۴۰	زندگی کے سوشل پیلو کی اہمیت اور اس سے عمومی غفلت
۵۵	اس زبوں حالی کے اسباب کا اجمالی جائزہ		
۶۰	اسلام کی تبلیغ و تفہیم میں عقائد سے زیادہ اہم معاملات و اخلاق ہیں	۴۳	ایمان اور عمل پر متوازی توجہ ہی خسران کا واحد علاج ہے
۶۴	جب تک امت مسلمہ خیر امت کے معیار پر نہیں پہنچائی جاسکتی انسانیت خسران سے نہیں بچ سکتی	۴۳	وَلَوْ اَصْحَابُ الْاِحْقَاقِ وَتَوَاصُوا بِالصِّدْقِ
۶۹	علماء کی خصوصی ذمہ داری اور ان کا امتیازی مقام	۴۳	خسران سے کابل بچاؤ کیلئے کل انسانیت پر تبلیغ ضروری ہے
۶۹	مقتدرہ طریق کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے	۴۴	اب صلاح و اصلاح کی ذمہ داری امتِ محمدیہ پر ہے
۷۲	ہمارے دینی کام بھی انبیائی روح سے محروم ہیں۔	۴۶	انسانیت کے بناؤ بگاڑ کی ذمہ داری مستقل امت پر ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۱	عوام کے دینی شعور کی تباہی۔	۷۲	اچھے اچھے علماء بھی دنیا پرستانہ دعوتوں سے مرعوب ہیں۔
۱۰۵	اعزاء و اقربا سے اغماض۔		
۱۰۸	صحتِ روحانی کی فکر نہ رہی!	۷۲	دینی مدارس میں "قال" سے بڑھ کر "حال" کی تربیت ضروری ہے۔
۱۰۹	ہماری جدید درسگاہیں ایمانی قتل گاہیں ہیں		
۱۱۳	منکرات کا سرچشمہ جدید تعلیم ہی ہے	۷۵	قرآن مجید کتاب ہدایت نہیں بلکہ نظام ہدایت ہے
۱۱۵	مخلوط تعلیم خود دنیوی نظر سے بھی تباہ کن ہے	۷۶	سورہ والعصر میں اس کی خاص تعبیر
۱۱۶	علم کا مقصد اولین خود اپنی ذات کی معرفت ہے	۷۷	معروف و منکر کے قرآنی نظام کے پیکار گاہ اجرام
۱۱۷	نئی تعلیم کا حشر نئی دنیا والوں کی زبانی۔	۷۷	(۱) ایک مستقل امت درامت کی ضرورت
۱۲۵	جدید تعلیم کا دھارا سیاسی قومی اسلام کی طرف	۸۱	(۲) سارے افراد میں دینی خیر طلبی کے عملی ظہور کی ضرورت۔
۱۲۵	قدیم مدرسے نصاب میں مناسب جدید تبدیلی کے ساتھ شمالی در سگاہ کے قیام کی ضرورت		
۱۲۷	ساتھ ہی عمومی امور بھی کی اہمیت	۸۵	(۳) جو جتنا قریب ہے اس کے اصلاح کی اتنی ہی ذمہ داری۔
۱۲۸	غیر تعلیم یافتہ ٹہنی مسلمانوں میں دعوتِ خیر کی ضرورت۔	۹۵	(۴) خیر امت بن کر پوری انسانیت کا فریضہ
۱۲۹	اصلاح کی فوری تدبیر	۹۵	پھر خلافتِ ارضی پاکر حکومت کو شریعت کی خدمت کا ذریعہ بنائے رکھنا۔
۱۳۴	کچھ مزید و مکرر	۹۷	نظام امر بالمعروف نہی عن المنکر پر امت کی پرکھ۔
۱۳۲	انبیائی کام کی ذمہ داری اب علمائے امت پر ہے۔		
		۹۷	علماء و خواص کی زیوں حالی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۸	بے ذہنی قالب میں ذہنی مقاصد کی روح کو باقی رکھنے کی کوشش بے سود ہے۔	۱۳۲	معروف و منکر کے امر و نہی کا چرچا بھی ہو اور معروف کی قدر اور منکر کی تحقیر بھی پیدا کی جائے۔
۱۵۸	اسلام کا مقصد بھی ہے اور حصول مقصد کے وسائل بھی بتا دیئے گئے ہیں۔	۱۳۹	»تغییر منکر« والی سنت کی تلقین و تاکید
۱۶۲	ہماری شرمناک صورت قرآنی آئینہ میں ایسا ہی صحت کی ذرا بھی فکر نہیں۔	۱۴۵	علماء و مشائخ کی ذمہ داری
۱۶۵	علماء و خواص کا ایمان تک انفعالی ہو کر رہ گیا ہے۔	۱۴۶	مخلص مشائخ کی معروف و منکر کے امر و نہی سے غفلت کا سبب
۱۶۸	بہت سے منکرات کو ہم معمولی اور ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔	۱۴۸	اہل مدرسہ علماء پر طلباء کی تربیتی ذمہ داری کا فریضہ۔
۱۶۹	جمال پسندی کا فطری جذبہ دین ہی کے معاملہ میں سرد پڑ جاتا ہے۔	۱۴۸	دین کی سیدھی اور روشن راہ
۱۷۱	خدا کی رحمانیت کا غلط تصور بھی صراطِ مستقیم سے ہٹائے ہوئے ہے۔	۱۵۱	اجتماعیت کے جدید شکلوں کی ہلاکت سیامانی
۱۷۲	ہر گناہ ایک بیماری ہے اور غفلت اس کو مہلک بنا دیتی ہے۔	۱۵۳	اشتمالیت اشتراکیت کی فریب کاری
۱۷۵	صحابہ کرامؓ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی نگہداشت۔	۱۵۴	انبیائی دعوت میں جماعت بندیوں اور ان کے مفاسد کا علاج
		۱۵۵	وقتی تدابیر اختیار کرنے کی گنجائش و صورت
		۱۵۶	فرنگی ہر راہ میں شری پیش پیش ہے۔
		۱۵۷	میکانی تمدن کی ترقی جسم و جان کیلئے بھی تو آفت ہی بنتی چلی جا رہی ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۸	ہماری پہلی حیلہ بازی	۱۷۶	خیر القرون کے بعد بھی مدت تک امروہی کا اہتمام رہا۔
۲۱۰	دوسری عذر تراشی		
۲۱۲	تیسرا بہانہ	۱۷۹	ایک خصوصی معاشری اصلاح جسکی کوشش عام ہونی چاہئے۔
۲۱۲	چوتھی شکایت		
۲۱۳	ان حیلہ جو بیوگی وجہ	۱۸۲	حکیم الامت کی امتیازی شان اصلاح
۲۱۴	اعمال کا کیا ذکر جبکہ توحید کے لالے پڑے ہیں۔	۱۸۳	اصلاح ذات البین کی قرآنی و حدیثی اثاث۔
۲۱۸	علاج بھی ایک ہی!	۱۸۷	آج کل اس اصلاحی کوشش میں وقت
۲۲۵	ضرورت باتوں کی نہیں عمل کی ہے۔	۱۸۸	موجودہ صورت حال کی ذمہ داری علماء و مشائخ کی مدافعت پر ہے۔
۲۲۹	ایک مستحکم مثالی معاشرہ پیدا کردگانے کی ضرورت		
		۱۸۹	موجودہ مصلح علماء و مشائخ کی فروگزاشت
۲۳۰	ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ	۱۹۰	توحید الہ پر زور دینے کی ضرورت۔
۲۳۲	پاکستانی مسلمانوں کی مقصد سے غفلت۔	۱۹۱	ساتھ ہی "یقین آخرت" کی تخلیق کی ضرورت۔
۲۳۳	علمائے اسلام کا فریضہ	۱۹۱	غیبی ایمان میں شہادت یقین عمل صالح ہی سے پیدا ہوتا ہے۔
۲۳۴	جمعیتہ العلماء سے اپیل		
۲۳۵	جماعت اسلامی کی الٹی منطق	۲۰۶	اہم کام معروف و منکر کے امروہی کے شعور کی بیداری ہے۔
۲۳۶	اس کا ایک وقتی فائدہ		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۸	اس کے خدمتگاروں میں ایک بڑی کمی۔	۲۳۷	اسلام کی راہ پر چلنے والی جماعت ”تبلیغی جماعت“ ہے۔
۲۴۹	دونوں جماعتوں میں اتحاد کی ضرورت		
۲۵۱	احتیاط کے ساتھ عصری مطالبات کا حق ادا کریں۔	۲۳۸	اس جماعت میں ایک بڑی کمی۔
	نظام دعوت و تبلیغ میں ہونا چاہئے	۲۴۱	”تبلیغی جماعت“ جیسی ہی جماعت سے اسلامی حکومت پیدا ہوگی۔
۲۵۶	ایک اور بات	۲۴۶	ایک اور گناہ اصلاحی جماعت
۲۶۰ ۲۸۷	علمی اشارات	۲۴۸	اس جماعت کی ایک خاص غفلت۔



## مُقَدِّمَاتُ

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مسلمان کیا کریں؟

مسلمان اپنے مسلمان ہونے کا مطلب کچھ سمجھیں تو یہ سوال حیرت ناک و عبرتناک ہی نہیں انتہائی شرمناک بھی ہے! اسلام کے حق میں خود سراپا رسوائی راقم نابکار اپنے بھائیوں کی جن باتوں کو دیکھ سُن اور پڑھ کر گڑھتا ہے، ان میں اس سوال و بحث کا نمبر شاید سب سے بڑھ گیا۔ جب تک ہمارے بعض اخبارات و رسائل میں اس کا چرچا رہا جب کہیں نظر پڑ جاتی دل و دماغ پر تازہ بم پھٹتا۔

غضب خدا کا جس اسلام پر ہم کو ایمان کا دعویٰ ہے اور جس کا دعویٰ یہ ہے کہ "دین" و "نعمت" ہر جہت سے کامل و مکمل فرما کر رہتی دنیا تک انسان کی صلاح و فلاح کے لئے اپنی رضا مندی کو بالکل پیہ خدانے اس کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، وہ معاذ اللہ چودہ سو سال کے اندر ہی ایسا فرسودہ و ناکارہ نکل گیا کہ خود اس کے نام لیوا پر جو اس پوچھتے پھر میں کہ مسلمان کیا کریں؟ اور جواب کے لئے اپنوں ہی نہیں پرانیوں تک کا منہ تکتے پھر میں کاش زمین پھٹ جاتی اور اسلام اور اس کے خدا و رسول کو رسوا کرنے والے ہم مسلمان اس میں دھنس جاتے۔

پھر جب سوال یہ ہے کہ مسلمان کیا کریں؟ تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جاسکتا ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر یا اپنی اسلامیت کے انفرادی و اجتماعی

تقاضوں اور مطالبوں کے تحت رہتے ہوئے ان کو پورا کرنے کیلئے کیا کریں؟ اس لئے  
اس کا کوئی ایسا جواب کسی طرح جائز و درست ہی کیسے ہوگا جس میں سب سے مقدم  
مسلمانوں کی "اسلامیت" یا ان کی فکری و عملی انفرادیت اور اس کی خصوصیات  
شعائر کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔

دین کی اصلی و حقیقی منزل مقصود اگرچہ "یوم دین" یا آخرت کی "خیر و البقی" ابدی فلاح ہے، لیکن اس کی تربیت گاہ یا امتحانی راستہ دنیا اور اس کی زندگی کا  
موجودہ عبوری دور ہی ہے۔ لازماً سارے دینی افکار و اعمال اس عبوری دور ہی  
میں کام لانے یا برتنے کے ہیں۔ لہذا دین اسلام میں اصولاً نہ تو دنیا سے فرار کی گنجائش  
ہو نہ اس کی تعلیمات و احکام ایسے ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں ان پر عمل تکلیف  
بالایطاق کی حد تک دشوار ہو یا اس عمل کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی ہی ان پر وبال  
ہو جائے۔ ایسا دین نہ کامل کہا جاسکتا ہے نہ نعمت کامل و نعمت تو جب ہی  
ہوگا کہ اسکے اوامر و نواہی پر عمل یوم دین یا آخرت کے راستے دنیا کو بھی زندگی کے  
ہر دوسرے راستے یا طریقے سے زیادہ امن و امان عافیت و سلامتی کا راستہ  
انفرادی و اجتماعی قومی و بین الاقوامی ہر اعتبار سے بنا دے۔ البتہ راستہ کے معنی ہی  
یہ ہیں کہ ایک طرف کچھ نہ کچھ مسافرانہ دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا اور دوسری  
طرف اس کو تا مگر راستہ سمجھ کر اور منزل کے تابع بنا کر ہی اس پر چلنا چلانا ہوگا۔ حتیٰ  
کہ راستہ کی ایسی مصروفیتوں اور دیکھ پیوں سے بھی بچنا بچانا ہوگا، جن میں منزل کا کوئی  
کھوٹا ہوتا ہو۔

اب پہلے اسلام کے بنیادی فکری مطالبات کو لیں۔ ان کا جامع و مانع

کل چار لفظوں کا ایک ہی ایجازی و اعجازی جملہ "لا الہ الا اللہ" کا مشہور و معروف کلمہ ہے۔ اللہ عربی میں اسی کو کہتے ہیں جس کو ہندی دیوتا اور جس کو انسان اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے کسی نہ کسی دائرہ میں کسی نہ کسی حد تک اپنے بناؤ بگاڑ یا نفع و ضرر میں غیبی طور پر دخل و متصرف مانتا ہے۔ پھر لازماً اسی بنا پر اس کے آگے جھکتا اور ہاتھ پھیلاتا یعنی اس سے عبادت و استعانت کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ یہ الہ یا دیوی دیوتا عرب و عجم ہندوستان و یونان کہیں کی دیوالا کے بھی ہوں، ان کے تصرف کی بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کار فرمائیوں کو عالم شہادت کے ظاہری و مادی اسباب کے پس پشت ان کے غیبی ارادہ و مشیت پر مبنی یقین کیا جاتا ہے۔

اسلام کے دعوتی کلمہ کا بنیادی مطالبہ اس کے برخلاف یہ ہے کہ شہادت و غیب کی پوری کائنات میں ایسی ارادہ و مشیت والی متصرف غیبی ذات ایک اور صرف ایک اللہ کی ہے۔ یہ مشیت ایسی ہمہ جہتی و ہمہ گیر ہے کہ اس کے چاہے تعبیر کوئی مادی و غیر مادی جاندار بے جان، حتیٰ کہ بظاہر انسان جیسی باختیار مخلوق تک بذات خود اپنی کسی مستقل قوت و خاصیت یا ارادہ و مشیت سے نہ ذرہ بھر کوئی حرکت کرتی ہے نہ کسی فعل و اثر یا نفع و ضرر کا سبب یا اس کی حقیقی علت ہوتی ہے۔ جب نفع و ضرر کی مستقل بالذات مالک و متصرف ایک ہی ذات ٹھہری، تو آپ کو آپ عبادت و استعانت کا تعلق بھی صرف اسی ذات سے جائز و درست رہ جاتا ہے۔ اس لئے کتاب اسلام کے چند سطرے دیباچہ ہی ہیں — جو دراصل کتاب کے سارے مضامین کا نچوڑ ہے — ہم سے سب سے پہلا اقرار یا جلف و فاداری ہی لیا گیا کہ

ہم صرف اور صرف تیرے ہی آگے جھکیں گے اور تیرے ہی آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔  
 یعنی تیرے سوا نہ کسی کی عبادت و اطاعت کریں گے اور نہ کسی کو حقیقی طور پر صاحب  
 اقتدار و اختیار معین و مددگار جان کر اس کے آگے سوال کا ہاتھ پھیلائیں گے۔  
 ایاك نعبد و اياك نستعين۔ یہ وہ حلف و فاداری ہے جس کو دن رات نمازوں  
 میں بار بار دہراتے رہنا ہر مسلمان پر فرض کر دیا گیا ہے۔

**انسان کا ایک ہی حقیقی مسئلہ** | درحقیقت نفع و ضرر کے حقیقی سبب و علت  
 کو جان اور پالینا ہے۔ کیونکہ انسان کی

پوری زندگی کا پنڈلم یا رقص صرف ان ہی دو نقطوں کے درمیان رقص کرتا ہے  
 ہماری زندگی کی ہر نقل و حرکت یا تو کسی نہ کسی ضرر سے بچنے کے لئے ہوتی ہے یا  
 کسی نہ کسی نفع کو پانے کے لئے۔ عالم شہادت کے لائبریری یا مادہ پرست چونکہ ہر  
 فعل و اثر کو کسی نہ کسی طبعی یا مادی سبب و علت کا سبب و معلول سمجھ بیٹھے  
 ہیں، اس لئے وہ اپنا سارا زور، مادی و طبعی اسباب و علل کی دریافت اور ان  
 ہی کو معبود و مستعان بنانے میں لگا دیتے ہیں۔ دوسری طرف عالم غیب یا غیر مادی  
 و روحانی طاقتوں کو لہنے والے مذہبی مشرکین جاندار و بے جان مظاہر قنطرت  
 آگ، پانی، سورج، تاروں، جانوروں، تک کے غیبی تصرفات کا دھوکا کھا کر  
 ان کی پوجا پاٹ میں لگ گئے یا پھر فرشتوں اور فرشتہ صفت انسانوں ایسا، واویلا  
 وغیرہ خدا کے خاص و مقبول بندوں کو خدا اور خدائی طاقتوں کا مظہر و نمایندہ بلکہ عین  
 خدا یا اوتار قرار دے کر ان کے بتوں تک کی پرستش اختیار کر لی۔

اسلام اپنے چار لفظی دعوتی کلمہ ہی کی رو سے، جس میں توحید کا داعی و

دعی ہے، مذہب اور لاندہی کے تمام ایسے اصنافِ شرک کی یک قلم نفی و انکار کرتا ہے، جن میں اصل خالق کائنات خدا کے سوا کسی بھی مادی و غیر مادی یا روحانی مخلوق کو کسی دائرہ و درجہ میں بھی بذات خود فاعل و موثر، بہ الفاظ دیگر کسی فعل و اثر یا نفع و ضرر کا مالک و مختار جانا اور مانا ہے بلکہ اسلام کا اپنے ہی متعلق نہیں، بلکہ تمام سچے دنیوں اور ان کے سچے داعیوں کے متعلق یہی دعویٰ ہے کہ ان کی دعوت بھی لا الہ الا اللہ ہی تھی۔ سورہ اعراف و ہود میں مختلف انبیاء کی زبانوں سے بار بار اسی دعوت و دعویٰ کو ان کی قوم کے سامنے دہرایا گیا ہے کہ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الدغیرہ یعنی اللہ کے سوا قطعاً کوئی دوسرا اللہ نہیں، جو تمہاری عبادت یا بندگی و قربان برداری کا حقدار و سزاوار ہو۔ لہذا اسی اور صرف اسی کی پوجا یا پرستش کرو۔ بہت بڑی غلطی اور غلط فہمی خود مسلمانوں بلکہ ان کے بہترے علماء تک کو یہ دیکھی کہ اسلام کی اصل توحیدی دعوت خدا یا اللہ کے واحد ہونے کو جانتے ہیں حالانکہ خدا و خالق تو تمام دنیا بلکہ خود عرب کے مشرک تک ایک ہی اور صرف اللہ ہی جانتے اور مانتے تھے۔ من خلق السموات و الارض لیقولن اللہ۔ شرک تو سارا کا سارا "توحید الہ" یعنی صرف ایک اللہ کی الوہیت یا اس کے بلا شرکت غیرے "الہ واحد" مانتے ہیں تھا۔ اس لئے اس حقیقت کو بار بار ہر عتوان سے دہرایا گیا ہے کہ تمہارا الہ ایک ہی الہ ہے (الہکم الہ واحد) اور اس ایک ہی الہ کے سوا کوئی قطعاً دوسرا اللہ نہیں (وہا من الہ الا الہ واحد) صرف اللہ ہی ایک الہ ہے۔ اور وہی آسمان میں بھی الہ ہے اور زمین میں بھی وہی الہ ہے۔ وہو الذی فی السماء الہ و فی الارض الہ۔ ایسا نہیں ہے کہ زمین و

آسمان کو پیدا کر کے خود کو معطل کر لیا ہو۔ اللہ ہی ہے نہ کہ کوئی دوسرا اللہ مگر وہی اللہ  
لا الہ الا اللہ ہو۔ یقیناً میرے سوا کوئی اللہ نہیں پس مجھی سے ڈرو۔ انہ  
لا الہ الا انا فاتقون۔ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ ہرگز  
نہیں، فأعلم انہ لا الہ الا اللہ۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو اللہ نہ بناؤ  
ولا تجعل مع اللہ المما آخر۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیات میں  
بار بار اس پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام کا اصل مطالبہ اللہ کے ایک یا واحد ہونے کا  
نہیں بلکہ صرف اسی کے الہ یا اللہ واحد ہونے کا ہے۔

اور صرف اسی ایک کے الہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر پر مبنی  
بندگی و فرمانبرداری کا تعلق صرف ایک سے رکھا جائے چنانچہ توحید الہ کی اسی  
ہی آیتوں کے ساتھ ہی ساتھ جا بجا اس کی صراحت بھی ہے کہ "بیشک" میں باللہ  
ہی ہوں کہ سوا میرے کوئی دوسرا اللہ نہیں، پس عبادت بھی میری ہی کرو۔ انہ  
لا الہ الا انا فاعبدون۔ حضرت موسیٰؑ کو جب بتی بنائے جانے کی اطلاع  
فرمائی جاتی ہے تو خصوصی توجہ کے ساتھ سننے اور یاد رکھنے کی مقدم ترین وحی یہی  
فرمائی جاتی ہے کہ بیشک و بے شبہ میں ہی تنہا وہ اللہ ہوں کہ میرے سوا کوئی دوسرا  
اللہ نہیں۔ لہذا بندگی و تابعداری بھی صرف میری ہی کرو۔ وانا اخترتک  
فاسمع بلایوحی اننی انا اللہ لا الہ الا انا فاعبدنی۔

دوسری طرف طبعاً و عقلاً ہر طرح ظاہر ہے کہ بندگی و تابعداری یا عبادت  
و طاعت کا واحد حقیقی حقدار وہی ہوگا جس کے ہاتھ میں حقیقتاً ہر طرح کا نفع و ضرر  
ہو۔ ہر شے اللہ سے کاٹ کر صرف اللہ کے ساتھ انسان کو جوڑنے والے موحد

صیغہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے انسان کو اس کی  
 انسانیت پر تھوکنے والی انتہائی ذلت و رسوائی کا سراو اور اسی بدولت تو ٹھیرایا  
 گیا ہے کہ "کیا تم خدا کو چھوڑ کر ایسوں کی بندگی پر اترتے ہو جو نہ تم کو کوئی نفع  
 پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، تھو ہے تم پر اور ان پر بھی جن کی تم بندگی کرتے ہو کہ اتنی  
 سی بات بھی نہیں سمجھتے۔" افتعبدون من دون الله مالا یفعلکم ولا  
 یضرکم اذ لکم ولما تعبدون اذ لا تعقلون۔

سورہ نمل کے قریباً پورے پانچویں رکوع میں نفع و ضرر کی مختلف چیزوں  
 کی طرف توجہ دلا کر بار بار اس طرح چیلنج دیا گیا ہے کہ دیکھو

"جس ذات نے سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا آمن خلق السموات والارض  
 اور آسمانوں سے پانی برسایا جس سے ہرے بھرے باغ وانزل لکم من السماء ماء  
 اگائے ورنہ تم ان باغوں کو ہرگز نہ اگاتے تو بھلا بتاؤ فانبتنا بحلقات ذات بجملة  
 کہ ایسے اللہ کے ساتھ (اس کا شریک) کوئی دوسرا ماکان لکم ان تنبتوا شجرها  
 الہ ہو سکتا ہے پھر بھی (یہ شرک) دوسروں کو اللہ کے ءالہ مع اللہ دہل ہم قوم  
 برابر ٹھہراتے ہیں اس طرح جس ذات نے زمین کو مخلوق یعدلون ہامن جعل الارض  
 کیلئے قرار گاہ بنایا اس کے درمیان درمیان دریا نکالے قرارا وجعل خلالها انهاراً  
 او طاس کے جماؤ کیلئے پہاڑ بنائے اور سمندروں کے بیچ وجعل لہا سواسی وجعل بین  
 میں فاصل بنائی کیا ایسے اللہ کے ساتھ کوئی اور الہمیرین حاجزاً ءالہ مع اللہ  
 الہ ہو سکتا ہے مگر یہ شرک کرنے والے اکثر اذاتنے بل اکثر ہم لا یعدلون ہامن  
 نادان ہیں کہ ایسی کھلی بات بھی نہیں جانتے اعلیٰ ہذا یحییٰ لمضطر اذا دعاہ ویکشف

جب کوئی مصیبت زدہ بیقرار ہو کر اُسکو پکارتا ہے اور السوء و يجعلکم خلفاء الارض  
وہ اس کی مصیبت کو دور فرمادیتا ہے (اس سبب سے) ءالہ مع اللہ ط قلیلا ما تذکر  
بڑھ کر یہ کہ تم خود انسانوں کو اس زمین پر (بیت کچھ) امن یمہد یکم فی ظلمات البر  
تصرف و اختیار عطا فرما کر اپنا نائب یا جانشین بنا والبحر و من یرسل الریاح  
رکھا ہے۔ کیا ایسے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا اللہ بشر ابین یدی رحمتہ ءالہ  
ہو سکتا ہے! مگر تم اس (احسان و حقیقت) کو بھی مع اللہ تعالیٰ اللہ عما یشر کون  
بہت کم یاد رکھتے ہو اچھا اور بٹا و جزوات تم کو امن یمہد الخلق ثم یعیدہ  
خشکی و سمندر کی تاریکیوں میں راستہ دکھاتی ہے اور جو ومن یرزقکم من السماء  
ہواؤں (یا انسانوں) کو اپنی رحمت (بارش) کی والارض ءالہ مع اللہ  
خوشخبری سنانے کو بھیجتی ہے کیا ایسے اللہ کے ساتھ قل ہاتوا برہانکم ان کنتم  
کوئی دوسرا (اس کا شریک) سیم) اللہ ہو سکتا ہے صادقین۔

ایسے اللہ تعالیٰ کی شان شریکوں یا سا جھپوں سے  
بہت بڑی زیادہ ذات جو مخلوق کو پہلے پہل پیدا کرتی اور  
پھر ویسی ہی برابر پیدا کرتی رہتی ہے اور جو تم کو آسمان زمین سے  
رزق عطا کرتی ہے کیا ایسے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا  
اللہ مانا جا سکتا ہے ایسی ایسی شہادتوں اور دلیلوں کے  
مقابلے تم اللہ کے سوا دوسروں کو اللہ بنانے کی کوئی  
دلیل رکھتے ہو تو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

آگے اس سے بڑھ کر نیز تحدی سورہ واقعہ میں پڑھ لیں کہ :-



ہ بناؤ جو کچھ تم بولتے ہو اس کو اگاتے تم ہو یا ہم ہیں  
 افرء یتیم ماشر ثون ۵ ء انتم تنز عونہ  
 اگاتے والے! اگر ہم چاہیں تو ساری پیداوار کو  
 امر نحن الزارعون ۵ لو نشاء  
 چور چور کر کے رکھ دیں جس کے بعد تم ایسی باتیں  
 لجعلنا حطاماً فظلمتم تفکھون  
 بناتے رہ جاؤ کہ ہم تو نرا نرا اگاتے ہی میں پڑ گئے  
 انا المعرمون ۵ بل نحن مھرمون  
 تو بچی تک کھو بیٹھے۔ اور بتاؤ کہ جو پانی تم پیتے ہو  
 افرء یتیم الماء للذی تشر یونہ  
 اس کو بادلوں سے تم اتارتے ہو یا ہم ہیں اتارنے  
 ء انتم انزلتموه من المزن ام  
 والے! اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر چھوڑ دیں اس پر  
 نحن المنزلون ۵ لو نشاء جعلنا  
 بھی شکر کیوں نہیں کرتے۔ اسی طرح دیکھو کہ جس  
 اجا جافلوا لا تشکرون ۵ افرء یتیم  
 آگ کو تم سلگاتے ہو اس (کی لکڑی) کا درخت  
 النار الی تو رمون ۵ ء انتم انشائم  
 تم نے پیدا کیا یا ہم ہیں پیدا کرنے والے۔  
 شجر تھا ام نحن المنشون ۵

اور بھی جا بجا کثرت سے مختلف تکوینی یا طبعی مظاہر و آثار کو بالذات اللہ تعالیٰ ہی  
 کے علم و ارادہ کا مخلوق و محمول قرار دے کر اسی بنا پر غیر اللہ کے الٰہ یا شریک  
 ہونے کی شد و حد سے نفی فرمائی گئی ہے:

تمہارا رب ہی پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور وربك یخلق ما یشاء ویختار  
 پسہ کرتا ہے دوسروں کو (جن کو تم نے اللہ کا  
 ما کان لھما الخیرۃ ۵ سبحان  
 شریک بنا رکھا ہے) کوئی اختیار حاصل نہیں اللہ  
 اللہ و تعالیٰ عما یشرکون ۵  
 تعالیٰ اس شرک سے پاک و برتر ہے اور تمہارا رب وربك یعلم ما تکن صدورھم  
 وہ سب کچھ چاہتا ہے جو یہ اپنے سینوں میں چھپاتے  
 وما یعلنون ۵ وہو اللہ  
 ہیں اور جو کچھ (اپنی زبانوں یا افعال و حرکات سے) لا الہ الاھود لہ الحمد

ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہ فقط اللہ ہی ہے کہ جن کے سوا فی الاولیٰ والاخرۃ ولہما حکم

کوئی الہ نہیں (لازمًا) جدو تائیں بھی از اول تا آخر والیہ ترجعونہ (قصص)

فقط اسی کا حق ہے اور اسی کا حق قرآنِ ودائی

بھی ہے اور بالآخر تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

آگے اس اللہ کی بلا شرکت غیرے "الہیت" کے ثبوت و شہادت ہی میں حضور کو حکم ہے کہ ان کو چیلنج دے کر پوچھو کہ :-

اگر اللہ تم پر ہمیشہ قیامت تک ات ہی رات مسلط

رکھے تو اس کے سوا کون دوسرا الہ ہے جو تمہارے

لئے دن کی روشنی لاسکے! کیا تم (توحید الہ کی ایسی

واضح نشانیوں کو بھی) نہیں سنتے سمجھتے۔ اسی طرح ان سے

پوچھو کہ اگر اللہ تم پر قیامت تک دن ہی دن مسلط

رہنے دے تو اس کے سوا کون دوسرا الہ ہے

جو تمہارے لئے رات لاسکے، جس میں تم آرام لو، کیا

تم یہ سب دیکھتے سمجھتے نہیں! لہذا یہ اس کی رحمت

ہی تو ہے کہ اس نے (صرف ات یادن کے بجائے)

رات اور دن دونوں بنائے کہ رات میں آرام اور دن میں

روزی روزگار کے کام دھندوں میں لگو اور ایسی

ایسی بی شمار نعمتوں پر اللہ کا شکر بجالاؤ۔

(قصص ۷۷)

غرض اسلام کا خدائہ فلسفیوں کا خدا ہے جس نے زمین آسمان کی کائنات اور

انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ان کو کچھ پیدائشی یا طبعی خواص و اختیار دے کر مطلق العنان چھوڑ دیا اور خود ریاضی یا معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ وہ مشرکوں کا خدا ہے جس نے کائنات کے کارخانے کو چلانے کے لئے کچھ مختار قسم کے ایجنٹ یا کارکن مختلف اہول یا دبی دلیوتاؤں کی صورت میں مقرر کر رکھے ہیں۔ نہ وہ اپنے علم و قدرت میں معاذ اللہ ایسا محدود و عاجز ہے کہ کبھی تھک اور سو جاتا ہو اور نہ اپنے خود اپنی مخلوقات کی نگرانی و خبر گیری سے قاصر ہو۔ اس کے برخلاف اسلام کے عین کلمہ دعوت لا الہ الا اللہ ہی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا "اللہ" محض خالق نہیں بلکہ اپنے علم و قدرت ارادہ و مشیت تمام صفات و کمالات میں ایسا نامحدود و ہمہ گیر ہے کہ وہ خود ہی براہ راست اپنی تمام زمین و آسمان کی مخلوقات کا رب و قیوم بھی ہے۔ یعنی جاندار و بے جان تمام موجودات کو اس نے وجود صرف بخشنا ہی نہیں، بلکہ اس وجود کا مسلسل بقا و قیام بھی تمام تر اللہ کی قیومیت و مشیت سے ہے نیز وہی براہ راست ان کا رب یا پروردگار و نگران کار بھی ہے۔ یعنی مختلف موجودات کے جو مختلف افعال و آثار نظر آتے ہیں، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی ربوبیتی و پرورش کی شان کے مظاہر ہیں جو زمین و آسمان کی ہر مخلوق کی ہر خصوصی خلقت کے سوال و طلب کے موافق اس کی تربیت و پرورش سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ لیسئلہ من فی السموات و الارض کل یوم ہونفستان فبای الاء ربکما تکنین۔

لہ اللہ لا الہ الا اللہ الی القیوم لاتاخذہ سنتہ ولا نوم لہ ما فی السموات و الارض۔

بلکہ موجودات کی بے شمار گونا گوں رنگارنگ کثرتیں حقیقت میں خالق عالم کی ہمہ وقتی و ہمہ جہتی شان ربوبیت یا پروردگاری ہی کے کرشمے ہیں کہ ہر موجود کی صورت و نوعیت یا اقتضائے ذات کے مطابق اس کے افعال و آثار کا فیضان یا ان کی تربیتی تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے "خالق العالمین" کے بجائے اپنا اولین تعارف "رب العالمین" سے فرمایا گیا۔ انسان کو اپنے اندر یا باہر انفس و آفاق میں ہر آن براہ راست شاہدہ اللہ تعالیٰ کے ربوبیتی یا پروردگارانہ صفات کمالات ہی کا ہوتا رہتا ہے۔ اسم ذات (اللہ) کے بعد سب سے زیادہ تکرار و تذکرہ صفت "رب" ہی کی پوری کتاب اسلام ہی میں ملتی ہے۔ باقی رحمانیت، رزاقیت وغیرہ بلکہ خالقیت تک سارے اسما و صفات دراصل صفت رب ہی کے توابع و لوازم ہیں۔

انسان کا حقیقی نفع و ضرر | ہر موجودہ مخلوق کا حقیقی نفع و ضرر وہی ہے جو اس کے خلقی یا خصوصی کمال کے حق میں نفع و ضرر کا باعث ہو۔ کتے کی تربیت یہ نہیں ہے کہ اس کو گھوڑا بنا دیا جائے بلکہ اس کے کلبی صفات ہی کو تربیت و ترقی دے کر بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ انسان جو اس کا گل ہر سدا وراپنے خالق کا شاہ کار بلکہ خود اس کی ذات و صفات خصوصاً اس کے علم و ارادہ کا منظر اتم یا زمین میں اس کا خلیفہ و جانشین ہے۔ سب سے زیادہ اسی کو شعوری طور پر رب العالمین کی عالمگیر ربوبیت سے متعارف اور اس کی طرف متوجہ کرنا تھا تاکہ وہ غیر اللہ کو اپنے نفع و ضرر کا مالک اور لازماً اللہ یا معبود و مقصود سمجھ کر اپنی خلقت کے بلند ترین مقام "احسن تقویم" سے گزر کر

اسفل سافلین کی حیوانی پستیوں میں نہ جا پڑے یا انسان ہو کر لوگوں اور چلیوں کی طرح فضا یا خلا میں اڑنے ہی کو اپنا اصل کمال نہ جاننے لگے۔

مسلمان ہونے کی حقیقت بھی صرف یہی ہے کہ انسان اپنے کو حیوان نہیں انسان سمجھ کر اپنی انسانیت کی تکمیل و تربیت کے لئے اس رب العالمین کی تدریسی ہدایات کے بے چون و چرا اپنے کو حوالہ کر دے، جس کی رہبری پروردگار کی دن رات ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوقات تک میں مشاہدہ کر رہا ہے یہی معنی ہیں لا الہ الا اللہ کے عہد و اقرار کے کہ اللہ کے سوا کسی غیر کو دین و دنیا کے کسی چھوٹے بڑے نفع و ضرر کے معاملہ میں الہ و معبود یا رب نہ ٹھہرایا جائے یہی اسلام کی "صراط مستقیم" یا عین اسلام ہے۔ ان اللہ ربی وربکم فاعبدواہ هذا صراط مستقیم۔

غرض انسان کا واحد مسئلہ اس کے حقیقی انسانی نفع و ضرر کا مسئلہ ہے اور اسلام کی توحید چھوٹے بڑے انفرادی و اجتماعی ہر نفع و ضرر کا واحد مالک و منصرف بلا شرکت غیرے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو جاننا اور پانا اور عملاً صرف اسی سے عبادت و استعانت کا تعلق رکھنا ہے، اور یہی ہر شک و شبہ سے باور اسلام کا دین اور اس کی دینی دعوت ہے، سورہ یونس کے آخر میں کس شہود کے ساتھ خود نبی الاسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کے اعلان کا حکم ہے:-

”کہدو کہ اے لوگو اگر تم کو میرے دین (کی حقیقت) قل یا ایھا الناس ان کنتم  
 نوعیت) میں کچھ شک ہو تو (کان کھول کر سن لو) فی شک من دینی فلا اعبد  
 کہ اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کرتے ہو میں نہیں کرتا الذین تعبدون من دون

میں تو صرف اس اشک کی بندگی کرتا ہوں جس کے اللہ ولكن اعبد الله الذی

ہاتھ میں تمہاری موت ہی (جو تمہاری زندگی کی ساری يتوفكم و امرت ان اکون

سرگرمیوں کا خاتمہ ہی کر دیتی ہے) اور مجھ کو یہ حکم دیا گیا من المؤمنین و ان اقم

کہ (اس توحیدی حقیقت پر) ایمان لانے والوں و جهك للمدين حنيفا ولا

میں سے ہوں اور اپنے کو اس دین کے اس طرح تکونن من المشرکین ہ

حوالہ کر دو کہ زندگی کے ہر دوسرے طریقے سے بالکل الگ

ہو جاؤ اور شرک کرنے والوں میں ہرگز سرگرم نہ ہو۔

اس شرک کی حقیقت ہے کیا؟ فرمائی کہ دین و دنیا کے کسی مطلب و مقصد کے لئے۔

» اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسے کو نہ پکارا جو حقیقہً ولا تدع من دون الله

تم کو نہ کوئی نفع پہنچائے نہ ضرر پہنچے بھی زلفرض ما لا ينفعك ولا يضرك

اس کھلے کھلے حکم و ہدایت کے) خلاف تم نے کیا تو فان فعلت فانك اذا من

تم بھی (حق نا شناسوں یا ظالموں میں شمار ہو گے۔ الظالمین۔ (یونس ۱۱۰))

آگے پھر اس نفع و ضرر ہی کے معاملہ و مسئلہ کے متعلق کلی و قطعی اعلان ہے کہ:-

اگر اللہ تم کو کوئی ضرر پہنچا دے تو اس کے سوا کوئی وان يمسسك الله بضر فلا

دوسرا اس کو دور کرنے والا نہیں۔ اسی طرح اگر کاشف لما لا هو وان يردك

وہ تمہارے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمائے تو بخير فلا يراد لفضله يصيب

اس کے اس فضل و کرم کو کوئی ٹالنے والا نہیں بد من يشاء من عباده وهو

وہ اپنے جس بندہ کو چاہتا ہے اپنے فضل سے العقور الرحيم ہ

نوازتا ہے وہ بڑی بخشش و رحمت والا ہے۔ (ایضاً)

الغرض قیامت تک کے لئے اب تمام بنی آدم کو پہ بانگ دہل سنا دو کہ  
زندگی کی تمام دوسری مشرکانہ و باطل راہوں کے مقابلہ میں تمہاری آدمیت و  
انسانیت کی تربیت و تکمیل کے نفع و ضرر کے لحاظ سے توحیدِ الہ کی جو واحد  
راہِ حق تھی وہ خود تمہارے حقیقی مربی (رب) کی طرف سے آچکی۔ (قل یا ایہا  
الناس قد جاءکم الحق من ربکم) بس اب اس کے بعد جو اس راہِ حق کو اختیار  
کرے گا وہ اپنے ہی نفع یا بھلائی کے لئے، اور جو بے راہ ہوگا وہ خود اپنی ہی برائی  
اور بربادی خریدے گا (فمن اھتدی فاما یتدی لنفسه ومن ضل  
فاما یضل علیہا) رہا خود اپنی ذات کا معاملہ تو کہیں کہ اس و اشکاف  
اعلانِ حق کے سوا مجھ پر اس کی ذمہ داری مطلق نہیں کہ تم اس کو قبول کرتے ہو  
یا نہیں (وما انا علیکم بوحیل) البتہ ساتھ ہی ساتھ یہ حکم مجھ کو ضرور ہے کہ  
بجائے خود اس کی پیروی پوری پوری کرتا رہوں، جس کا وحی کے ذریعے مجھ کو امر  
کیا گیا ہو۔ اور صبر کے ساتھ اپنے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ ہی کے فیصلہ  
کا انتظار کرتا رہوں کہ وہی ہر معاملہ میں ہر طرح بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (اتبع  
ما یوحی الیک و اصبر حتی یحکم اللہ و هو خیر الحاکمین)

ہر ملک و ماحول کے مسلمانوں کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل و مشکلات  
کے حق میں سورۃ یونس کا یہ پورا آخری رکوع بجائے خود "خیر الحاکمین" کا کتنا  
خیر و خیر عملی فیصلہ ہے کہ بس ہر مسلمان اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی صلاحیت و وسعت  
کی حد تک ایک طرف اپنی پراپیوں سب کو "دینِ حق" والی فکری و عملی زندگی  
کے اوامر و نواہی کی تعلیم و تفہیم کرتا ہے اور دوسری طرف مقدور بھر خود پورا

پورا ان کا اتباع۔ اس کے بعد تاج کو "خیر الحاکمین" پر چھوڑ کر انجام کا صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہے۔

مشہور آیت جو مدتوں مولویوں اور لیڈروں سب کی زبانوں پر بہت چڑھی رہی کہ "ان الله لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسهم" اس کا مطلب یہ ہے کہ "ما بقوم" یعنی کسی قوم کے قومی حالات میں محض ظاہری تبدیلیوں یا تدبیروں سے کوئی انقلاب نہیں پیدا فرماتا جب تک وہ خود اپنے "ما بانفس" یا اپنی نفسیت و ذہنیت میں باطنی و قلبی انقلاب نہ برپا کر لے اور اس اندرونی و انفسی انقلاب بغیر کسی قوم پر جو مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے وہ نہ کسی اور تدبیر سے ٹالی جاسکتی ہے اور نہ خدا کے سوا کوئی دوسرا مدد کر سکتا ہے وان اراد الله بقوم سوء آفلا مر له و ما لهم من دونه من وال (ردع) مسلمانوں سے من حیث القوم بھی اسلام کی طرف سے جس بنیادی انقلاب کا مطالبہ ہے وہ سب سے مقدم "توحید الہ" کا یہی فکری و نظری انقلاب ہے کہ شخصی کی طرح دین و دنیا کے کسی چھوٹے بڑے قومی نفع و ضرر یا بناؤ بگاڑ کے کسی معاملہ میں کسی غیر اللہ کو مالک و مددگار بالذات قطعاً نہ بنایا جائے۔ ہر کہ جنگ بدر میں ہر طرح کی ظاہری بے سرو سامانیوں کے عالم میں پانچ ہزار خاص غیبی فرشتوں سے مدد فرمائی جاتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ تنبیہ بھی فرمادی جاتی ہے کہ فرشتوں سے تمہاری امداد کا یہ وعدہ محض تمہارے اطمینان قلب کیلئے ایک خوشخبری ہے ورنہ حقیقت میں تو بالذات مدد صرف زبردست قوت و حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے (وما النصر الا من عند الله



## العزیز الحکیم۔

انسان کا سب سے بڑا نفع و ضرر شخصی و قومی سب ہی آخرت کی ابدی زندگی کا بناؤ بگاڑ ہے کہ وہی دنیا کی سفری و امتحان زندگی کی آخری منزل و نتیجہ اور انسانیت کی تکمیل کا مقام ہے۔ پھر انسانیت کی اس تکمیل کو ختم نبوت کے بعد اب آخری طور پر حضرت خاتم النبیین (صلی اللہ علیہم اجمعین) ہی پر ایمان کے ساتھ قیامت تک کے لئے وابستہ فرمادیا گیا ہے۔ اس لئے بالفاظ دیگر انسانیت کا سب سے بڑا نفع و ضرر رہتی دنیا تک براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نبوت و رسالت کی تصدیق و تکذیب میں منحصر ہو گیا ہے۔ پھر ہی خود آپ ہی کو اپنی زبان سے یہ دو ٹوک اقرار فرمانے کا حکم ہے کہ "کہدو کہ میں تمہارے حق میں کسی برائی بھلائی کا قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتا" (قل انی کا املک لکم ضراً و لا رشداً) دوسروں کی بھلائی برائی کا اختیار کیا ہوتا، جب خود اپنی ذات خاص سے متعلق بھی اس علانیہ اقرار کا حکم دیا گیا کہ "کہہ دو میں خود اپنے حق میں بھی کسی نفع و ضرر یا سود و زیاں کا کوئی اختیار خدا کے چاہے بغیر بالکل نہیں رکھتا۔ (قل لا املک لنفسی نفعاً و لا ضراً الا ما شاء اللہ) اور تو اور ایک طرف آپ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں، دوسری طرف اپنے محسن چچا کے معاملہ میں کیسی انتہائی بندگی و بے چارگی عجز و عبدیت کا مشاہدہ کر رہا جاتا ہے کہ جب ان کے آخری دم تک ایمان لانے کے لئے آپ تڑپتے رہتے ہیں تو آگاہی دی جاتی ہے کہ دیکھو محمد تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ یہ تو اللہ ہی کا کام ہے کہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ انک لا تھدی من اجبت

ولكن الله يهدي من يشاء۔

ایک اور بہت موٹی بات جس کلمہ کالما لا اللہ کے اقرار و ایمان سے آدمی کھڑے کھڑے ایک منٹ میں کافر و مشرک سے مومن و موحد بن جاتا ہے کیا وہ کوئی جادو کی چھڑی ہے کہ مردہ کے پیروں کی طرف سے اٹھا کر سر کی طرف رکھ دیا اور مردہ زندہ ہو گیا۔ اصل میں یہ اقرار ذہنی و قلبی ایسے عظیم انقلاب کے ایمان و یقین کا عہد و اعلان ہے جس کے بعد نظر و فکر کی پوری دنیا الٹ جاتی ہے یعنی ہم دن رات کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ زمین سے لے کر آسمان تک کی ساری موجودات جمادات و نباتات اور حیوانات سب ہی کچھ نہ کچھ بظاہر اپنے خاص خاص خواص اور افعال و آثار رکھتی ہیں۔ اور انسان کے لئے بواسطہ یا بلا واسطہ کم و بیش ان تمام افعال و آثار میں قریب و بعید کوئی نہ کوئی نفع و ضرر کا پہلو ضرور ہوتا ہے لیکن اللہ یا معبود کی توحید کے اس دعویٰ کلمہ کا مطلب و مطالبہ یہ ہے کہ کوئی موجود و مخلوق بذات خود نہ کوئی خاصیت یا فعل و اثر رکھتی ہے اور نہ لازماً اس کے ہاتھ میں کسی کا کوئی نفع و ضرر ہے۔ اس لئے لا الہ الا اللہ یا لا معبود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا ہر غیر اللہ کی "الہیت" و معبودیت کی نفی کے معنی بالذات ہر غیر اللہ سے نفع و ضرر کی نفی و انکار اور صرف ایک اللہ ہی کے لئے اس کے اثبات کے ہیں۔ بالفاظ دیگر لا الہ الا اللہ کے عہد و اقرار کا مطلب "لا نافع و لا ضار الا اللہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کسی طرح کا نفع و ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ توحید الہ کا یہی وہ عظیم و بنیادی ذہنی و فکری انقلاب کا پیغام ہے جس کی بنا پر مسلمان ہونے کیلئے

اس کے لانے اور سامنے والے آخری پیغامبر یا رسول کے رسول ہونے " محمد رسول اللہ" پر ایمان لانے کو بھی کلمہ لا الہ الا اللہ کا جزا نیک بنا دیا گیا۔

تو اب اس کلمہ یا پیغام کو قبول کرنے یا مومن و مسلمان ہونے کے معنی یہی ٹھہرے کہ مختلف چیزوں سے مختلف قسم کے افعال و آثار اور ان سے انسان کے حق میں طرح طرح کے نفع و ضرر کو ظاہر ہوتے جو گو یا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جو نہیں دیکھتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، پانی آگ اور پانی کو بجھاتا ہے، سانپ کے کاٹنے یا زہر سے آدمی مرتا ہے اور تریاق اس زہر یا ضرر کا توڑ کر کے موت سے بچا لیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مر کر سڑ گل جانا یا اجل بھن کر راکھ ہو جاتا ہے مگر اس چشم دید واقعہ کو غلط جان کر ماننے کو ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں ہر مرنے والا پھر جلا یا جاتا اور اس سے اس کے نیک و بد اعمال کا محاسبہ ہوتا ہے جس کے مطابق اس کو جزا و سزا ملتی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہمارے حواس و محسوسات کی اس دنیا یا عالم اسباب کے پیچھے ایک اور عالم غیب یا ان دیکھی حقیقی دنیا ہے جس کا یہ ہماری آنکھوں دیکھی دنیا محض ایک ظلی و ظاہری رخ ہے۔ اور ہم سایہ پر حقیقت کا دھوکا کھا رہے ہیں۔ کچھ ایسا ہی دھوکا جو ہماری ہی آنکھیں ہزاروں لاکھوں سال دیتی رہیں کہ جس زمین پر ہم چلتے پھرتے ہیں وہ ساکن ہے اور چاند سورج جیسا کہ ہم ان کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں متحرک ہیں۔ دران حالیکہ نفس الامری حقیقت بالکل برعکس نکلی یعنی جس کو ہم ساکن دیکھتے ہیں وہ درحقیقت متحرک ہے اور جس کو ہم آنکھوں سے متحرک دیکھتے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں ساکن۔

اس سے بھی بڑا اور بہت بڑا دھوکا وہ ہے جو ہماری ہی آنکھیں اور حواس ہم کو دن رات دیتے رہتے ہیں کہ کائنات کی مختلف موجودات سے جو ہم مختلف افعال و آثار پیدا ہوتے دیکھتے ہیں، ان کو پیدا کرنے والی کوئی قوت یا خاصیت خود ان موجودات کے اندر ایسی پائی جاتی ہے جس سے غیر منفک و ناگزیر طور پر وہی افعال و آثار پیدا ہو سکتے ہیں جو ہوتے ہیں۔ اسلامی توحید کی رو سے یہ بھی سراسر فریبِ نظری ہے۔ ورنہ اصل واقعہ و حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سموت و ارض کی ساری موجودات براہِ راست وبالذات صرف خدا کے "کن فیکونی" ارادہ و مشیت کی مخلوق ہیں، اسی طرح ان کے سارے افعال و آثار اور ان سے وابستہ تمام منافع و مضار کو بھی بلا شرکتِ غیرے براہِ راست خود خدا ہی پیدا کرتا رہتا ہے۔ یوں ہمارے عوام و خواص سب ہی زبان سے اجمالاً کہتے اور یانتے ہیں کہ خدا کے علم کے بغیر کوئی پتی جنبش نہیں کر سکتی۔ ہمارے اطباء آج بھی اپنے نسخوں کو "ھو الشافی" سے شروع کرتے ہیں کہ حقیقۃً شفا بخشنے والا بذاتِ خود اللہ ہی ہے نہ کہ کوئی نسخہ یا دوا۔ مگر شعوری و عملی طور پر اپنے نفع و ضرر کے معاملات سے خدا کو اسی طرح ہم بے دخل جانتے ہیں جس طرح کوئی منکر و مشرک۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے نفع و ضرر کے پیچھے بھی ہم بے دھڑک خدا کے موٹے موٹے اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام کو اس طرح توڑتے رہتے ہیں کہ گویا ان کے توڑے بغیر ہم اپنے نفع کے کسی مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں نہ اس کے ضرر کو دفع کر سکتے ہیں۔

لہٰذا ان مباحث پر جدید فلسفہ و سائنس کی روشنی میں آخر کتاب میں مستقل ضمیمہ کی صورت میں نظر ڈالی گئی ہے۔

بلکہ ہماری نئی تعلیم والے مسلمانوں میں تو زیادہ پرستانہ نئی تعلیم کی بدولت  
یہ شرک صرف عملی ہی نہیں رہا اعتقاد تک کی خبر لے ڈالی ہے۔ ان کے تصور میں  
یہ کائنات بس خود کار مشین ہے جو اپنی اندرونی قوت اور پرزوں کی ساخت سے  
خود بخود چلتی رہتی ہے۔ قدامت زیادہ سے زیادہ اس خود کار مشین کا بہت بڑا مشین ساز  
ہے جس کو اس مشین کے ایک مرتبہ بنا اور چلا دینے کے بعد نہ اس میں کسی مداخلت  
کی ضرورت رہی ہے اور نہ کرتا ہے۔ بس ایک بے تعلق تماشائی کی طرح معطل الگ  
بیٹھا اپنے اس مشین سازی کے کمال کا تماشہ دیکھتا رہتا ہے، سبحانہ و تعالیٰ  
عمائش رکون!

تو اسلام کا خدا جیسا کہ خود اسلام کی کتاب سے اوپر یہ اصرار و تکرار  
معلوم و واضح ہو چکا کائنات سموات و ارض کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ  
”قیوم السموات والارض“ بھی ہے۔ یعنی زمین سے لے کر آسمانوں تک  
کی ساری موجودات نہ صرف اپنے وجود و خلق میں خدا کی محتاج تھیں، بلکہ  
اس وجود کے قیام و بقا اور اس کی کارکردگی کی ہر جنبش میں ہر آن بالکلیہ اس کی  
مشیت یا ”کن فیکونی“ ارادہ کے تابع ہیں اور وہی خالق ہونے کے علاوہ ہر  
کائنات کے اور اسی کے قبضہ قدرت میں سارے آسمانوں اور زمین کے ہست و  
کشا کی کنجیاں ہیں۔ اللہ خالق کل شئ و هو علی کل شئ وکیل لہ  
مقالید السموات والارض۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے ان نو تعلیم یافتہ بھائیوں کے ذہن جن میں اب

لہ ان مباحث پر جدید فلسفہ و سائنس کی روشنی میں آخر کتاب میں مستقل ضمیمہ کی صورت میں نظر ڈالی گئی ہے۔

بہترے مسلمان کہنے کے بجائے اپنے کو "اسلام پسند" کہنا کہلانا پسند فرمانے لگے ہیں۔  
 — سرے سے منکر خدا مادیت اور مادہ پرستانہ زندگی کے باہمی تعلق ہی کے  
 بارے میں صاف نہیں ورنہ مادہ پرستانہ زندگی کے ساتھ محفل کیا سرے سے کسی  
 موجود خدا ہی کا جوڑ نہیں لگایا جاسکتا۔ مادہ پرستانہ زندگی کے تصور کا تقاضا یہ ہے  
 کہ ہماری اس مادی یا دنیاوی زندگی کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی  
 قومی و بین القوامی معاملات اس مادی دنیا سے باہر کی کسی غیر مادی ماورائی یا  
 خدائی مداخلت سے زیادہ سے زیادہ بلکہ سرے سے آزاد ہوں (نہ کہ زندگی کے  
 ہر شعبہ میں حلال و حرام جائز و ناجائز کے اوامر و نواہی کی پابندیاں قبول کریں)  
 جو سرے سے منکر خدا پوری پکی مادیت ہی کی منطق کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے  
 جس کی رو سے یہ کائنات وجود ہی میں ایک بالکل مردہ اندھے بہرے گونگے،  
 بے علم و ارادہ مادہ سے آتی ہے۔ اسلام کے حقیقی و قیوم صاحب علم و ارادہ خالق  
 و خدا والے تصور کے معنی اس کے سوا کچھ اور ہی کیا سکتے ہیں کہ اس نے اس  
 کائنات اور اس کے اندر انسان کو اپنے علم و ارادہ یا مرضی و مشیت کے مطابق  
 کسی نہ کسی معلوم مراد و مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ لازماً اپنی اس مرضی و مقصد  
 سے اپنی سب سے زیادہ صاحب علم و ارادہ با اختیار و ذمہ دار مخلوق انسان کو  
 آگاہ کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی ہدایتی نظام بھی  
 ضرور عطا کرنا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس ہدایتی نظام و انتظام کے موافق و مخالف  
 زندگی کا انجام بھی ایک دوسرے سے مخالف ہی ہونا چاہئے۔ یہ سب علیم و خبیر  
 ملہ اس مادہ و مادیت کی حقیقت ضمیمہ میں معلوم ہوگی۔

حکیم و قدیر خدا کو ماننے کے ناگزیر منطقی لوازم ہیں۔

غرض یہ کہ مادہ پرستانہ یا من مانی خود پسندانہ زندگی کا پیوند اسلام کی دینی زندگی کے ساتھ کسی طرح لگانا ممکن نہیں۔ نہ اسلام کے رد و قبول کے درمیان منافقانہ کے سوا کوئی تیسرا مصالحتانہ رویہ اختیار کرنا ممکن ہے۔ اس مصالحتانہ راہ و رویہ کا مطالعہ سب سے زیادہ ہمارے مغربی تعلیم و تہذیب اور اس کے علوم و فنون اکتشافات و اختراعات سے مرعوب بھائیوں ہی کو ہے۔ وہ ایمانا و عملاً پورا پورا دینی مسلمان بننے کے بجائے زیادہ تر قولاً نسلی و قومی مسلمان یا اسلام پسند بنے رہتے ہی ہیں بزعم خود اسلام کے رد و قبول دونوں کے منافع و مصالح جمع کرنا چاہتے ہیں۔ سوان حضرات کو ذرا کھلے دل و دماغ سے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا چاہئے کہ دین اسلام جس طرح ایک طرف دنیا کے ترک یا اس سے فرار کی راہ نہیں، اسی طرح دوسری طرف دنیا کے عیش و آرام اس کی زینت و آرائش اور رنگ رلیوں — نام نہاد تمدن و ثقافت — یاد دنیا ہی دنیا کی خاطر سائنسی و صنعتی ایجادات کی بھرماروں کو بالذات مطلوب مقصود بنانے کی بھی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔

اسلامی منطق کی راہِ آخرت | دنیاوی زندگی کے تمام انفرادی اجتماعی سیاسی و معاشی، تمدنی و تہذیبی، علمی و

تعلیمی، سائنسی و صنعتی شعبوں سب کو بالکل پیسے ہی بلکہ اس سے ہزاروں درجے بڑھ کر دین کے تابع و ماتحت رکھنا لازم ہے، جیسے ہم اپنے بچوں کی راحت و آرام کھیل کود تعلیم و تربیت سب کو تمام تر ان کے بچپن کے بعد آنے والے

طویل تر مستقبل کے تابع رکھنا ہی ان کے حق میں دانشمندی و خیر خواہی جانتے ہیں۔ ان کی زندگی کو بے روک ٹوک آزادی سے حاضر کی صورت طفلانہ خوشیوں اور خواہشوں کے حوالہ کر دینا ان کی صرف بدترین بد خواہی ہوگی۔ پھر اپنی اپنی پراپیوں سب کی اس سے بڑھ کر کوئی بد خواہی و بد اندیشی کیا ہوگی کہ اپنے کو مسلمان کہہ کر بھی اس دنیا کی چند روزہ زندگی — وہ بھی ایسی غیر یقینی کہ یقین ایک روز کیا ایک پل کا نہیں — کبھی ختم نہ ہونے والی ابدی زندگی والے مستقبل کو اس طرح بے فکری و غفلت شعاری سے قربان کیا جائے کہ گویا اسلام کے خدا و رسول نے نہ اس پر ایمان و یقین کا کوئی مطالبہ کیا ہے اور نہ ہم اس پر اتنا بھی یقین رکھتے ہیں جتنا بچوں کے بچپن کے بعد جوانی اور بڑھاپے پر

۱۹۱۱ میں ہمارے نیوں پر انوں عوام و خواص کا دین کی جان پوہم دین یا آخرت کی ابدی زندگی پر ایمان و یقین کیا، کسی موثر درجہ میں اس کا احتمال تک نہیں رہا۔ اتنا بھی نہیں جتنا دنیاوی زندگی کے نفع و ضرر کے کسی احتمال کی صورت میں احتیاط کی اسلم راہ (Safest Course) کو سب ہی سلامتی و دانشمندی کی راہ جانتے ہیں کیونکہ زبان و ضرر کے کسی احتمال سے بچاؤ کی صورت صرف یہی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی ایسے جنگل سے گذر رہے ہوں جس سے پہلے کبھی نہیں گزرے یا کسی تاریک غار میں داخل ہونا ناگزیر ہو رہا ہو اور کوئی عامی ان جانا راہ گیر جس کے سچے جھوٹے ہونے کا بھی کوئی علم و تجربہ ہم کو نہیں، کہہ دے کہ اس جنگل میں آدم خور شیر یا زہریلے سانپ بہت ہیں تو ہم یقیناً عقلمندی و سلامتی اس میں جانیں گے کہ اگر کوئی دوسرا راستہ ہے تو اس جنگل کے راستہ کو سرے سے



چھوڑ دیں، یا اگر کسی وجہ و مجبوری سے اس سے گزرتا یا ان دیکھے غار میں داخل ہونا ہی ہے تو اس کے امکانی و احتمالی خطرات سے بچاؤ کی اپنی والی پوری احتیاط و اہتمام سے کام لیا جائے گا۔

پھر جس شخص کی سچائی کی کڑے سے کڑ جانی دشمن تک عمر بھر گواہی دیتے رہے ہوں وہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر ان ہی لوگوں سے پوچھتا ہو کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے جس کو تم نہیں دیکھ رہے ہو لیکن میں پہاڑی پر کھڑا ہونے کی وجہ سے دیکھ رہا ہوں تو کیا تم یقین کرو گے؟ ہم آواز جواب دیتے ہیں کہ کیوں نہیں ہم آپ کو ہمیشہ سے صادق و امین جانتے ہیں اور کبھی جھوٹا نہیں پایا، اگر یہی شخص جب موجودہ زندگی کے ان دیکھے یا غیبی مستقبل کی خبر دیتا ہے جس میں موت کے اندر سے گڑھے کی راہ سے داخل ہوتا ہر زندگی والے کے لئے ناگزیر ہے تو وہ فرعون کی قوم کے اس عامی مگر محتاط دانشمند کے اس دانشمندانہ احتمال تک سے کام نہیں لیتے کہ اگر یہ شخص بقرض جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہے تو جو کچھ تم سے کہہ رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تم پر ضرور پڑ کر رہے گا۔ کچھ اسی طرح کا جواب حضرت علیؑ سے منقول کہیں پڑھا کہ کسی نے پوچھا کہ یہ مرتے کے بعد حشر و نشر حساب و کتاب جنت و جہنم وغیرہ کی باتیں جو ہیں اگر

لہ قال رجل مومن من آل فرعون یکتُم ایمانہ انقتلون رجلا ان یقول  
ربی الله وقد جاءکم بالبیتات من ربکم وان یلک کاذبا فعلیہ کذبہ وان  
یلک صادقاً یصیبنکم بعض الذی یعدکم (مومن ع ۳۴)

کچھ نہ نکلیں تو؟ آپ نے فرمایا کہ اگر نکلیں تو؟

خود کتاب اسلام میں زندگی کی صاف سیدھی شاہراہ (صراط مستقیم) کی طلبِ ہدایت کی درخواست پیش کرانے کے بعد ہی اس کتاب سے حصولِ ہدایت کی جو فکری و عملی بالکل منطقی و نفسیاتی پانچ شرطیں لگائی گئی ہیں ان میں ایمان سے بڑھ کر زور مستقبل کی ابدی زندگی یا آخرت کے ایقان پر دیا گیا ہے و بِالْآخِرَةِ لَمَّا يَوْفُونَ۔ پھر پوری کتاب میں جتنا آگے بڑھتے اور پڑھتے چلے جائیے سب سے زیادہ طرح طرح کی تعبیرات و تمثیلات سے تفہیم و تکرارِ آخرت کے مضمون کی بلتی چلی جائے گی حتیٰ کہ آخر کتاب کی بہت سی سورتوں یا ابواب کا مرکزی و عمودی مضمون و مفادِ آخرت ہی آخرت ہے۔ بعض میں رکوع کے رکوع اور بعض پوری پوری لمبی سورتیں اسی مضمون پر ملیں گی۔ صرف کتاب اسلام کیا تمام آسمانی کتابوں کا خاص مفاد و مضمون ہی بتایا گیا ہے کہ ”تم اس دنیا کی ناپائدار زندگی پر آخرت کو قربان کرتے رہتے ہو، حالانکہ ہمیشہ باقی رہنے والی اور بہترین زندگی آخرت ہی کی ہے اور یہی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام وغیرہ تمام انبیاء کی کتابوں کا چوڑا رہا ہے ہل تو ثرون الحیوة الدنیا والآخرہ خیر والبقی ان هذا فی الصحف الاولى صحف ابراہیم و موسیٰ۔“

نیردنیوی زندگی کے لئے ”الحیوة الدنیا“ کی تعبیر جو اختیار فرمائی گئی ہے اس کے لفظی معنی ہی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کے پست ترین یا حد درجہ حقیر و خسیس ہونے کے ہیں۔ اس حقیقت کو ایک دو جگہ نہیں بار بار بیسیوں آیات میں دہرایا گیا ہے۔

”کیا تم نے اس دنیا کی (پست ترین) زندگی کو آخرت کے عوض پسند کر لیا ہے حالانکہ دنیا کی بساط آخرت کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ ارضیتکم بالْحیوة الدنیا من الآخرة فامتاع الحیوة الدنیا بالآخرة الاقلیل (توبہ ۵۷) زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے اس کے سامنے دنیا کی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ نہیں کاش لوگ اتنی موٹی بات سمجھتے! — وما هذه الحیوة الدنیا الا لہو و لعب وان الدار الآخرة لہی الحیوان لو كانوا یعلمون (عنکبوت ۶۶)

وہی بات کہ اگر کسی بچے کی زندگی سے اس کی جوانی اور بڑھاپے کے مستقبل کے نفع و ضرر کو خارج کر دیا جائے تو پھر وہ خالی طفلانہ کھیل کود کے سوارہ ہی کیا جائے گی۔ علاوہ بریں اس ”پست ترین زندگی“ (الحیوة الدنیا) کا جو بڑے سے بڑا سرمایہ سمجھا جاتا ہے وہ آل و اولاد مال و دولت نام و نمود افراد و اقوام کی باہمی مسابقت و مقابلہ اور اس پر فخر و مباہات ہی ہے نا۔ لیکن اس کا بھی اگر کوئی ”خیر و القی“ نال و انجام نہیں تو یہ بھی بچوں کا نہ ہی جوانوں اور بوڑھوں کے وقتی کھیل کود ہی کے سوا کیا ہے۔ سورہ حدید میں اس پر کیسی تشبیہ ہے کہ ”خوب جان رکھو دنیا کی زندگی نام ہی ہے کھیل کود و آرائش و نمائش اور اموال و اولاد وغیرہ پر باہمی تفاخر اور ایک دوسرے سے نکل جانے کی جدوجہد کا۔ — اعلموا انما الحیوة الدنیا لعب و اہو و زینة و تفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال و الاولاد.....“

— پھر اس کے بعد نبوی زندگی کی چند روزہ رونق و سرسبزی کی ایک مثال دے کر آگاہ فرمایا کہ جو لوگ اسی میں مر کھپ کر رہ گئے ان کو آخرت (کی ابدی زندگی) میں شدید دکھ یا عذاب کا سامنا ہوگا۔ — فی الآخرة عذاب شدید —

بخلاف اس کے جن لوگوں نے اس فانی رونق و بہار پر جان دینے کے بجائے غیر فانی  
 آخرت پر نظر کی وہ وہاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و بخشش کی دولتوں سے بالامال  
 ہوں گے جن کے مقابلہ میں یہاں کی یہ "پست زندگی" صرف ایک فریب ہی فریب  
 ہے۔ — وما الحیوة الدنیا الا متاع العرور — لہذا جدوجہد یا مقابلہ و  
 مسابقت کی چیز خدا کی رضا و مغفرت یا آخرت کی کامیاب زندگی و جنت ہی  
 ہو سکتی ہے۔ — سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنة . . . " ایک اور جگہ  
 (عمران ۱۹۴) اس سہرا یا فریب دنیوی زندگی پر بالکل منطقی طور سے اس طرح چونکایا  
 گیا کہ موت سے تو بہر حال کسی کو چارہ نہیں اور مرنے کی جزا و سزا کا معاملہ جو کچھ بھی  
 ہوگا قدرۃ ہماری دنیوی زندگی کے اعمال و اقوال کے مطابق ہی ہونا چاہئے۔ سو  
 جس نے دنیوی زندگی اتروئی زندگی کی تیاری میں گزار دی اور اس کی بدولت وہاں  
 کی آتش عذاب سے بچ کر جنت میں جا پہنچا، پالا یقیناً اسی نے باراً — کل نفس  
 ذائقة الموت و اما لتوتون اجورکم یوم القیامة فمن زحزح عن النار و  
 ادخل الجنة فقد فاز و ما الحیوة الدنیا الا متاع العرور۔

کہیں یوں ڈرایا کہ خدا و آخرت کے وہ منکر عذاب شدید کی تباہی و بربادی  
 سے آگاہ رہیں جنہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا ہی کی زندگی کو محبوب و مطلوب  
 بنا رکھا ہے۔ — ویل للکافرین من عذاب شدید الذین یستحبون الحیوة  
 الدنیا علی الآخرة (ابراہیم ۱) جس طرح ایک طرف خدا و آخرت کا انکار دنیا کی  
 زندگی کو محبوب و مستحسن بنا دیتا ہے اسی طرح دوسری طرف دنیا کی آخرت فراموش محبت  
 بھی (جو دراصل کفری ہے) لازماً خدا کی ہدایت سے بھی محروم رکھتی اور دل و دماغ

آنکھ کان سب پر غفلت کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ — ذلک بانہمرا استحبوا  
 الحیوة الدنیا علی الآخرة وان الله لا یهدی القوم الکافرین اولئک الذین  
 طبع الله علی قلوبہم وسمعہم وابصارہم اولئک ہم الغافلون (نحل ۱۳۷)  
 آج کل کی ماڈرن دین بیزاری حد سے بڑھی ہوئی دنیا طلبی یا عشق دنیا ہی کا تو لازمہ  
 ہے۔ حب الدنیا اس کل خطیئہ۔

دنیا کے جس جاہ و مال نام نہائش، زینت و آرائش کے چھپے ہم اپنی ابد الابد  
 کی اتروی زندگی تھج دیتے ہیں وہ اسلام کے خدا کی نظر میں ایسی بیچ و پوچ ہے  
 کہ اگر اس کی ظاہر قریبی میں آکر سب ہی دنیا پرست نہ بن جاتے تو اللہ تعالیٰ سارے  
 کافروں منکروں کو یہ چند روزہ پر فریب دنیا اتنی افراط سے دیدیتا کہ اپنے  
 گھروں کے در و دیوار ساز و سامان فرنیچر وغیرہ سب سوتے چاندی کا بنا لینے  
 کیونکہ آخرت کے مقابلے میں سوتے چاندی کی اتنی بھاری کی بساط بھی اس ناپائدار  
 زندگی کے ایک ناپائدار و خیس سرمایہ کے سوا کیا ہے۔ باقی انجام و آخرت کی لازوال  
 زندگی، سو وہ ظاہر ہے کہ دنیا کے جاہ و مال کی حرص و ہوس سے بچنے والے اہل  
 تقویٰ ہی کا حق و حصہ ہو سکتی ہے۔ — ولولا ان یكون الناس امة واحدة  
 لجعلنا لمن ینکر بالرحمن لیسوتھم سققامن فضة و معارج علیہا یظہرون ہ  
 و لیسوتھم ابوابا و سررا علیہا یتکئون ہ و زخرفا وان کل ذلک لما متاع الحیوة  
 الدنیا و الآخرة عند ربک للمتقین (زخرف ۳۷) اسی طرح سورہ آل عمران (۲۶)  
 میں ارشاد ہے کہ عورتیں آل و اولاد، سونا چاندی یا روپیہ پیسہ کی بہنات اور گھولے  
 ہاتھی موٹر شو فرنگہ گملہ وغیرہ جو کچھ بھی دنیوی ساز و سامان یا مرغوبات ہماری

نظروں میں خوشنما بنا دیتے گئے ہیں، یہ سب کی سب ہیں بہر حال بس اسی ناپائیدار و حقیر زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ورنہ آخرت کی حقیقی وابدی فوز و فلاح تو صرف اللہ ہی کے پاس پہنچ کر حاصل ہوگی۔ زین للناس، حب الشهوات من النساء والبنین و القناطیر المقنطرة من الذهب والفضة والخمیر المسومة والانعام والحکرت ذلك متاع الحیوة الدنیا واللذات عندہ حسن المآبہ

پورے قرآن کی ایک سو چودہ میں دو چار آیت کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی سورت کیا معنی ایک آیت بھی ایسی ڈھونڈھے نہ ملے گی جس میں آخرت سے جدا کر کے دنیا ہی دنیا کی سیاسیات و معاشیات، معاشرت و ثقافت، علوم و فنون، سائنس و فلسفہ وغیرہ کو بجائے خود مطلوب مقصود بنانے کی تعلیم و تخریص کیا ادنیٰ سے ادنیٰ تحسین و ترغیب بھی نکلتی ہو۔ لے دے کر ایک آیت دنیا پرستوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔ — رینا اتنا فی الدنیا حسن تو فی الآخرة حسنة —

سوا و لا تو اس میں بھی ”حسنہ دنیا“ کا دامن ”حسنہ آخرت“ کے ساتھ بانڈھ دیا گیا ہے۔ دوسرے اس سے طلب دنیا کی تعلیم کا نتیجہ نکالنا تمام تر دنیا پرستوں کی خوش فہمی ہے۔ ورنہ مطلوب بذات دنیا نہیں، بلکہ آخرت کی طرح دنیا میں بھی مطلوب ”حسنہ“ ہی ہے اور دنیا اس حسنہ کا اسی طرح فقط ایک محل یا سفری راستہ ہے جس طرح آخرت اس کی آخری و مستقل منزل و محل۔ یعنی مطلوب خود دنیا نہیں بلکہ دنیا میں ”حسنہ“ یا نیکی اور بھلائی کی زندگی ہی مطلوب ہے۔

۱۔ باقی آخرت کے تابع دنیا تو عین مطلوب ہے۔ ورنہ دنیا اور اس میں انسان کا پیدا کرنا سب عبث ہوتا۔ اسی لئے رہتا یعنی ترک دنیا کو پدعت و منافی اسلامیت قرار دیا گیا۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حضرت موسیٰ کی دعا ہے کہ اے اللہ ہمارے لئے اس دنیا میں بھی حسنة لکھ دیں اور آخرت میں بھی۔ اس دعا و درخواست کے قبول فرمانے کے لئے ہم آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ — واكتب لنا في هذه الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة — اناهدنا اليك۔ آگے اس درخواست کے جواب ہی میں ارشاد ہے :-

”میں اپنا عذاب اس کو دیتا ہوں جس کو رہا لکل ضرورہ قال عذابی اصیب بد من اشاء چاہتا ہوں۔ ورنہ میری رحمت تو اتنی ہمہ گیر و رحمتی وسعت کل شے۔ وسیع ہے کہ کوئی شے بھی اس سے باہر نہیں لہذا فساکتبھا للذین یتقون و تمہاری حسنة دنیا و آخرت کی درخواست بھی ضرور یؤتون الزکوٰۃ والذین ہم منظور کروں گا (مگر) ایسے لوگوں کیلئے جو پیرگاری بایاتنا یومنون۔

کی زندگی اختیار کرتے ہیں، زکات دیتے ہیں اور (اعراف ۱۹۴)

میری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اس کے بعد دنیا و آخرت دونوں کی اس بھلائی (حسنة) پانچرو فلاح کے عطا فرمانے کی جو شرائط ہیں وہ بنی اسرائیل سے کہیں زیادہ ہم مسلمانوں کے لئے خصوصاً کان کھول کر سننے سنانے کی ہیں کہ اور

”وہ ایسے نبی امی رسول کی پیروی کرتے ہیں جس کو الذین یتبعون الرسول النبوی اپنی کتابوں توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں الاھی الذی یجدونہ مکتوباً جس کی صفت یہ ہے کہ ان کو نیک کاموں کا حکم عندہم فی التوراة و الانجیل دیتا اور برے کاموں سے روکتا ہے اور پاکیزہ یامرہم بالمعروف و ینہہم

چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور گندہ چیزوں  
عن المنکر ویحل لهم الطیبات

کو حرام . . . . . پس جو لوگ اس رسول پر  
ویحرم علیہم الخبیثات . . . . .

ایمان لاتے اور اس کی حمایت و مدد کرتے اور  
فالذین آمنوا بوعترتی وہ و

زندگی کی) اس روشنی میں چلتے ہیں جو اس کے ذریعہ  
نصرۃ واتبعوا النور الذی

عطا فرمائی گئی ہے پس وہی دین دنیا میں پوری  
انزل معہ اولئک ہم المفلحون

پوری (حسنہ) فلاح و کامرانی پانے والے ہوں گے۔  
(اعراف ۱۹۴)

ہم مسلمان جو اس "نبی امی" پر ایمان لانے ہی کی بنا پر اپنے کو "مسلمان" کہنے کہلانے  
کا کوئی حق رکھ سکتے ہیں اس کے لئے ہوئے دین کی کوئی اور حمایت نصرت  
الگ رہی کیا بجائے خود اس کی تعلیمات پر چلتے چلانے کا حق ادا کر رہے ہیں؟ اگر  
ہیں تو پھر اس شرط کے ساتھ مشروط و موخوردین و دنیا کی بھلائی (حسنہ) اور  
فلاح کا بھی ہم کو کیا حق رہ جاتا ہے! اور اس سوال کا جواب کہ "مسلمان" —  
مسلمان رہ کر — کیا کریں؟ اس کے سوا کوئی دوسرا ممکن بھی ہے کہ جس رسول  
اور اس کے جس پیام پر ایمان لانے کے لئے ہم مدعی ہیں ایک طرف خود اپنی انفرادی  
واجتماعی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالیں اور دوسری طرف اس کے  
دشمنوں کے مقابلے میں نین من دھن کسی طرح سے اس کی نصرت و حمایت سے  
پیچھے نہ ہٹیں؟

غرض ان آیات کی بنا پر حسنہ دنیا کو حسنہ آخرت سے قطع نظر کر کے  
بذات خود کسی درجہ میں مطلوب و مستحسن ٹھہرنا ان کی تفسیر نہیں، سراسر تحریف  
ہے مفسر تھانویؒ نے اپنے خاص علمی و منطقی انداز میں اپنی تفسیر میں طرف و



مظروف یا حال و محل یعنی شے اور اس کی جگہ میں فرق نہ کرنے کے اس تحریر یعنی  
مغالطہ پر خصوصیت سے تہنید فرمائی ہے کہ

”دنیا ظرف (یا محل) طلب ہے، خود مطلوب نہیں۔ بلکہ مطلوب خود حسن ہے  
خلاصہ یہ کہ وہ لوگ اس کے طالب ہیں کہ ہم کو (آخرت کے ساتھ) دنیا میں بھی  
وہ حالت جو آپ کے نزدیک مستحسن و پسندیدہ ہو غایت کی جائے۔“

اور ظاہر ہے وہ حالت وہی ہو سکتی ہے جس سے آخرت کی حسنہ یا بھلائی میں فرق  
نہ پڑے تب ہی تو حسنہ دنیا اس درخواست یا دعا کے ساتھ ساتھ ہی حسنہ آخرت کی  
درخواست بھی کرائی گئی یعنی اس دعا کی رو سے دنیوی زندگی کی کوئی ایسی حالت  
بھلائی اور بہتری کی ہو ہی نہیں سکتی، جس میں اخروی زندگی کے صلاح و فساد  
یا بناؤ بگاڑ کو نظر انداز کیا گیا ہو، لہذا اسلامی نقطہ نظر سے اس دنیا کی حسنہ بھی  
اس کے عند اللہ

”پسندیدہ اعمال حسنہ (ہی) ہیں۔ پس بالذات مطلوب بھی وہی ہوئے اور  
دنیا کے جس قدر حصہ کو ان اعمال حسنہ میں دخل ہو خواہ وہ بال ہو یا صحت ہو  
وہ البتہ اس حسنہ کے تابع ہو کر یا العرض یا بالغیر مطلوب ہو جائے گا۔“

وہی کہ دنیا کی زندگی کا کوئی بھی انفرادی و اجتماعی حصہ یا شعبہ بجائے خود دین کا  
مطلوب و مقصود قطعاً نہیں۔

”بخلاف اس وقت کی تعلیم و طرز عمل کے جس میں دنیا کا مطلوب بالذات اور

آخرت کو محض برائے نام قرار دے رکھا ہے حاشا وکلا اس کو آیت سے منہ بھی نہیں۔“

زیادہ سے زیادہ بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ

» اگر طلب دنیا میں حرام و ضلال کے حدود توڑے نہ جائیں تو اباحت کا حکم کر دیا جائیگا۔

لیکن مباح شرعی ہونے سے مطلوب شرعی ہونا لازم نہیں آتا خوب سمجھ لو۔

سبحان اللہ و بشار اللہ امت کے حکیم اور وقت کے مجدد کی کیا شان ہے! یعنی شریعت یا دین کی نگاہ میں دنیا کی کوئی چیز کسی حیثیت اور کسی درجہ میں بھی بالذات و براہ راست تو کسی طرح مطلوب و مامور ہے ہی نہیں۔ البتہ اگر شریعت کے احکام یا دین کے حدود و قیود کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر کوئی خالص دنیا یا نفس کی خواہش و خوشی بھی پوری کر لی جائے تو بہت سے بہت اس کو بس بسلح یا جائز کہہ دیا جائیگا بالفاظ دیگر اس پر کوئی مواخذہ یا باز پرس نہ ہوگی نہ کوئی جزا و سزا ہوگی۔ جزا و سزا تو ثمر یا خمیازہ ہے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و تاراضی کا۔ یہ رضا و تاراضی مرتب ہوتی ہے اس کے اوامر و نواہی پر لیکن جس بات کا نہ اس نے کوئی امر فرمایا ہو نہ ہی اس سے لارنا نہ کسی جزا کا تعلق ہوگا نہ سزا کا۔

غرض جب خدا و آخرت سے قطع نظر کر کے دنیا یا اس کا کوئی کام کسی اعتبار سے دین کا مطلوب ہو ہی نہیں سکتی تو پھر دینی اعتبار سے وہ کوئی بھلائی یا ”حسنہ“ بھی کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ عجیب بات ہے سورہ بقرہ کی آیت زیر بحث سے بالکل علی ہوئی پہلی آیت ہی میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو آخرت سے غافل یا منکر ہونے کی بنا پر دنیا ہی دنیا کی عیش عشرت، عزت و دولت، سیاست و حکومت پر جان دیتے ہیں کہ ان کا آخرت میں قطعاً کوئی حصہ نہ ہوگا۔ فمن الناس من يقول ربنا اتنا فی الدنیا وھال فی الآخرة من خلاق۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ کلام اللہ نری دنیا یا اس کی بھلائی کے لئے فقط حسنہ کا استعمال تک پس نہیں کرتا۔ ورنہ بظاہر ربنا اتنا فی

الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة" کا سیاق و تقابل ہی چاہتا تھا کہ اس سے بالکل متصل پہلی آیت "من الناس من يقول ربنا اتنا فی الدنیا" کے بعد بھی "حسنة" کا لفظ ضرور ہو۔ لیکن دین و آخرت کے بغیر دنیا کے جاہ و مال وغیرہ کی کوئی بڑی بڑی ترقی بھی قرآن کی نظر میں چونکہ بھلائی یا حسنة مرے سے ہو ہی نہیں سکتی اس لئے اس پر حسنة کے لفظ کا اطلاق کیسے درست ہوتا۔ بس اصل بات جو تہنیت کی تھی اس پر متنبہ فرمادیا گیا کہ آخرت کو چھوڑ کر جو دنیا چاہتے ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ قطعاً نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ذرا تفکر و تدبر کی مناسبت تو فوق بیسرا ہو تو "کلام اللہ" کا لفظ لفظ اللہ کا کلام ہونے کی گواہی دے گا۔

دنیا کو یوں تو ہمیشہ ہی کم و بیش ہر طرح کے اندرونی و بیرونی فتنوں سے دوچار رہنا پڑا ہے لیکن ادیان کی پوری تاریخ کسی ایسے دور سے قطعاً نا آشنا ہے جس میں دنیا کی زندگی سے دین یا آخرت کو نظری و عملی ہر لحاظ سے نکال پھینکنے کی اتنے وسیع و منظم پیمانہ پر باقاعدہ دعوت و تبلیغ ہوتی ہو جتنی "جدید ترقی" کے نام سے آج کے جدید دور میں — ترقی کی یہی لے بڑھتے بڑھتے بیسویں صدی میں روسی اشتراکیت یا کمیونزم تک جا پہنچی ہے حتیٰ کہ اب کمیونزم ہی کی ڈنگے کی چوٹ لاندہ بیت کی آواز باز گشت سکونزم یا ناندہ بیت کے نام سے ہر چار طرف گونجنے لگی ہے اور جدید سیاست و حکومت والوں نے تو اس "ناندہی" لاندہ بیت کو اپنا عین دین و مذہب بنا لیا ہی سب سے بڑا فرقہ کار بنا رہا ہے۔

دوسرے دین تو خیر سے رہ ہی محض نام کے دین گئے ہیں لیکن جو دین رہتی دنیا تک رہنے والا ہے اس کے اندر بھی باہر کا یہ فتنہ اس انتہا تک آگسٹا ہے کہ اچھے

بڑے بڑے اہل علم وصلاح حضرات غیر شعوری طور پر یہی یوم دین یا آخرت کا نام۔  
 خصوصاً ترقی والوں کے سامنے۔ کھل کر لیتے جھکتے ہیں۔ لمبی لمبی تقریریں تحریریں  
 سنتے پڑھتے چلے جاتے، اسلام کے نام سے سیاست و حکومت تعلیم و تمدن تہذیب  
 و ثقافت یا بہت سے بہت نام تہا و اخلاق و انسانیت کے مضامین پر زبان و قلم  
 کا زور اس طرح ہو گا کہ گویا یہ بھی بالذات مقاصد دین ہیں۔ خدا و آخرت کا نام  
 کچھ آتا بھی ہے تو دبا دبا اور گھوم گھما کر۔ لازماً نفسیاتی اثر سننے والے دنیا طلبوں کے  
 یہ ہوتا ہے کہ مقصود و مطلوب اسلام کا یہی ہر کچھ اس دنیا کی زندگی کو بہتر بنانا ہے  
 ایسی ہی ذہنیت کا خود مسلمانوں کا سامنا رکھنے والوں تک موقع پا کر ایک موقع  
 پرست طبقہ ابھر آیا ہے جو قرآن جیسی سراسر توحید الہ و فلاح آخرت کی کتاب  
 دعوت کو تخریفی کیا تمام تر افتراء تفسیر سے دنیا ہی کی دنیا دعوت کی کتاب  
 بنا دینے پر تل گیا ہے۔

ایسے خالص موقع پرستوں، دنیا طلبوں سے قطع نظر ہمارے عام مسلمانوں کا  
 بھی دین کی جان توحید اور آخرت پر ایمان اتنا بے جان ہو چکا ہے کہ نہ دنیا کے  
 نفع و ضرر یا برے بھلے کے معاملات میں وہ نہ خدا کی مشیت کا عملاً کوئی دخل  
 جانتے ہیں اور نہ آخرت کی ابدی زندگی کے فلاح و خسران یا بناؤ بگاڑ کا یقین کیا  
 کوئی ایسا موثر معتدبہ احتمال ہی رکھتے ہیں جو روزمرہ کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو  
 بس یہی وہ ہمارا سب سے بڑا بنیادی فکری و ایمانی بگاڑ ہے جس کے بغیر دین تو دین  
 مسلمان کی دنیا بھی قطعاً نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ مسلمان کی دنیا کا دامن ہی اسلام  
 نے توحید الہ اور یوم آخرت پر ایمان بالغیب کے ساتھ اس طرح بانڈھ دیا ہے

کہ اگر وہ دنیا کی عملی زندگی میں ان سے کام نہیں لیتا تو پھر اور چاہے خالص دنیا کی بالفرض سیاسی و معاشی تعلیمی و تمدنی سائنسی و صنعتی ترقیوں کے آسمانوں ہی پر کیوں نہ اڑنے لگے۔ لیکن یہ مسلمان کی اسلامیت کی ترقی بہر حال نہ ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ دوسری نسلی و وطنی قومیتوں کی طرح مسلمان نام ایک بے نسل و بے وطن قوم و قومیت کی ترقی ہوگی۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی      این رہ کہ تومی رومی بہ ترکستان است

خدا و آخرت پر ایمان بالغیب ہی کا لازمی مطالبہ ایمان بالرسالت ہے جب یہ کائنات اور اس میں انسان ایک صاحب علم و ارادہ ذات یا خدا کا پیدا کردہ ہے، تو آپ سے آپ اس کے پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی معلوم یا جانی بوجھی مراد بھی ہوگی۔ نیز اس مراد و مقصد کا صحیح صحیح علم اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا ٹھیک ٹھیک قانون و رہنمائی بھی صرف وہی عطا کر سکتا ہے اور صرف اسی کو حق بھی ہوگا اسی کی رہنمائی کے بغیر نہ ہم سفر زندگی کی صراطِ مستقیم پاسکتے ہیں اور نہ اس کی آخری منزل (آخرت) یعنی انسان کے خصوصی انسانی مقصد آفرینش میں فلاح و کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

اس سے گانہ فکری و ایمانی انقلاب کو عملاً برپا کرنے کیلئے عین فطرت انسانی کے مطابق ساتھ ساتھ دوزہینتی انقلاب ناگزیر ہیں۔ ایک علاقہ دوسرا اتفاقاً بالفاظ دیگر جاہی و مالی آخرت تو آخرت دنیا کے انفرادی و اجتماعی قومی و بین اقوامی نسلی و لسانی حتی کہ فرقہ وارانہ یا نام نہاد مذہبی سارے فسادات کی جڑ چاہ و مال کی حرصی طلب ہے۔ یعنی جاہ و مال ہی کو زندگی کا مطلوب و مقصود ٹھہرا لیتا اور نہ مذہب

دنیا کا گھٹیا سے گھٹیا بھی کوئی معلوم نہیں جو مال و جاہ کی حرص و ہوس کی تعلیم و ترغیب دیتا ہو۔

رہا اسلام تو اس نے اپنی کتاب میں ہدایت کی طلب و درخواست کی سات آیتوں (یا جملوں) کے ایجاد کی و اعجازی دیا چہ کے بعد ہی آغاز کتاب میں حصول ہدایت کے لئے کلی تین آیتوں میں جو پانچ بالکل فطری و عقلی شرطیں بیان کی ہیں ان میں عملاً و — اقامت صلوة و انفاق — جاہ و مال ہی کی جر پرتیشہ لگاتی ہیں۔ حق پسندی و حق طلبی کی راہ مارنے اور ہر طرح کے انفرادی و اجتماعی فسادات پھیلانے میں ہمیشہ سب سے زیادہ حصہ جاہ و مال کی حرصی طلب و مقابلہ کا رہا ہے۔ پھر اب تو ماڈرن یا مغربی زندگی کی لائی اور پھیلائی ہوئی سکولرزم (مانڈیسمیت) کی دعوت نے آخرت کو عملاً زندگی سے دین نکالا ہی دیدیا ہے۔ ہر پھر کر دنیا ہی دنیا کے جاہی و مالی — چالو سکے کی زبان میں سیاسی و معاشی — تفوق و برتری کا اثر و سابقت ہی کا نام ہیں ترقی قرار پا گیا ہے۔ اس ترقی نے زمین پر فساد کے سانچوں کی ترقی کو کس آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اس میں ”ہر مرد و عورت و بچہ“ کو کتنا عظیم الشان حصہ ملا ہے! اس کا اندازہ ابھی ابھی اخبار ۱۳ جنوری ۱۹۷۲ء یا تھ میں آیا اس کی بمبئی سے ۱۰ جنوری کی چلی ہوئی ایک اطلاع سے ملاحظہ ہو:۔

”پروفیسر پی ایم بلیکٹ نے جو برطانیہ کے ایک ایٹمی سائنسداں ہیں اور نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں، آج یہاں کہا کہ اگر صرف امریکہ کے ایٹمی ذخیرہ کو برابر تقسیم کر دیا جائے تو بیس ٹریلین ڈالروں کی طاقت کی تباہ کاری دنیا کے ہر مرد و عورت اور بچہ کے حصے میں آسکی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ امریکہ کے ایٹمی ذخیرہ میں تباہ کاری کی جو طاقت ہے، وہ

دوسری جنگِ عظیم میں تمام فریقوں کی طرف سے پانچ سال تک استعمال کئے ہوئے

بمبوں سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔“ انا اللہ!

یہ تفوق و برتری یا قرآن کی زبان میں ”علو فی الارض“ کے ماڈرن میدان کے صرف ایک کیمپ یا فریق امریکہ کی جان لیوا ترقی کا سائنسی حساب ہے۔ دوسرا فریق روس اس میدان ترقی میں بڑھا ہی ہوا ہے۔ ورنہ ان پروفیسر صاحب ہی کی شہادت کی رو سے امریکہ سے کچھ کم تو بہر حال نہیں! لیکن علاج اس ”تباہ کار ترقی“ کا ہمارے سادہ لوح پروفیسر کے نزدیک بھی صرف مادی اسلحہ کا ترک ہے، نہ کہ اس کے مادہ تفوق و برتری کی سابقہ ذہنیت کا!

اسلام جاہ و مال میں مقابلہ و مسابقت کی اس علو طلب و فساد انگیز ذہنیت کو سرے سے انسان کی حقیقی انسانیت کی ترقی یا ابدی فلاح آخرت کے مانع قرار دیتا ہے۔ اس علو طلبی یا احساس برتری کی ذہنیت کا جس نے شیطان کو شیطان بنا چھوڑا، کارگر توڑنا اس کے جذبات کو قابو میں رکھنے کی تدبیر ایک ہی ہے کہ آدمی اپنے کو ایسی انتہائی عظمت و کبر پائی والی ذات کے سامنے کھڑا پائے کہ خود اپنی کسی طرح کی نام نہاد یا عرفی بڑائی پر نظر پڑے بھی جائے تو ٹھہرنے نہ پائے۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے کھڑا ہو کر اپنی بلندی و برتری کا دعویٰ کس منہ سے کرے گا۔ اسی طرح کسی بڑے با اقتدار جاہ و جلال والے بادشاہ کے عین دربار میں کانپتے ٹھہرتے کھڑے رہ کر پہلو میں کھڑے اس کے کسی حقیر سے حقیر جو بدار کے ساتھ بھی تخفیر کا کوئی برتاؤ کرنے کی جرأت کسی بڑے سے بڑے امیر و دربار کو بھی کتنی ہوگی۔ نماز کچھ بھی نماز ہو تو اس کی روح بندہ کی اپنے خالق و مالک کی بے پایاں عظمت و جلال کے

لے تلك الدار الاخرة نجلها للذين لا يريدون علوانا في الارض ولافسادوا والعاقبة للمتقين

(قصص ۹۷)

آگے اپنی بے پایاں بندگی و عاجزی کے اظہار و استحضار کے سوا کیا ہے۔ تفوق و برتری یا جاہ طلبی کی حرص و ہوس ہی کی طرح مال کی حرصی طلبت محبت بھی انسان کو حق و خیر کے دیکھنے سننے سے اندھا بہرا کر دیتی ہے بلکہ مال کی حرصی طلب کا منشا بھی اکثر مالی برتری کی راہوں سے جا ہی برتری کی طلب ہوتی ہے۔ غرض ایک مال جاہ کیا دنیا کے کسی معاملہ میں بھی نفس و نفسانیت یا خود غرضی — خواہ وہ شخصی نہیں تو حی و وطنی ہی ہو — کا غلبہ ہی حق بینی و خیر پسندی کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ ہے۔ اس خود غرضی یا لینے ہی لینے کی ذہنیت کو دینے ہی دینے کی ذہنیت پر زور دینے سے توڑا اور لین دین کے سارے معاملات کو اعتدال و انصاف کے حدود میں رکھا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید نے ایک طرف اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ انفاق یا ایتائے زکوٰۃ کے حکم کو قریب قریب ہر جگہ لازم و ملزوم بنا دیا ہے دوسری طرف انفاق کے بجائے کسبِ اخذ یا دینے کی جگہ لینے پر زور کیا کہنا چاہئے کہ اس کے حکم و امر کی پورے قرآن میں ایک آیت نہیں ملتی یہ نہ قرآن و اسلام کی اصطلاح میں انفاق کو صرف مال یا لین دین کے معاملات میں ایشار و قربانی تک محدود رکھا گیا ہے بلکہ نفسِ انقائی ذہنیت پیدا کر کے معاشرہ میں ہر طرح کی نفع رسانی کو عام کرنا ہے۔ البتہ مال سے انسان کو جان تک سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے، اسلئے مخصوصی زور اس کے انفاق پر دیا گیا۔ ورنہ عموم میں تو ہر نیکی کو انفاق ہی کے ساتھ خود قرآن میں اتنا لازم و ملزوم ٹھہرا دیا گیا کہ ”تم نیکی ہرگز کسی طرح یا ہنسی سے نہ کرو گے جب تک اپنی محبوب پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرتے ہو“ (الن تنالوا البر حتی تنفقوا

سلسلہ اس عظیم حقیقت کا انکشاف راقم ہذا کو ”سلسلہ تجرید“ کی کتاب تجرید معاشیات کے لکھنے وقت ہوا جس میں اس حقیقت کی پوری تفصیل کی گئی ہے۔



ہماتحبون) گو یا خیر و نیکی یا نیک زندگی کی کلی حقیقت ہی یہ ہے کہ اپنی محبوبے مرغوب چیزوں  
سوی کام زیادہ تر دوسروں کی آرام یا نفع کا لیتا ہے۔ حدیث میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اسی  
حقیقت کو اس طرح کھول دیا گیا ہے کہ سب اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کی نفع رسانی میں لگا  
رہے (خیر الناس من ینفع الناس) لغت کی رو سے بھی ”بر“ کے مفہوم میں خاص نہور  
وسعت و عموم ہی پر ہے یعنی ہماری استطاعت و اختیار میں جو چیز بھی ایسی ہو جس سے  
دوسروں کو کسی طرح کا نفع پہنچا یا اور ان کی راحت و مسرت کے کام میں لایا جاسکتا ہو  
اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔

انفاق کی اس کمی و کیفی وسعت کا اندازہ لگانے کیلئے حضرت ابو ہریرہؓ مروی  
ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اسلام کا یہ ایک ارشاد ہی کافی ہے کہ ”ہر شخص کے ہر چوڑ بند  
یا عضو پر سورج نکلنے والے دن یعنی روزانہ صدقہ واجب ہے“ ظاہر ہے یہاں صدقہ سے  
مراد صرف مال یا روپیہ پیسہ کا خرچ کرنا نہیں ہو سکتا۔ اس کی ہر شخص کو ہر روز قدرت  
ہی کہاں۔ اس لئے آگے چند مثالوں سے واضح فرمادیا گیا کہ دوسروں کو کسی نہ کسی قسم کا کوئی  
چھوٹا بڑا نفع پہنچانا یا ان کی خیر خواہی و ہمدردی کا کوئی کام کر دینا اسلام کی نظر میں  
سب صدقہ ہی صدقہ ہے۔ مثلاً

” دو شخصوں کے درمیان صلح کروادینا بھی صدقہ ہے (حتیٰ کہ) کسی کو سواری پر سوار کرانے میں

موردینا یا اس کا سامان اٹھادینا بھی صدقہ ہے (حدیث کہ) کوئی اچھی بات کہے یا بتلا دینا بھی

صدقہ ہے۔۔۔۔۔ راستہ سے تکلیف کی چیز (کاٹنا وغیرہ) ہٹادینا بھی صدقہ ہے۔“

اس طرح اسلام نے اپنے کو مسلمان کہنے کہلانے والے ہر فرد پر انفاق یا خیرات و صدقات کا  
ہر روز جو مطالبہ عائد کر دیا ہے اس کا مطلب و مدعا یہی ہے کہ جان و مال و وقت و

وقت کے تمام سرمایوں اور صلاحیتوں کو زندگی بھر اپنیوں پر ایوں حتیٰ کہ بے جان پیمان  
راہ گروں تک کیلئے حسب موقع و مقدرت برابر استعمال کرتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلمان  
وہ ہے جس کی سیرت و ذہنیت لینے سے زیادہ دینے کی نفع اندوزی یا نفع رسانی کی خود غرضی  
زیادہ ایثار و قربانی کی یا حقوق طلبی سے زیادہ فرائض شناسی کی ہو، نہ کہ جدیدی تعلیم و  
تہذیب والوں کی جس نے قومی و وطنی سیاسی و معاشی لونی و لسانی جماعتی و طبقاتی خالص  
دنیا ہی دنیا کی مادی حقوق طلبیوں کے فتنوں فسادوں کا ساری زمین کو اکھاڑ بنا دیا ہے۔

دنیا ہی دنیا کے ان انفرادی و اجتماعی شخصی و قومی منافع و مقاصد پرستی کوئی  
کشاکش یا مقابلہ و مسابقت کی دور ایسی زندگی والے معاشرہ میں پرورش ہی کیسے پاسکتی ہے  
جس کی نظر اس پوری زندگی کے کسی نیک و بد ابدی انجام پر ہو اور جس انجام کی خیر و فلاح  
کی ایک بڑی شرط اس دنیا کی خود غرضانہ و نفس پرستانہ حرص و ہوس سے بچنا بچانا ہو (من یوق  
شعر نفسه فاولئک ہم المفلحون) اس سے بڑھ کر یہ کہ جس زندگی اور اس کی ساری قوتوں  
اور صلاحیتوں کے متعلق تصور یہ ہو کہ وہ سرے سے اپنی بلکہ ہی نہیں بلکہ اپنے حقیقی خالق  
و مالک کی عطا و اعانت ہیں۔ — جیسا کہ "وہما رزقہم" سے واضح ہے۔ — وہ مالک  
معطی کی مرضی کے خلاف یا اس کی اجازت سے زیادہ اپنے ذاتی و نفسانی اغراض و مقاصد  
پر خرچ ہی کیسے کریگا۔ پھر اگر بظاہر و برائے نام کچھ مجازی یا مستعار ملکیت ہم کو انتظامی  
مصالح کے مد نظر اپنی جان و مال پر عطا بھی کر دی گئی ہے تو مسلمان ہونے کے ساتھ ہی وہ ہم کو  
اخروی و ابدی نجات و فلاح یا جنت کے معاوضہ میں خرید لی جا چکی۔ — ان اللہ  
اشتری من المؤمنین انفسہم و اموالہم بان لہم الجنة۔ — اس طرح جس چیز کو ہم  
بیچ چکے اس پر کسی طرح کے من مانے تصرف کا ہم کو حق کیا رہ گیا۔

اسلام کی لاریبی "کتاب ہدایت" سے زندگی میں لاریبی و یقینی ہدایت یاروشنی حاصل کرنے کیلئے مفصلہ بالا پنچگانہ عقلی و قلبی اصولی و کلی شرائط کو مختصراً پھر ایک مرتبہ ذہن کے سامنے کر لینا چاہئے کیونکہ ان کے بغیر نہ کوئی غیر مسلم اس کتاب کو بطور زندگی کے ہدایت نامہ کے قبول کر سکتا ہے اور نہ برائے نام قبول کرنے والے نام کے ہم مسلمان ان کو اپنی زندگی کا عملی دستور العمل بنائے بغیر اولئک ہم المفلحون کے قطعی و حتمی وعدے کے سزاوار بن کر کامیاب مسلمان بن سکتے ہیں۔

۱۔ سیکے پہلی شرط "ایمان بالغیب" ہے۔ دین کی بنیاد ہی تمام تر اس پر ہے کہ ہماری سامنے کی محسوسات و مشاہدات کی دنیا یا عالم شہادت کے مادہ ایک عالم غیب بھی ہے اب کوئی خوش فہم یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہمارے حواسی ادراکات یا ان ہی پر مبنی اور اس عالم شہادت ہی سے متعلق کچھ عقلی و استدلالی محسوسات کے علاوہ ماضی اور مستقبل کے غیب میں سرے سے کچھ ہے ہی نہیں، یا ہم کو اس سے کوئی سروکار نہیں تو اس غیب یا اندھیرے میں کسی روشنی یا ہدایت کی ضرورت و طلب کا سوال ہی کیا رہا۔

۲۔ البتہ جو اس اندھیرے اور غیب کو محسوس کرتا ہے وہ اس کے کم از کم احتمالی خطرات سے بھی ڈرے گا اور ان سے بچنے کے لئے آپ سے آپ روشنی کا بھی طالب ہوگا۔ متقی کے لفظی معنی ہی ہیں "ڈرنے اور بچنے والے" کے یعنی جو کسی خطرہ کو محسوس اور اس سے ڈر کر بچاؤ کی احتیاطی و اختیاری فکر و تدبیر کرتا ہے۔ ایسا متقی و محتاط ذہن لازماً اپنے کو انکار و استکبار سے محفوظ اور قبول حق کے لئے تھلا رکھے گا۔ یہی اس کے حق میں

۱۔ اس پر مفصلاً گفتگو ضمیمہ کے عنوان سے آخر کتاب میں ملے گی اور "تہذیب و عقلیات" کے نام سے ایک پرانے لکچر میں بھی۔ (شائع کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)

صلاتی ذہنیت ہوگی جو اس کو حق یابی کا طالب و ساعی بھی بنا دے گی۔ پھر انشاء اللہ  
 «الذین جاہدوا فینا لنہدیہم سبیلنا» کا وہ خدائی وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ جو خدا کی  
 طرف ایک بالشت بڑھتا ہے خدا اس کی طرف دو بالشت پڑھتا ہے۔ حدیث کہ جو اس کی طرف  
 چل کر جاتا ہے اس کی طرف وہ دوڑ کر آتا ہے۔ ہم ذرا اس کی طرف قدم اٹھا کر تو دیکھیں۔

۳۔ اس قدم کا بڑا بلکہ کہنا چاہئے کہ سب سے بڑا ثبوت اتفاق یا انفاقی ذہنیت  
 ہوگی، جو شخص بھی کسی خطرہ و ضرر سے بچنا یا کسی نفع و مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ  
 اس نفع و ضرر کی اہمیت کے مناسب اس کی راہ میں اپنی بساط بھر جان و مال و وقت و  
 قوت وغیرہ کسی قربانی کا کوئی قدم پیچھے کیسے ہٹالے گا۔

۴۔ اور راہ کی رہنمائی کرنے والے کو کیسے خود ہی تلاش نہ کرے گا چہ جائیکہ  
 اُلٹے اس راہ کی طرف کوئی پکار رہا ہو۔ سمعنا منادیاً ینادی للایمان ان امنوا بریکم" تو وہ  
 کیسے امناً کہہ کر نہ دوڑ پڑے گا یہی "غیب" کے اندھیرے میں "بما انزل الیک وما انزل من  
 قبلك" کی روشنی یا مکمل نظام رسالت پر اور لازماً رسول اسلام پر ایمان ہوگا۔

۵۔ بالآخر "غیب" کے اس اندھیرے میں سب سے زیادہ نفع و ضرر اور خوف و خطر کا  
 اندھیرا موت یا مستقبل و آخرت کا ہے اس لئے ہدایت طلب زندگی کیلئے آخرت پر ایمان  
 سے بھی بڑھ کر ایمان کی شرط کا مطالبہ کیا گیا۔ ویا لآخرۃ ہم یوقنون۔

ہدایت یابی کی ان ہی شرائط یا مقدمات خمسہ کو ایماناً و عملاً قبول و اختیار  
 کرنے والوں کو اپنے رب کی راہ پر چلنے والا اور اس کے نتیجہ میں دین دنیا کی فلاح و کامیابی کا  
 حتمی یقین و اطمینان دلایا گیا۔ اولئک علی ہدی من ربہم و اولئک ہم المفلحون۔

یاد رہے کہ جس طرح "ایمان یا الغیب" کے جامع مطالبہ میں تمام ایمانی و اعتقادی

غیب داخل ہیں اسی طرح "اقامت صلوة" اور "انفاق" کی شرط خدا اور بندہ کے عملی حقوق۔ عبادات و معاملات و اخلاق اور معاشرت۔ سب کو حاوی ہے۔ پھر پورے قرآن میں جگہ جگہ خالق و مخلوق کے ان عملی حقوق و فرائض کو عمل صالح سے تعبیر فرمایا گیا اور ہر جگہ ایمان کو عمل صالح کے ساتھ غیر منفک طور پر مقید یا لازم و ملزوم قرار دیکر صرف دین و آخرت ہی کی کامل و یقینی نجات و فلاح کو اس پر منحصر نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ دنیا کی انفرادی و اجتماعی کامیابیوں کو بھی ایمان و عمل صالح کی جامع و توام زندگی ہی پر موعود و مرتب فرمایا گیا ہے۔ اور اس راقم نابکار کے نزدیک عین کتاب اللہ ہی کی نصوص و قطعیات کی رو سے "مسلمان کیا کریں؟" کا جواب اسلام کی طرف سے صرف ایک ہی ہے کہ یہ اکثریت اقلیت حاکمیت محکومیت غلبہ و مغلوبیت کے جس زمان و مکان میں جب جہاں کہیں ہوں، اس حال و ماحول کے مطابق اپنے اختیار و وسعت کھری شخصی و انفرادی خانگی (گھریلو) و اجتماعی "ایمان و عمل صالح" کی زندگی کا حق ادا کرتے رہیں اسی سے اللہ تعالیٰ کی رضا و نصرت حاصل ہوگی۔ پھر یہی خدائی رضا و نصرت ہر حال و ماحول کے مناسب ہمارے مسائل و مشکلات کو حل کرنے والے ظاہری اسباب و وسائل بھی پیدا کرے گی نہ کہ غیروں کی بلکہ ان ہی کی پوزدہ و ارتقائی میں سارا زور محض ظاہری مادی ماسعی و تدابیر پر لگا دینا یہ تو سرے سے خدا چھوڑی اور تو حیدر اللہ کے بالکل بنیادی و ابتدائی مطالبہ کے منافی سراسر غیر اسلامی راہ و روشنی ہوگی۔ گویا خدا کی خدائی صرف آسمان تک محدود ہے۔ زمین یا دنیا کے نیک بد میں اس کو کوئی دخل نہیں۔ تو مسلمان کو بھولنا نہ چاہئے (حالانکہ ہماری سب سے بڑی بھول ہی ہے کہ اسلام و قرآن کا خدا آسمان ہی کا نہیں، آسمان و زمین اور ان کے بیچ میں جو کچھ بھی ہے سب ہی کا وہی اور وہی "خدا یا اللہ واحد" اور رب سب ہی کچھ ہے۔ ان الہکم لواحد رب السموات والارض وما بینہما۔۔۔ وہی

اپنی حکمت و علم کے مطابق آسمان سے لے کر زمین تک کی پوری کائنات و کارخانہ کے پورے کاروبار کو چلاتا ہے۔ — هو الذی فی السماء الذی فی الارض الذی هو الحکیم العلیم — یدبر الامر من السماء الی الارض۔

ہدایت یابی کی نفسیات و منطق کے ان پانچ اصول و مقدمات میں اصل الاصول و مقدم ترین "متقیانہ ایمان بالغیب" ہی ہے، اگر کوئی شخص اس عالم شہادت کے انتہائی ماضی و مستقبل میں سرے سے غیب ہی کا شعور و ادراک نہیں رکھتا یا دیدہ دانستہ اس سے اعراض و انکار ہے یا قولاً متکبر نہ ہی عملاً اس غیب اور اندھیرے کے خطرات سے کسی موثر و معتبرہ احتمال کے درجہ میں بھی قطعاً پرواہ ہی تو اس نے تو اپنی انسانی قنطرت ہی کا انکار اور اس کو مسخ کر کے اپنے دل و دماغ آنکھ کان سب پر ہدایت و حق کی طلب یافتہ کے دروازے بند کر لئے اور "ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم عشاوہ" کی خدائی "مغضوبیت" کا سزا یافتہ بن گیا ہے یعنی جس طرح کسی غیب کے اندھیرے میں روشنی یا ہدایت کی جستجو اسی وقت ہوگی جبکہ ہم اس کو اس اندھیرے کے احساس کے ساتھ اس کے امکانی و احتمالی خطرات کا خوف اور ان سے بچاؤ کی فکر بھی ہو "یومنون بالغیب" کے ساتھ "المتقین" کی قید کا مطلب یہی ہے۔ علی ہذا "اولئک ہم المفلحون" کی ہدایت یاب اور لازماً فلاح یاب جماعت کے برعکس ہدایت و فلاح سے لابلہ محرومی بھی ایسی جماعت نے خود ہی اپنی قسمت بنالی ہے جو ہدایت یابی کے پہلے ہی قدم عالم شہادت پیچھے کسی عالم غیب کے وجود کا قولاً و عملاً کفر و انکار کر چکی اور ہم المفلحون کے وعدہ کے بجائے "لہم عذاب عظیم" کی مستحق بن گئی۔

ہدایت و ضلالت کے لحاظ سے کھلے کفر و ایمان والوں کی ان دو جماعتوں یا

تقسیموں کے علاوہ ایک تیسری تقسیم ایسے لوگوں کی نکلتی ہے جو دنیا ہی کے شخصی و قومی مفاد و مصلحت یا محض کسی خاندانی ورسی روایت عادت کی بنا پر زبان سے تو اپنے کو خدا و آخرت سب ایمان رکھنے والا کہتے جاتے ہیں لیکن دل یا عمل سے اس کی تصدیق کیا تکذیب انکار ہی کرتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ بھی قطعاً مومن نہیں بلکہ اس دور غیبن سے بندوں ہی کو نہیں گو یا خدا کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر خود فریبی یا اپنے ہی کو دھوکا دیتا ہے جس کو یہ بد عقل محسوس تک نہیں کرتے۔ یہ حقیقت میں کھلے کفر کے مرض سے بھی بڑھ کر فساد پھیلانے والا مرض ہے اس زمانہ میں خصوصاً یہ دور غی منافقانہ سیاست و صحافت سب ہی افساد فی الارض کی سب سے بڑی وبا ہے ایسی وبا کہ اٹھے اسی کے عین اصلاح ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس مرض نفاق کا ساتویں صدی میں جو نقشہ قرآن مجید نے دوسرے ہی رکوع میں کھینچا ہے وہ آج بیسویں صدی میں کیا آنکھوں کے سامنے ہے کہ جہاں نفاق کے مریضوں سے

کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ کہتے ہیں کہ واہم و اذا قیل لہم لا تقسدا وافی  
 ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں، یاد رکھو کہ یہ درحقیقت الارض قالوا انما نحن مصلحون  
 صلاح کے نام سے فساد ہی پھیلانے والے ہیں (لیکن اپنی منافقا الا انہم ہم المفسدون ولكن لا  
 ذہنیت کی بدلت سمجھتے ہی نہیں بلکہ اٹھے سچے ایمان والو یشعرون و اذا قیل لہم امنوا  
 ہی کی جہن بناتے ہیں۔ حالانکہ خود ہی اتھے بڑے جہن میں کما امن الناس قالوا انو من  
 کہ اپنی حماقت کو محسوس بھی نہیں کرتے (اور یہ نفاق ان کی کما امن السفہاء الا انہم ہم  
 اس حرکت ہی سے ظاہر ہے کہ) جب اہل ایمان سے ملے السفہاء ولكن لا یعلمون و اذا  
 ہیں تو ایمان کی باتیں کرتے ہیں پھر جب اپنے شیطانی لقوا الذین امنوا قالوا انما  
 لیڈروں کے پاس تجلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اہل میں و اذا خلوا الى شیطینہم

تو ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں باقی ان سے محض مذاق قالوا اننا معکم انما نَحْنُ  
 کرتے ہیں (وہ کیا مذاق کرتے دراصل) اللہ تعالیٰ ہی مستہزؤنہ اللہ بیستہزیء  
 ان سے مذاق فرماتے اور ان کی سرکشی کی بدولت دھیل بھمدومید لھر فی طغیانہم  
 دیتے چلے جاتے ہیں کہ وہ اسی میں سرگرواں رہیں۔ یعمہون۔

ان کی اس منافقانہ راہ و روش کا حاصل خود ان کے حق میں اس کے سوا کیا رہا کہ  
 زبان و ظاہر کی حد تک ہدایت کو قبول کر کے بھی اس کے بدلے میں ضلالت ہی کو  
 خرید لیا۔ ایسا سودا نہ حقیقتاً ان کے حق میں سود مند رہا اور نہ وہ ہدایت یاب رہے  
 اولئك الذين اشتروا الضلالة بالهدى فما ربحت تجارتهم وما كانوا مهتدین۔  
 بس ہدایت و ضلالت کے باب میں کتاب ہدایت ہی کے خصوصاً ان نشان زد  
 نشانیوں کے آئینہ میں آگے ذرا ہم مسلمان نام اس "بہترین امت" (خیر امت) کے اسلامی  
 سراپا کا جائزہ لینا ہے جس کو تمام عالم کی ہدایت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور پھر اس  
 کتاب ہدایت ہی کے عطا فرمائے ہوئے نظام صلاح و اصلاح کی روشنی و رہنمائی میں  
 مسلمانوں کے مسلمان یا خیر امت بننے بنانے کی کچھ تفصیل پیش ہوگی۔

والله الموفق والمستعان



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

وَتَوَّابُوا بِالْحَقِّ ۗ وَتَوَّابُوا بِالصَّبْرِ

”وَالْعَصْرِ“

عصر کے معنی اور اس کا مفہوم | ”عصر“ کے معنی زمانہ یا وقت کے ہیں، عربی محاورہ میں اس کا مفہوم  
 اور اس کا مفہوم | تصور مرور و گذران یا چل چلاؤ کا ہے۔ گویا زمانہ خود اپنی اس  
 داخلی حقیقت و تصور اور رون رات کے خارجی تجربات و مشاہدات ہی کی رو سے اس بات  
 کی سراپا شہادت و ثبوت ہے کہ زمانہ کی کسی چیز میں ٹھہراؤ یا بقا و ثبات قطعاً نہیں،  
 ہر شے پادر ہوا، آئی جانی اور فانی ہے، لہذا اس انسان سے بڑھ کر کون نادان و خامر  
 اور زبان کار ہوگا جو اپنی زندگی جیسی بے بہاد دولت اور اس کی ساری فرصت و  
 قوت صحت و طاقت، مال و ثروت کو ایسے چل چلاؤ والے ناپائیدار مقاصد و مشاغل  
 میں لگا دے، جن کا نہ اس غیر یقینی زندگی میں حصول یقینی، اور کسی درجہ میں حاصل

ہو بھی جائیں تو زندگی بھران کا بقا یقینی ہے، بفرض باقی بھی رہیں تو بیماری آزاری وغیرہ بیسیوں عوارض و موانع ایسے لگے رہتے ہیں کہ جی بھر کر ان سے متمتع و لطف اندوز نہیں ہونے دیتے، ہونے بھی دیں تو لطف اندوز ہونے والی یہ زندگی ہی اتنی ناپائیدار اور غیر یقینی ہے کہ یقین پل بھر کا نہیں۔

غلط نظریہ حیات | ان دانشمندوں کا کہنا ہی کیا جو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ موت منہ پھاڑے دانت نکالے ہر آن سامنے کھڑی ہے پھر بھی ان کے علم و دانش کا فتویٰ یہی ہو چکا ہے کہ زندگی بس یہی گنی چنی آئے جانے والی چند سانسوں کا نام ہے اور موت کے منہ میں چلے جانے کے بعد نہ اس زندگی کا کوئی انجام حاصل ہے نہ مطلب و مصرف اس لئے ان گنی چنی سانسوں ہی کو عنایت جان کر جو کچھ سامنے دسترخوان پر آجائے جلدی جلدی ہاتھ مار کر سیٹ تک پہنچا دو یعنی وہی جو شیخ شیراز کے الفاظ میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ ”خوردن برائے زیستن“ کے آگے جب ”زیستن“ یا نفس زندگی کا کوئی مطلب و مدعا معلوم و متعین نہیں تو اس دور تسلسل کی منطق پر ایمان لانے سے چارہ ہی کیا کہ ”کھانا چینے کے لئے ہے اور جینا پھر الٹ کر کھانے کے لئے“ اور اسی الٹ پھیر میں پلٹے کھاتے کھاتے بالآخر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے جانوروں ہی کی طرح دیر سویر انسان نام ”اعلیٰ درجہ کا حیوان“ یا بڑھیا جانور (HIGHER ANIMAL) کا بھی مرتے چلے جانا۔

جانور تو غریب جانور ہے ہی اس کے اندر مستقبل کا کوئی شعوری سوال

ہی کہاں غیر شعوری جہلی مشاغل کی زنجیروں میں بندھا کھاتا پیتا، جتنا جاتا، مر جاتا ہے  
 لیکن انسان جس کی انسانی فطرت و نفس ہی میں حاضر و حال سے زیادہ مستقبل  
 و آل پر نظر اتنی جمادی گئی ہے کہ اس چند روزہ زندگی کو چند روز جان کر بھی اس کے  
 "آج" سے زیادہ "کل" ہی کی فکر میں مرتا کھپتا رہتا ہے تو اس پوری زندگی کی "آج"  
 کے "کل" یا انجام و عاقبت کے سوال سے غفلت و بے فکری کی "خود فراموشی" کو "خدا  
 فراموشی" کی بالکل قدرتی و واجبی سزا کے سوا کیا کہا جائے، "نَسُوا اللَّهَ فَاَنْسَاهُمْ  
 اَنْفُسَهُمْ" اور یہ بے فکری و بے حسی بلکہ سچ پوچھتے تو بے حیائی کی کچھ ایسی ہی ذہنیت  
 ہے کہ ایک شخص جس کو پھانسی کا قطعی حکم ہو چکا ہے صرف دن اور وقت مقرر نہیں ہوا  
 وہ اسی مہلت کو ذہنیت پا کر تو کچھ کھانے پینے نام و نمود کا جاویدجا موقع مل رہا ہے،  
 جلدی جلدی اس سے فائدہ اٹھالینے کے سوا کچھ اور اس کو سوچھانی ہی نہیں دیتا،  
 دل و دماغ ہے مگر اس سے سمجھتے نہیں، کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر  
 ان سے دیکھتے نہیں، لَمْ يَفْقَهُوْنَ بَھَا زٍ وَّلَمْ يَنْصَرِفُوْا اَعْمٰی وَّلَمْ يَنْصَرِفُوْا اَعْمٰی  
 وَّلَمْ يَنْصَرِفُوْا اَعْمٰی

اس اندھی بہری منطق و فلسفہ والی ذہنیت سے حجت کرنا تو بعینتس کے آگے  
 بین بجانا ہوگا البتہ سوال ان سے ہے جن کی انجام میں و دوراندیش انسانی فطرت کے  
 اندر اس پوری زندگی کے آل و مستقبل کا سوال کچھ زندہ ہے اور ان سے بھی بڑھ کر  
 ان سے جن کے کان اور آنکھیں ایمان نے کھول دی ہیں اور جو اس سوال کے قطعی و

آخری جواب کو پا اور بان چکے ہیں کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی نقصان و خسران یا ٹوٹے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے کہ ایسی فانی اور بے ثبات زندگی کے بدلے جس کے بقا و ثبات کی ضمانت ایک لمحہ اور پل بھر کی بھی نہیں کی اور دی جا سکتی غیر فانی اور ابدی انجام و آخرت کی صلاح و فلاح کو دھڑا دھڑا پیچھے رہیں۔

صحیح تصویر حیات | جس کو دنیا بھر کے سچوں سے سچا جان کر ہم آخرت کی ابدی زندگی کو

مان چکے ہیں، اسی کو کس شہر و مدینے سے سورہ کہف کے آخر میں خصوصیت سے ان ہی

اندھوں بہروں توحید و آخرت کے منکروں (الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ

عَنْ ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا) کو تنبہ و آگاہ کر دینے کا حکم ہوتا ہے

کہ تم کو بتائیں ہم کہ زندگی کے سارے مشاغل و اعمال میں سب سے بڑھ کر زبان کا

یا خسارہ اور گھانا اٹھانے والے کون ہیں؟ وہی جنہوں نے اپنی ساری جدوجہد اور

سرگرمیوں کو اس ذلیل و حقیر زندگی میں گنوا دیا اور (خوش فہمی سے الٹے) سمجھتے رہے

کہ بڑا پالا مارا، یہی تو ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں اور (قیامت) کے

دن اس کا سامنا ہونے سے انکار کیا، جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ (آخرت کے لحاظ سے)

اس دنیا کے ان کے کئے دھرے سارے کام غارت ہو کر رہ گئے، لہذا قیامت کے دن

ان کے لئے ان کاموں کی کوئی قیمت یا وزن ہمارے ہاں نہ ہوگا۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ

بِالْآخِرِينَ أَمْ لَا إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ

أَنَّهُمْ يُبَدِّلُونَ صُغَاهُ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاءِ رَبِّهِمْ

فَجَبَّتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا تُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزَنَانَهُ (سورہ انعام ۱۰۳ تا ۱۰۵)

مسلمان نام ہی "انّ الانسان لکفی خسیراً" کے اسی اخروی انسانی خسران سے بچنے والے استثنائی سوداگر کا ہے یعنی اس سودے میں ہمہ گیر انسانی زبان خسران کھاٹے اور نقصان سے بچ صرف وہی فرد و جماعت معاشرہ و ملت سکتی ہے جو ایمان و صلاح کی فکری و عملی زندگی قبول و اختیار کر لے اَلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔

## انسانی خسران

توحیدِ الہ اور ایقانِ آخرت کے انکار سے رونما ہوتا ہے!

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفِي خُسْرٍ

توحید اور ایقانِ آخرت | ایمان کی بڑی جڑ توحیدِ الہ اور ایقانِ آخرت ہے، رسالت وغیرہ ایمان کی اساس ہے کے ایمانیات انھیں دو کے لوازم و توابع ہیں، پھر ان ہی ایمانیات کی جڑوں سے اعمالِ صالحہ کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کے برگ و بار پھوٹتے اور پروان چڑھتے ہیں۔

لیکن توحید کی حقیقت کو ایسا گم کیا گیا ہے کہ جہلا و عوام بلکہ بہترے اچھے خاصے علماء و خواص تک یہ سمجھتے سمجھاتے ہیں کہ خدایا خالق عالم ایک ہی ہے، اس توحید کے مدعی تو قرآنی دعوتِ توحید کے اولین مخاطب عرب کے کٹر مشرکین تک تھے ان سے



۷  
 سوا کوئی بھی الہ نہیں، فَأَعْلَمَ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ اللہ کے ساتھ کسی بھی دوسرے  
 کو الہ مت بناؤ، لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ۔ اللہ کے سوا کون الہ ہے میں نے  
 غیر اللہ تکلم مخاطب غائب ہر صیغہ میں اس توحید الہ کی حقیقت و دعوت کو دہرایا  
 کیا ہے، یقیناً کوئی بھی الہ نہیں، مگر میں ہی أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا، نہیں ہے کوئی بھی  
 الہ مگر تو، ہي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ ہرگز نہیں کوئی الہ نہیں مگر وہی "أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا  
 هُوَ، سورہ اعراف میں مختلف انبیاء علیہم السلام کی زبان سے فرداً فرداً اسی دعوے و  
 دعوت کو دہرایا گیا کہ "اے میری قوم بندگی و پرستش بس صرف اللہ ہی کی کرو، اس کے  
 سوا کوئی تمہارا الہ نہیں، يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ۔ اور سورہ  
 کہف میں تو نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے کہلایا گیا کہ "یقیناً میں تمہارا  
 جیسا بشر ہی ہوں البتہ مجھ کو وحی کے ذریعے یہ علم و پیام ملتا ہے کہ تمہارا الہ صرف  
 ایک ہی الہ ہے قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ  
 یعنی وحی و نبوت کا غلط جوہر ہی توحید الہ کی تعلیم و تبلیغ ہے۔

الہ کا عرب میں بالکل وہی مفہوم و تصور تھا جو ہمارے ہندوستان میں دیوی  
 دیوتا کا ہے یعنی ہر وہ جاندار اور بے جان چیز جس سے آدمی پوجا و پرستش یا بندگی و عبادت  
 کا کوئی تعلق پیدا کر لیتا ہے اور عام طور پر "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کا ترجمہ بھی یہی کیا جاتا ہے  
 کہ "نہیں ہے کوئی معبود (یعنی پوجنے کے لائق) مگر اللہ" پھر بھی بزرگوں ان کی قبروں  
 تعزیوں وغیرہ سے مسلمان وہی تعلق و معاملہ رکھ کر جو غیر مسلم دیوی دیوتاؤں سے

رکھتے ہیں کہے اور سمجھے اپنے کو موحد ہی جاتے ہیں!

عبادت و پرستش کی حقیقت کسی کے سامنے اپنی انتہائی کمتری و ذلت یا بندگی و عبدیت کا اظہار ہے، یہ اظہار فطری طور پر بالعموم اسی کی غنطت کے سامنے کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں آدمی کوئی اپنا سود و زیاں فلاح و خسران یا نفع و ضرر دیکھتا ہے غیر اللہ کی "مجبودیت" کے ابطال و نفی میں بندگی و پرستش کی اسی حقیقت کو ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے قرآن توحید کی مستقل دلیل قرار دیتا ہے:-

کیا تم اللہ کے سوا ایسوں کی پوجا پرستش کرتے ہو

أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ قَالَا

جو تم کو نہ کوئی زرہ پھر نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔

يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ أُفٍّ

تف ہی تم پر بھی اور ان پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ

لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ

کے سوا، کیا اتنی (موٹی) بات بھی نہیں سمجھتے۔

اللَّهُ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۶۴-۶۵)

علت و معلول کے لزوم | کچھ انتظامی اسباب و وسائط البتہ نفع و ضرر کے ظہور کے لئے  
کا فلسفہ ختم ہو چکا | بنا دیئے گئے ہیں جن کی تعبیر خود قرآن نے آیات یا علامات سے

کی ہے یعنی یہ اسباب و وسائل بالذات مؤثر و علت نہیں بلکہ محض انتظامی علامات ہیں جس طرح ریل کا ہتھکڑا (سگنل) گاڑی کے آنے جانے کی خالی انتظامی نشانی ہوتا ہے اور گاڑی کا چلنا یا رکننا ڈرائیور کے ارادہ کے تابع ہوتا ہے، علت و معلول کے وجوب و لزوم یا جبر و ضرورت کا فلسفہ کی دنیا میں ہیوم و کانتھ کے ہاتھوں کہنا چاہئے کہ اٹھارہویں صدی ہی میں جنازہ نکل چکا تھا اور اب بیسویں صدی کے رجب اول میں



آئنسٹائن وغیرہ کے بعد سے سائنس کی دنیا میں بھی اس کو دفن ہی سمجھا جا رہا ہے۔ سر  
 آر تھر ایڈنگٹن جیسے اکابر سائنس کے الفاظ میں "علت و معلول کی قطعیت و کلیت کو  
 مادی دنیا سے ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا پڑا ہے" یعنی سائنس یا مادیت کی دنیا میں  
 ہزاروں سال سے جو یہ مسلم چلا آ رہا تھا کہ اشیا یا علت میں بالذات کوئی نہ کوئی ایسی  
 قوت و خاصیت پائی جاتی ہے جس سے معلول کو لز و نادر و انا غیر منفک طور پر پیدا و  
 ظاہر ہوتا ہی چاہئے یہ مسلمہ اب خود مادی و سائنسی تجربات کی رو سے غیر مسلم بن چکا ہے۔  
 ہر فعل و اثر بالذات اور بلا شرکت غیر | لیکن مسلمان نہ فلسفہ و سائنس پر ایمان لانے والے کا  
 خدا ہی کے قبضہ میں ہے | نام ہے نہ ہیوم و ایڈنگٹن پر وہ تو اٹھارہویں صدی سے

بھی ہزار سال پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے جس قرآن پر ایمان لا چکا ہے  
 اور جس ایمان پر اس کو رہتی دنیا تک رہنا اور اسی پر مرنے ہے، اس کی رو سے مادی اور غیر  
 مادی کائنات سموات و ارض میں کہیں بھی کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اپنے کسی بھی فعل  
 اثر یا نفع و ضرر میں آزاد و مختار ہو، جس خالق نے اس کو پیدا کیا ہے وہی بالذات و  
 براہ راست اس کی ہر حرکت و سکون کا بھی خالق ہے اور یہ خالق جس طرح نئے  
 پرانے مادہ پرستوں کا اندھا بہرہ مردہ مادہ نہیں، اسی طرح فلسفیوں اور بہت سے  
 فلسفیانہ مذہبوں کا خدا یا انگلستان کا بے دست و پا بادشاہ بھی نہیں جس نے اپنی  
 مخلوق یا رعایا کو آزادی و خود مختاری دیکر خود کو معزول و معطل کر لیا ہے۔  
 غرض قرآن یا اسلام کی ابتدائی و بنیادی دعوت ہی کا یہ بالکل ابتدائی و

بنیادی لازمہ و مطالبہ ہے کہ ہم ہر چھوٹی بڑی چیز اور اس کے ہر چھوٹے بڑے فعل و اثر کو بالذات اور بلا شرکت غیرے تمام تر خدا ہی کے قبضہ و اختیار میں جانیں اور دیکھیں اور ظاہری اسباب و وسائل کو بس ظاہری یا انتظامی و وسائل ہی یقین کرتے رہیں کسی غیر کو مالک و مختار متصرف ہرگز قرار نہ دیں مالکانہ اختیار جس کی شان یہ ہے کہ اس کے استعمال میں کوئی بھی دوسرا قطعاً کسی درجہ میں بھی مانع و مزاحم نہ ہو سکے، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل اور اسی کا حق ہے، اللہ کے سوا کوئی بڑے سے بڑا دوسرا مالکانہ اختیار و اقتدار کے ساتھ نہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے نہ ضرر۔

”بعد از خدا بزرگ توئی“ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر اسلام اور مسلمان کی نظر میں کون بڑا ہوگا مگر خود اپنی ذات تک کی نسبت خود آپ ہی سے اعلان کر آیا گیا کہ ”کہدو کہ میں خود اپنے لئے بھی کسی نفع و ضرر کا کوئی مالکانہ اختیار مطلق نہیں رکھتا اَلَا اَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا“ تا بدیگیاں چہ رسد تا ہم دوسری جگہ دوسروں کے معاملہ میں بھی اسی قوت کے ساتھ اور آپ ہی کی زبان سے اقرار کر آیا گیا کہ ”کہدو تمہارے لئے بھی میں کسی برائی بھلائی کا مالک مطلقاً نہیں (اَلَا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا اَوْ اِلَّا رَشَدًا) رشد و ہدایت گمراہی و ضلالت سے بڑھ کر کون سا نفع و ضرر ہوگا کہ اسی پر بالکلیہ آخرت کی نہ ختم ہونے والی ابدی زندگی کی فلاح و خسران کا انحصار ہے پھر آپ کی بعثت تمام تر ہدایت کا نفع پہنچانے اور ضلالت کے ضرر سے بچانے ہی کے لئے تھی اور اب قیامت تک آپ ہی کی دعوت کے

رد و قبول یا آپ ہی کے تعلق و نسبت سے ہدایت و ضلالت کے سب سے بڑے نفع و ضرر کا  
ظہور ہوتا ہے گا، بائیں ہمہ خود اس سرچشمہ رشد و ہدایت کو مخاطب فرما کر کس قوت و شدت  
کے ساتھ آگاہ فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارے اختیار میں بالکل نہیں کہ جس کو چاہو ہدایت دیدو  
یہ تو بس اللہ ہی کا کام ہے کہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ  
اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ (۲۸)

سورۃ پونس کے آخری رکوع میں دین کی اسی جوہری و بنیادی غیر مشکوک حقیقت  
کی خود حضور ہی کی زبان مبارک سے تفصیل فرمائی گئی ہے بتدریج و عبادت اور نفع و  
ضرر کے معاملہ میں استعانت کا تعلق کسی غیر اللہ سے قطعاً نہ رکھو ارشاد ہے کہ اہدواے  
لوگو اگر تم کو اس بارے میں کچھ شک و شبہ ہے کہ جو دین میں لایا ہوں اس کی حقیقت کیا ہے  
رَبِّاَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ (تو سن لو کہ تم خدا کے سوا جن کی  
پرستش و بندگی یا پوجا کرتے ہو میں نہیں کرتا۔۔۔ مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ

اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہ پکارو کہ وہ نہ تو تم کو  
کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ ضرر اگر تم نے ایسا کیا  
تو ایسی صورت میں تم یقیناً ظالموں میں سے ہو گے  
اگر خدا تم کو کوئی ضرر پہنچائے تو اس کے سوا کوئی دوسرا  
اس کو دور کرنے والا ہرگز نہیں اور اگر وہ تمہارے  
حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی اس مہربانی

(۱۱)

سے اس کو روکنے والا نہیں۔

پھر ذرا آگے :-

کہدو لوگوں سے کہ پس ہی (وہ غیر مشکوک دین) حق ہے  
 جو تمہارے پاس خود تمہارے پروردگار کے پاس سے  
 آگیا لہذا اب جو سیدھی راہ اختیار کر لیا اپنے ہی  
 بھلے کیلئے کر لیا جو گمراہی میں پڑے گا وہ بھی خود ہی  
 بھگتے گا میں یہ غیر مشکوک دین پیام پہنچانے کے بعد (۱۱۸) اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝ (۱۱۸)  
 بالکل ہی بری الذمہ ہوں۔

سوچنے کی بات ہے کہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کا صرف چار لفظی جملہ کیا کوئی منتر  
 ہے کہ ابھی منٹ بھر پہلے جو کافر ناری یعنی ابدی عذاب و جہنم کا مستوجب تھا وہ اس کے  
 پڑھتے ہی مومن و ناجی یا ابدی نجات و جنت کا مستحق ہو گیا ضرور ہے کہ چار لفظوں سے  
 مرکب اسلام کے اس دعوتی کلمہ کے اندر انسان سے اپنی ذہنیت یا فکر و نظر میں کسی  
 بہت بڑے انقلاب کا مطالبہ کیا گیا ہو۔

انسان کی ساری زندگی جلب منفعت | آدمی کی ساری چھوٹی بڑی حرکات و سکنات دن رات  
 اور دفع مضرت کے درمیان متحرک ہے | کی ساری سرگرمیوں اور مشاغل کو جس طرح اور جس  
 طرف سے چاہو الٹ پلٹ کر دیکھ لو اس کی پوری زندگی کے رفاص (پنڈلم) کو جلب  
 منفعت اور دفع مضرت کے دو ہی لفظوں کے درمیان متحرک پاؤ گے اور اس نفع و ضرر کو  
 وہ اپنے جیسے انسانوں یا دوسری مردہ زندہ مخلوقات کی طرف منسوب کرتا کیا کھلی

آنکھوں ان ہی کا فعل و اثر دیکھتا رہتا ہے، اسلام کی توحیدی دعوت کا اس کے بالکل برعکس مطالبہ ہے کہ جو تم دیکھتے ہو وہ سراسر باطل و غلط ہے اور صحیح و حق وہ ہے جو تم نہیں دیکھتے، یعنی سرادنی و اعلیٰ مخلوق بذات خود بالکل بے بس بے اختیار ہے، ہر مخلوق کے فعل و اثر یا نفع و ضرر کا بھی واقعی خالق و فاعل وہی ذات و ارادہ ہے جو خود اس مخلوق کا کوئی شے بھی اپنے فعل و اثر میں بذات خود علت ہرگز نہیں محض اس کے ظہور کا محل یا ظاہری و انتظامی واسطہ و علامت ہے اس کی ایک بہت اچھی مثال و نظیر خود عالم شہادت بلکہ خود ہماری ذات میں موجود ہے، تم اپنے ہاتھ سے کسی فقیر و سائل کو جب کچھ دیتے ہو تو دیکھتا تو وہ تمہارے ظاہر جسم یا ہاتھ کو ہے لیکن جائنا یہ ہے کہ دراصل دینے والے تم یا تمہارا ارادہ ہے جس نے اس ہاتھ کو حرکت دی اور جس کو براہ راست آنکھوں سے وہ قطعاً نہیں دیکھ رہا ہے اگر یہ ارادہ جیب تک ہاتھ نہ لیجائے اور اس میں سے روپیہ پیسہ نکال کر فقیر تک ہاتھ کی حرکت کے ذریعہ پہنچانے کا ارادہ نہ ہو تو ہاتھ جیب اور پیسہ روپیہ کے سارے دکھائی دینے والے وسائل و اسباب موجود ہونے پر بھی کیا ایک پیسہ بھی فقیر یا جاہتمند تک پہنچ سکتا ہے، بس تمہارے دکھائی دینے والے ہاتھ کی محکومی کا جو تعلق تمہارے نہ دکھائی دینے یا چھپے ہوئے غیبی ارادہ سے ہے جو وہی مطالبہ اسلامی توحید الہ کا ہے، کائنات کے سارے ظاہری واسطوں کو محض ظاہری اور محض انتظامی واسطہ جانو اور حقیقی فاعل یا نافع و مضار صرف اللہ تعالیٰ کے فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ اور يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ کے ارادہ و مشیت کو جانو۔

لا الہ الا اللہ واصل عہد و اقرار ہے اسی حقیقت کا کہ زمین و  
 ذہنی و خارجی اثر! آسمان کے یہ سارے انتظامی وسائل و اسباب انسان کی خدمت

علائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ یہ کہ انہیں کو اٹے آقا و مخدوم معبود و مقصود بنا کر  
 ان کی بندگی اور ان کے آگے سرفکندی میں لگ جائے، بندگ اور سرفکندی، طاعت  
 فرماں برداری، یا عبادت و عبادت اسی ایک اور صرف ایک ذات الا اللہ کا حق  
 ہے جو خود ہماری اور زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کی ذات و صفات افعال و آثار  
 کی بلا شرکت غیرے بالذات خالق و مالک ہے۔

اس توحید الہیہ کا لازمہ ہے کہ آدمی کا ذہنی و خارجی فکری و عملی رویہ انفرادی  
 و اجتماعی، معاشی و سیاسی زندگی کے ہر شعبہ و زاویہ، کلیہ و جزئیہ میں یکسر منقلب  
 اور مخلوق سے ہٹ اور کٹ کر بالکل خالق سے مربوط و وابستہ ہو جائے، موت زندگی  
 بیماری و تندرستی، رزق و روزی، رنج و راحت، عزت و ذلت، فقر و غنا، ملک و  
 مال، کسی چھوٹے بڑے معاملہ، کسی چھوٹے بڑے ضرر، منع و عطا کا مالک مختار پارینے  
 لینے بنانے بگاڑنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، لا معطی لہا منعت و لا مانع  
 لہا اعطیت۔

اس اقرار کی قوت | شجر و حجر، دریا و پہاڑ، آگ اور پانی، چاند اور سورج، زمین سے لیکر  
 آسمان تک کوئی جاندار بے جان چھوٹی بڑی مخلوق ہے جس کے فعل و اثر میں آدمی  
 اپنے لئے فائدہ و نقصان، نفع و ضرر کا کوئی نہ کوئی پہلو خود اپنے حواس سے علامتہ

محسوس و مشاہدہ نہیں کرتا رہتا اس لئے "لا الہ الا اللہ" کی توحیدی دعوت خالی کوئی لفظی منتر نہیں بلکہ دن رات کی گویا فہمی یا حواسی شہادت کی یکسر تکذیب کے فکری و عملی انقلابِ عظیم کا مطالبہ ہے جس کا قدرتی و لازمی نتیجہ یہ ہوتا چاہئے کہ امید و بیم خوف و ہراس کا ہر قلبی و قلبی تعلق ہر فحواہق سے کٹ کر ہر ذات و صفت ہر فعل و اثر کے ایک اور صرف ایک خالق (اللہ خالق کل شیء) سے جڑ جائے یہی توحید لا الہ الا اللہ کی بنیاد ہے۔

موجودہ پر پائے پیزی ندرش  
چہ شمشیر بندی ہی برسش  
امید و ہراسش نہ باشد ز کس  
ہمیں است پیاد توحید و بس

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے واقعات میں جو ہم یہ سنتے پڑھتے ہیں کہ نہ ان پر بڑے بڑے شاہوں اور شہنشاہوں کے جاہ و جلال کا رعب پڑتا تھا، نہ غنیم کی کثرت تعداد اور اسلحہ و آلات کی برتری سے ان کو ہراس ہوتا تھا نہ وہ دریا اور پہاڑ کے موانع کو خاطر میں لاتے تھے تو کیا ان کی یہ جرئت و بے باکی وقت کی بڑی بڑی فوجی و مادی طاقتوں کے مقابلہ میں توحید الہ کی ایمانی و روحانی طاقت کے سوا کسی اور چیز کا کرشمہ تھی انہوں نے لا الہ کا اقرار کر کے صرف خانہ کعبہ کا نہیں اس سے پہلے خانہ دل یا ذہن و دماغ کے گہرے خوف و رجا، ہوا و ہوس کے سارے "غیر الہی" بتوں کو ایک ایک کر کے نکال باہر کیا تھا اور لا الہ کے ایمان و اذعان کو ظاہر و باطن کے پورے وجود میں رجا، اللہ کے سوا کسی غیر کے ہاتھ میں کسی حقیر سے حقیر نفع و ضرر کو جان

اور دیکھ کر نہ استعانت و سوال کا ہاتھ اٹھاتا تھا تھنا تھنا بندگی و عبادت کا سر جھکتا تھا۔  
 کیسا کڑا ایمان و امتحان کہ ایک طرف ظاہری و ظنی تدریس و اسباب کو  
 اختیار کرنے کا بھی امر و اجازت کہ ان کو غیبت اور بے حکمت نہیں پیدا کیا گیا، دوسری  
 طرف اگلا اللہ کا مطالبہ یہ کہ نظر اسباب پر نہیں بسبب الاسباب پر ہو اور دل کا عقلی  
 و مستقل تعلق غیر اللہ سے نہیں، فقط ایک اللہ سے ہو، دل بیاں دست بکار، اب ہمارا  
 عام حال بالکل برعکس، نظر تمام تر اسباب پر، دل دن رات اکٹھا ہوا خالی تدریس اللہ  
 کا نام محض زبان پر اور بہتوں کے وہ بھی نہیں اور بہتوں کا یہ حال کہ گویا

”وہ ایمان کے بالکل کنارے کھڑے رہ کر اس طرح خدا کی پرستش و عبادت کرتے  
 ہیں کہ اگر کوئی ذبیحہ بھلائی یا نفع پہنچا تو اسی (ایمان پر) دل ٹھہرایا مطمئن رہا اور اگر  
 کوئی آزمائش پڑ گئی تو اٹے منہ پھر گئے (جس کی بدولت) دنیا و آخرت دونوں ہی کا  
 خسارہ ہی خسارہ رہا یہی کھلا ہوا خسارہ ہے کہ اب گھبرا کر اور اللہ کو چھوڑ کر ایسوں  
 کو پکارنے (یا عملاً معبود بنانے) لگ جاتا ہے چونکہ کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔  
 یہی تو انتہائی گمراہی کی بات ہے۔“ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ  
 فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَى وَجْهِهِ  
 خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَلِكَ هُوَ الْخَسِرَانُ السَّيِّئِينَ ۝ يَدْعُوا مِنْ  
 دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَمَا لَا يَضُرُّهُمْ ۚ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ۝

(الحج ۲)



ہمارے اہل علم و زہد بھی توحید کے علاوہ جاہلوں بدعتیوں کا ذکر نہیں جو پیر پستی قبر پرستی وغیرہ  
معاملہ میں عملاً کمزور ہی ہیں کے کھلے کھلے بت پرستانہ مشرکانہ حرکات و خرافات میں گرفتار

ہیں، ان کو بھی چھوڑیے جو نماز روزہ تک کا بھول کر نام نہیں لیتے، ہم میں سے اچھے اچھے  
اہل علم صوم و صلوٰۃ ہی کے پابند نہیں، تہجد و اشراق اور اوراد و وظائف تک میں جن کے  
فرق نہیں آتا، وہ بھی مسجد و مصلیٰ سے باہر زندگی کے ہنگاموں اور جھیلوں میں اپنے  
دلوں کو ذرا ٹٹول کر دیکھیں کہ دنیوی کاروبار مالی و معاشی معاملات میں جو کمزوریاں  
دانتہ و علانیہ ہم سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں کیا اس کا منشا توحید اللہ کی اس کمزوری  
کے سوا کوئی دوسری چیز ہوتی ہے کہ ”دست بکار“ کے وقت ”دل بیار“ بہت کم کسی  
کارنتا ہے۔ کہاں ربانی ایمان والوں کی یہ شان کہ عین میدان کارزار اور ان کے  
گھمسان میں بھی ان کے اندر کوئی کمزوری و بزدلی راہ نہیں پاسکتی (وَمَا ضَعُفُوا  
وَمَا اسْتَكَانُوا) چہ جائیکہ عام دنیوی معاشی کاروبار یا تجارت وغیرہ کے ہنگاموں اور  
جھیالوں میں ”دل بیار“ کے بجائے۔ تَلْهِيمُهُمْ تِجَارَةً وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ  
(۲۲) یاد دیا سے ایسی بے توجہی اور لاپرواہی ہو کہ وہ یار کی ناراضی و نافرمانی کو جان  
بوجھ کر بھرے بازار میں خریدتے ہوں۔

ہا! ہمارا روزہ نماز بھی کیسا بے جان ہو کر رہ گیا ہے کہ نہ روزہ سے روزمرہ کے  
معاملات میں تقویٰ پر سہرا گاری کی زندگی پیدا ہوتی ہے اور نہ نماز فواحش و منکرات  
رَتَّحْنِي عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ سے باز رکھتی ہے۔ باز توجب رکھے کہ وہ صحیح معنی میں

اللہ کی ایسی بڑی پادشہی (وَلَدِنِ كَرَّمَ اللهُ الْكِبْرَىٰ) جو زندگی کے ہنگاموں میں بھی قدم قدم پر اس کی رضا کی جویاں اور اس کی ارضی سے ترساں رکھے، نہ کہ مالی و جاہی نفع و ضرر کے ذرا ذرا سے مواقع و خطرات پر ہمارے دل دھڑکنے اور قدم پھسلنے رہیں، کہا کرتے ہیں کہ پورے اسلام اور اس کی پوری کتاب قرآن کا پورا جامع و مانع ایسا اعجازی خلاصہ جو کہ کلام الہی ہونے کے سوا اور کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، وہ سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور ان سات آیتوں کا بھی جان و جوہر درمیانی آیت (لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ اِنَّا نَعْبُدُكَ وَنَسْتَعِينُ) ہے، باقی سیاق و سباق سب اسی کی تمہید و تتمہ ہے اور اس ایک آیت کا مطلب عبادت و استعانت کے توحیدی انحصار و اقرار یا وہی توحید الہی کے سوا اور کیا ہے کہ ہم ہر طرح کے نفع و ضرر کو بالکل تیرے ہی قبضہ و اقتدار میں جان کر صرف تیرے ہی آگے بندگی و عبادت کا سر جھکاتے اور سوال و درد کا ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ نماز نماز نہیں (لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ) جب تک اس توحید کا دن میں ایک آدھ پارہ نہیں بیسیوں بار اقرار نہ کیا جائے۔ کیا یہ اقرار و تکرار صبح اٹھنے سے لیکر رات کے سونے تک جو ہم پر اس طرح فرض ہے کہ ہوش و حواس کے بقا کے ساتھ زندگی کے آخری لمحہ تک ایک دن کے لئے ہمت نہیں محض اسی لئے ہے کہ مقررہ اوقات میں بس منتر کی طرح اس کو دہرایا جائے یا یہ بار بار کی تذکیر و یاد دہانی کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کی جاہی و مالی معاشی اور کاروباری مشغولیتوں میں بھی ہم اپنے اس پیہم عہد و اقرار کے تقاضوں کو نفع و ضرر کے تمام موقعوں پر پورا کرتے رہیں؟ اور کیا ایسے لوگوں کی حکایت محض

حکایت اور قصہ گوئی کے لئے پیش کی گئی ہے جن کو بازار یا کاروبار کا انہماک بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتا؟ اور کیا حکایتی تعبیر کے علاوہ صاف صاف حکم و امر بھی سورہ منافقون میں اسی کا نہیں دیا گیا کہ ایمان لانے والوں (دیکھو ایمان لانے کا مطلب و لازمہ یہ ہے کہ تم کو اموال و اولاد وغیرہ کے دنیوی مشاغل خدا کی یاد و اطاعت) سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو بھی ایسی غفلت میں پڑے گا (بالآخر) وہ سب کے سب خسارہ (یا ٹوٹے ہیں) پر کر رہیں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ

اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (سورہ منافقون)

مفسر تھانوی علیہ الرحمہ نے بھی اس آیت کی تفسیر ہی نہیں تفسیری ترجمہ تک میں اموال و اولاد سے پوری زندگی کے دنیوی مشاغل مراد لئے ہیں اور ذکر اللہ یا یاد خدا سے خالی زبانی ذکر و یاد نہیں بلکہ ان دنیوی مشاغل میں خدا کے اوامر و نواہی کی فرمانبرداری یا اطاعت کی تصریح قوسین ہی میں فرمادی ہے۔ مطلب وہی کہ انسان کے دنیا و آخرت دونوں ہی میں زیان و خسران سے بچاؤ کی سب سے مقدم شرط تو ایمان ہی ہے۔

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا) اور ایمان بھی وہ زندہ ایمان جس کا شعور و احساس زندگی کے تمام فکری و عملی جزئی و کلی ظاہری و باطنی انفرادی و اجتماعی معاملات میں اپنے تقاضوں کو پورا کرنا رہا ہے۔

اس ایمان کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے جز توحید اللہ کی ایمانی

حقیقت اور پھر اس کے مقابلہ میں ہمارے اسی ایمان کے نیم جان و بے جان ہونے کی کچھ سرسری کیفیت اور پرندگور ہو چکی اب آگے خسران سے بچانے والے اسی ایمان کے سب سے اہم جزو ایمان بالآخرہ کی حقیقت و کیفیت کا ذرا جائزہ لے دیکھئے!

خدا کا سائنسی | خدا کا ایک تصور تو یہ ہے کہ کائنات اندھے بہرے مادے کی پیداوار اور فلسفیانہ تصور | نہیں اس کی خالق ایک دانا بیتا ذات ہے لیکن اس کا کام بس پیدا کر کے ختم ہو گیا اس کے بعد کائنات اور انسان کے کاروبار سے پیدا کرنے والے کو کوئی سروکار نہیں، نہ تکوینی نہ تشریحی، سارا کارخانہ اپنے طبعی افعال و خواص کے تحت آپ ہی آپ چلتا رہتا ہے خدا کے اس تصور تک عقل و فلسفہ کے ”استدالیوں“ اور وحی و نبوت کے منکروں (DIEST) کا پائے چوپیں بھی گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح بالعموم پہنچ ہی جاتا ہے، سائنس جس کی بنیاد ہی تمام تر مادہ و مادیت پر تھی اس کی نظریں بھی بیسویں صدی تک آتے آتے خود مادہ ہی اتنا غیر مادی ہو چکا ہے کہ اب مشاہیر سائنس کو بھی یہی ماننا پڑتا جا رہا ہے کہ کائنات کا سرچشمہ بے ذہن و بے شعور مادہ نہیں بلکہ شعور و ادراک والی کوئی ذہنی ذات (MIND) ہے۔

اس تصور کے نقائص | لیکن خدا کا یہ فلسفیانہ یا سائنسی تصور حقیقت میں ذات بلا صفت کا تصور ہے یعنی نہ ہم کو یہ معلوم کہ اس ذات خالق کی، علاوہ خالق ہونے کے اور کیا صفات ہیں، یا جب کائنات کو اس نے جان بوجھ کر علم و ارادہ سے پیدا کیا ہے تو آخر اس سے اس کی معلوم متعین مراد کیا ہے، بے ذہن و بے شعور مادہ کو مبداء الخلق مان لینے

میں اور جو بھی اشکالات ہوں لیکن یہ سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا کہ پیدا کرنے والے کا مقصد کیا ہے۔

ایک اور نیم عقلی اور دوسرا نیم عقلی و نیم مذہبی تصور یہ ہے کہ نہیں خدا خالق ہونے کے علاوہ نیم مذہبی تصور علم و قدرت ارادہ و مشیت وغیرہ دوسرے صفات و کمالات سے بھی منصف ہے اور کائنات و انسان کو اس نے جانے بوجھے یا معلوم و مخصوص مقصد و مدعا کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اپنی قدرت و مشیت ہی سے اس نے مخلوقات کو ایسے طبعی خواص و قوی عطا کر دیئے ہیں کہ اب اس کو بالذات و براہ راست مداخلت و نگرانی کی ضرورت نہیں، اسی طرح انسان کو عقل و اختیار عطا کر کے آزاد کر دیا ہے کہ اپنے اختیار تمیزی سے کام لیکر اپنے معاملات کو معقول و مناسب تدابیر سے جس طرح چاہے چلاتا رہے بلکہ اسی عقل و فکر یا بعض اور کشف و غیرہ کے روحانی و باطنی فطری و خلقی قوتوں ہی سے کام لیکر خود خدا کی ذات و صفات کی معرفت اور نیکی و بدی کا علم بھی وحی نبوت کے واسطے کے بغیر ہی انسان حاصل کر سکتا ہے۔

مشکانہ تصور | اسی سے ملتا جلتا تیسرا مشرکانہ تصور ہے جس میں بجائے طبعی خواص و قوی کے یا ان کے ساتھ ساتھ خود خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے ایسے نیم خدا درمیانی کارندے اور ایجنٹ لاعدادی دیوتا یا الہان لئے گئے ہیں جو خالق و مخلوق کے باہم موثر و سائل و سائل کا کام دیتے ہیں اور انسان نے اعتقاداً یا عملاً خدا سے ٹوٹ کر اپنے نفع و ضرر کا سارا رابطہ و رشتہ انھیں نیم خداؤں سے جوڑ لیا اور لازماً انھیں کی پوجا پاٹ یا عبادت و پرستش میں لگ گیا۔

## خدا کا کامل و جامع تصور

خالقیت، ربوبیت اور اغرض یہ اور اسی طرح کے جتنے بھی خدا کے تصورات عقل یا وہم نے  
قیومیت کی ایک جہتی! اگر ٹھہر رکھے ہیں لا الہ الا اللہ کی اس کامل اسلامی توحید کے سب ہی

متافی ہیں جس میں زمین و آسمان کی ہرادی و روحانی جان دارو بے جان مخلوق کے  
اللہ بالفاظ دیگر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نفع یا ضرر یا فعل و اثر کے مالک ہونے کی یک قلم  
نفی فرما کر اولا اللہ سے اس کا اثبات بالکلیہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے فرمادیا گیا جس  
کی رو سے کائنات اور انسان اپنے وجود اور پیدائش ہی میں نہیں بلکہ اپنے بقا و قیام کے  
ہر ہر کام میں اپنے خالق ہی نہیں اپنے رب و قیوم خدا کا ہر ہر آن دست نگر و محتاج  
ہے یہی وہ مختصر توحید اللہ ہے جس کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے اور جس پر ایمان و عمل  
ہر غیر اللہ کے آستانے سے اس کی امید و بیم بندگی و نیاز مندی کا سراٹھا کر ایک اور صفت  
ایک درکار درپوزہ گریا بھکاری بنا دیتی ہے۔

علم و حکمت کاملہ | اس کے بعد انسان کے لئے سب سے بڑھ کر سوچنے والی بات یہ ہے کہ  
اس کی اور کائنات کی پیدا کرنے والی یہ کامل الصفات علیم و حکیم ذات عبت کا بہر حال  
نہیں تصور کی جاسکتی نہ اس نے زمین و آسمان کی ان گنت گونا گوں موجودات اور  
انسان جیسی ذہنی کمالات والی ذات کو بیکار و بے نتیجہ پیدا فرمایا ہوگا نہ ایک مرتبہ کو رو  
کر بادہ کے بجائے کسی علم و ارادہ والی ذات کو خالق عالم تسلیم کر لینے کی منطق میں یہ بات

کس طرح سما سکتی ہے کہ علم و ارادہ سے وجود میں آنے والی کسی حقیر سے حقیر چیز کی بھی کوئی متعین و معلوم مراد نہ ہو، پاگلوں کے سوا کسی معمولی عقل والے انسان سے بھی بے معنی فضول کاری کو عقل جائز نہیں رکھتی، چہ جائیکہ جس کی قدرت و حکمت علم و ارادہ نے اتنی عظیم الشان کائنات اور ایسی عجیب و غریب صفات و کمالات والے انسان کو پیدا فرمایا اس نے اس کائنات کے اس عظیم الشان کارخانے کو فضول و عبث یا ہوا و لعب کے طور پر پرہیز کر رکھا ہو۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا  
بَيْنَهُمَا لِعَيْنٍ - (۲۱)

ہم نے زمین و آسمان کو کھیل کود کے طور پر  
نہیں پیدا کیا ہے۔

زمین و آسمان اور خود اپنی پیدائش پر غور کرنے والا انسان بے ساختہ پکارا اٹھتا ہے  
کہ نہیں

ہمارے پروردگار تو نے یہ سب باطل و بیکار سرگزشتیں پیدا فرمائی ہیں (تیری پروردگاری یا ربوبیت کے یہ کیسے شایان شان ہوگا کہ کوئی چیز بھی ہبل پیدا فرمائے) سو ہم کو بچا کہ (اے احمقانہ خیال میں پڑ کر ہم) جہنم کی سزا کے سزاوار ہو جائیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ - (۳۱)

اور ایسے ہی احمقوں کو دوسری جگہ متنبہ فرمایا:-

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی ہبل و فضول پیدا کر دیا ہے جس میں کوئی حکمت نہیں اور ہمارے پاس تم کو لوٹ کر آنا نہیں سو (خوب جان لو) کہ بادشاہ

حق و حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی ذات اس سے اعلیٰ و ارفع ہے (کہ کوئی لایعنی یا بے حکمت کام کرے)

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ فَتَعَلَىٰ

اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ - (۲۴/۱۱۵)

کائنات کا ماضی و مستقبل دونوں | جس طرح ماضی کی طرف کائنات و انسان کی ابتدائی ایجاد

حکمت و مشیت الہی کے ماتحت ہیں | و تخلیق ایک سرِ ایا علم و حکمت ارادہ و مشیت کے تحت

ہوئی ہے اسی طرح ضرور ہے کہ مستقبل کی طرف بھی اسی حکیمانہ علم و ارادہ ہی کے موافق

اس ایجاد و آفرینش کی کوئی انتہائی حکیمانہ غرض و غایت بھی ہو اور انسان کو کائنات میں

تصرف کی جو قوت و اختیار عطا کیا گیا ہے اس کا مقصد آفرینش کے نقطہ نظر سے جاویدجا

استعمال کرتے ہوئے عطا کئے والے کی طرف سے باز پرس یا حساب و کتاب بھی ہو اور اس

حساب و کتاب کے موافق جزا و سزا کا کوئی انجام بھی انسان و انسانیت کے اسی انجام کار

کو کتاب اسلام میں یوم دین (برابہ کا دن) یوم الفصل یوم آخرت وغیرہ کی مختلف حیثیات

و عنوانات سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس یوم دین کو ملائے بئیرہ خدا کی ذات و صفات ہی کا تصور صحیح و کامل رہتا ہے

نہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانے کی موجودات اور اس کے اندر انسان کے وجود

ہی کے کوئی معنی نکلتے ہیں، نہ خالق و مخلوق میں کوئی تعلق پیدا ہوتا ہے اور نہ دنیا پرستی

کے مقابلہ میں خدا پرستی یا دینداری کی کوئی زندگی روتا ہو سکتی ہے اگر خدا اپنی جگہ پر ہے بھی

اور اس دنیا اور ہم کو پیدا بھی اسی نے کیا ہے لیکن نہ دنیا کی اس زندگی کے دوران میں



خدا کی مرضی و مشیت کو ہمارے کاروبار میں کوئی دخل ہے اور نہ مستقبل میں ہماری اس زندگی کا کوئی مال کاریا انجام و آخرت ہے اور سب سے اول و آخر یہ کہ نہ اس انجام و آخرت کے نیک و بد ہونے کے لئے ہم کو موجودہ زندگی میں نیک و بد افکار و عقائد افعال و اعمال کا خدا کی طرف سے کوئی محفوظ و مستند دستور نظام دیا گیا ہے (جس کا نام ایمان بالرسالت ہے) نہ خدا کی طرف سے اس نظام و دستور کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی مطالبہ ہے اور نہ اس مطالبہ کی بنا پر آئندہ کوئی مواخذہ، تو ظاہر ہے کہ ایسے بڑے خالق خدا سے دنیا کی زندگی و معاملات میں کوئی خدا پرستانہ تعلق یا وابستگی رکھنے کا کوئی محرک و مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے زیادہ سے زیادہ خود اپنے ذہن و دماغ کی مخلوق ایسے خالق خدا کے فلسفیانہ تصور سے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے پس کچھ فلسفیانہ یا ذہنی و دماغی لذت عیاشی کا کام لے سکتے ہیں جو آرام کرسی سے اٹھنے اور عملی زندگی میں داخل ہوتے ہی کا فورہ ہو جاتی ہے۔

عاقبت اندیشی انسانی | آدمی طبعاً و عقلاً عاقبت اندیش واقع ہوا ہے وہ اپنی زندگی کے عقل و طبیعت کا لازمہ ہے | آج سے زیادہ کل میں اور حاضر کے واقعات سے زیادہ مستقبل کی امیدوں اور تمناؤں میں گزارتا ہے، حال سے زیادہ اس کی نظر مال پر رہتی ہے، دیر پا و دور رس حقیقی نفع و ضرر سے جاہل و غافل ہوتا یا وقتی جذبات سے مغلوب ہو جاتا اور بات ہے ورنہ انسان کی عقلی قہرات ہمیشہ عاجل یا گریز پارنہج و راحت نفع و ضرر کا آجل یا دیر یا سے مقابلہ و موازنہ کر ہی کے عملی زندگی کا کوئی قدم اٹھاتی ہے، یہ خرد مندی نہیں محض

شاعری ہے کہ ”نقد راہِ نسیہ گزاشتن کار خرد منداں نیست“ جس کا جی چاہے اپنے آج یا حاضر کے اعمال و مشاغل کا جائزہ لے کر دیکھ لے کہ وہ کتنے اس اجتماعی مستقبل یا کل کے نسیہ کے لئے ہوتے ہیں جس کے آنے تک خود ہمارا رہنا بھی یقینی نہیں ہوتا اور کتنے آج کے ”نقد“ کے لئے ہوتے ہیں جس میں ہم بہت زیادہ پریشانیاں کل ہی کی فکر کے لئے اٹھاتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کے ذہنی ہی کھاتے میں نقد سے زیادہ نسیہ یا ادھار ہی کا حساب کتاب ملے گا۔

اسی لئے دینِ فطرت میں ”آج“ سے زیادہ | تو بھر سوچنے کی بات ہے کہ اس پوری دنیوی ”کل“ کے ایقان کا مطالبہ ہے | زندگی کے آج کے مقابل میں جس باخروی زندگی

یا کل پر اسلام کا دعویٰ کرنے والوں سے کتاب اسلام کی ابتدا ہی میں ایمان ہی نہیں ایقان کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ ”وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ“ اس کا اگر اہتمام بھی کسی معتدبہ درجہ میں ہمارے اندر زندہ و تازہ رہے تو اس خدا سے ہمارے تعلق کا کیا عالم ہوگا جس کی اس دنیا کے نفع و ضرر میں مالکانہ کار فرمائی کے درمیان تو کچھ نہ کچھ ظاہری درمیانی حجابات حائل بھی ہیں لیکن آخرت کا جو دن آئے والا ہے اس میں تو یہ سارے درمیانی حجابات ایک ایک اٹھ کر اس سوال کا کہ ”آج“ کھلی آنکھوں کے سامنے ملک مالکیت کا بلا شرکتِ غیرے پورا کا پورا اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ) کا ہر مومن و منکر کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوگا کہ ابتوا ایک اور صرف خدائے قادر و غالب ہی کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہے (لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ)

”وَيَاٰخِرَةَ هُمْ يُوقِنُوْنَ“ والے کامل ایقان واذعان کو جانے دیجئے معتد بہ احتمال صورت ہی میں اس ”لَمِنَ الْمَلِكِ الْيَوْمِ“ والے دیر پا ہی نہیں ابدی دن کے نفع و ضرر بناؤ بگاڑ کو بد نظر رکھے بغیر دنیوی زندگی کے کسی انفرادی و اجتماعی شعبہ کا کوئی قدم اٹھانا بھی دانشمندانہ یا آسان ہوگا؟ معتد بہ یا قوی احتمال بھی الگ رہا کسی شدید خطرہ کے خفیہ سے خفیہ اندیشہ کو بھی کون دانشمند خوشی خوشی خریدنے کو تیار ہوگا۔ مفرد و بھڑبھڑنے ہی کی کوشش کرے گا۔

اب ہم مسلمان جن کی خصوصیت یومِ آخرت پر ایمان ہی نہیں ”ایقان“ قرار دی گئی ہے ذرا اپنی اپنی زندگیوں اور مصروفیتوں کو سٹول اور کرید کر خود ہی دیکھ لیں کہ ان کی تہ میں آخرت کی نجات و خسران عذاب، و ثواب اتنا بھی کتنوں کے اندر زندہ و بیدار ہے جو ہمارے روزانہ صبح و شام اور رات تک کے مشاغل پر کچھ بھی اثر انداز ہو۔ ہاں اگر نثر صریح انکار نہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک بھولا ہوا اقرار ہے جو کسی وقت وقتی طور پر یاد آ کر یا یاد دلایا جا کر بھی مشکل ہی سے عمل پر کوئی نمایاں اثر ڈالتا ہے۔

سو خوب یاد رکھنا چاہئے کہ توحید الہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر جیسا کہ خود ”يَاٰخِرَةَ هُمْ يُوقِنُوْنَ“ سے ظاہر ہے جب تک آخرت پر ہمارے یقین کو یا کم از کم کسی موثر درجہ تک قوی احتمال کو از سر نو بیدار نہ کیا جائے گا محض عدم انکار یا بھولا ہوا خفتہ اقرار عملی زندگی کے حق میں بے اثر و بیکار ہی رہے گا۔ زندگی کے عملی میدان میں سویا ہوا ایمان، اسی طرح کوئی حصہ نہیں لے سکتا جس طرح

سویا ہوا انسان۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ انسانی زندگی کو حرکت و عمل میں لانے والے دوسری بڑے محرک ہیں (۱) ایک طلبِ راحت و منفعت اور دفعِ اذیت و مضرت۔ (۲) دوسرے اعلیٰ و دیرپا راحت و منفعت کی ادنیٰ و گریز یا پرتنجیح اور چھوٹی یا عارضی مضرت و اذیت کو بڑی اور مستقل کے مقابلہ میں گوارا کر لینا۔ دین ہی نہیں دنیا میں بھی آدمی جتنی بے عنوانیاں کرتا ہے سب کا منشا بھی دو باتیں ہوتی ہیں ایک طرف ظاہری اسباب و تدابیر کو وہ بالذات نفع کے حصول اور ضرر کے دفع کرنے میں دخیل و مؤثر یقین کرتا ہے، دوسری طرف چھوٹے نفع و ضرر کے مقابلے میں بڑے نفع و ضرر پر نظر نہیں ہوتی غیر مسلموں میں تو ان دونوں کا منشا ہرے سے خدا و آخرت کا انکار یا کفر و شرک یقینی دونوں کے متعلق صحیح تصور و ایمان کا فقدان ہے اور مسلمانوں میں اس کا سبب توحید الہ اور یومِ آخرت پر ایمان و یقین کی کمزوری وہ بھی اس انتہا کی کمزوری کہ عملاً فقدان کے برابر یعنی عملی زندگی میں نماز روزہ والے مسلمانوں کا بھی ظاہری تدابیر و اسباب ہی پر اتنا بھروسہ کہ مسبب الاسباب تک بھول کر کسی کی نظر کسی معاملہ میں جاتی یا دنیا کے نفع و ضرر کے مقابلہ میں آخرت کے بناؤ بگاڑ پر پڑتی ہوگی، حالانکہ ایمان کی جان ایمان بالغیب کا مطلب ہی ہے کہ جو تم کو جسم کی ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا رسول کو سچا جان کر ایمان کی آنکھوں سے وہی دیکھنے لگو۔



مسلمانوں میں دینی انقلاب پیدا کرنے کے لیے ایمان بانڈ سے بھی زیادہ ایقانِ آخرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ایمانیات کا تعلق ہے

مسلمانوں میں اسلامی زندگی کا کوئی نمایاں اور اجتماعی انقلاب رونما ہونے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ ایمان

بانڈ (توحید الہ) اور ایمان بالآخرت دونوں کو خصوصاً اور دوسرے کو پہلے سے بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ جگایا اور جمجمہ وڑا جائے، کوئی تو بات ہے کہ ایمانیات کی فہرست میں ایقان کا مطالبہ صاف طور سے شروع ہی میں آخرت کی نسبت فرمایا گیا، تب جا کر ربانی ہدایت یابی اور فلاح پانے کا یقین دلایا گیا "أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" اور پھر آخر تک اسلام کی پوری کتاب میں شاید ہی کسی ایک مضمون پر آخرت اور احوالِ آخرت سے زیادہ آیات ملتی ہوں، یہاں تک کہ آخر قرآن میں تو سورتیں کی سورتیں اسی موضوع سے شروع اور اسی پر ختم ہونے لگتی ہیں اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ دین کی نظر میں دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا انفرادی و اجتماعی معاشی و سیاسی تمدنی و ثقافتی نفع و ضرر یومِ دین یا آخرت کے بناؤ بگاڑ کے سود و زیاں فلاح و خسران کے مقابلہ میں نہ فلاح فلاح ہے نہ خسران خسران بس

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ

مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ

الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ - (۱۰۰)

ثابت ہوا وہی پورا خاسر و زیاں کار ہے۔

سورہ زمر میں حضور کو حکم و ارشاد ہے کہ جلا کر

قَدْ إِنَّ الْخَيْرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا  
 أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
 الْكَذَّالِكَ هُوَ الْخَسِرَانُ الْمُبِينُ

خسارہ میں ڈالا یہی تو کھلا ہوا زیان و خسراں ہے (۳۹/۱۵)

اور یہی سورہ شوریٰ میں ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر:-

وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخَيْرِينَ  
 الَّذِينَ خَسِرُوا وَأَهْلِيَهُمْ  
 يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا الظَّالِمِينَ

کہ اب ان ظالموں کو ہمیشہ اسی عذاب میں گرفتار رہتا ہے  
 فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ (۲۲/۲۵)

بات وہی ہے کہ آخرت کی ابہری زندگی کے سامنے دنیا کی چند روزہ زندگی کی بساط ہی  
 کیا ہے، چند دن بھی کیا، حشر کے دن لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ ایک دن کی بھی گویا ایک  
 گھڑی سے زیادہ دنیا میں ٹھہرنا نہیں ہوا تھا ہاں ہم ایک دوسرے کو پہچان کر کہیں گے کہ  
 واقعی خسارہ میں تو وہی لوگ رہے (جنہوں نے آج حشر کے دن) خدا کا سامنا ہونے کو  
 جھٹلایا تھا اور اس دن کی فلاح کے لئے خدائی یا ایمانی ہدایت کو قبول نہ کیا تھا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَأَنَّهُمْ مُّكْتَدِبِينَ - (۲۵/۲۵)

اور بھی قرآن مجید میں خسران کا جہاں جہاں ذکر ہے اس کا تعلق زیادہ تر آخرت ہی کے زبیاں و خسران سے ہے، مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم کو ضرور جمع کر کے رہے گا اس میں کوئی شک نہیں پس (اصلی) خسارہ میں اپنی جانوں کو انھوں نے ڈال رکھا ہے جو (اس دن پر) ایمان نہیں لائے۔

لِيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ - (۱۱)

اسی طرح آگے ہی ہے کہ بیشک (سخت) خسارہ میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کا سامنا ہونے کی تکذیب کی، یہاں تک کہ جب دفعۃً قیامت کا وقت پہنچا تو کہنے لگیں گے ہائے ہماری اس کوتاہی پر جو اس وقت کے معاملہ میں ہم نے کی۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِإِيقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ السَّاعَةُ

بَعَثَتْ قَالُوا لِيَحْسَرَ تَنَا عَلَىٰ مَا قَرَرْنَا فِيهَا - (۱۲)

یٰٓتُو وَالْعَصْرَانَ الْاِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ کے اس انسانی خسران یا زبیاں کی کچھ تفصیل و تفہیم تھی جو توحید الذرا اور یوم آخرت کے کفر و انکار یا ایمانی خامیوں کمزوریوں اور شرکانہ آلائشوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس سے بچنے والے توحید و آخرت پر خصوصیت سے سچا کھرا ایمان رکھنے والے ہی ہو سکتے ہیں، اِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا۔

# ایمان اور عمل صالح

(رَاٰلَآءِ الدِّیْنِ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ)

ایمان اور عمل صالح میں صرف ایمان کے بعد ہی بلکہ اسی کے ساتھ ہی دوسرا درجہ ایک حرفِ عطف کا فرق ہے۔ اعمالِ صالحہ کا ہے اور معنایہ بعدیت یا ثانویت اتنی ہی سمجھنا چاہئے جتنی لفظاً خود اللہ تعالیٰ نے "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ" کے درمیان صرف ایک حرفِ عطف کی رکھی ہے، ورنہ مطلوب و نامور دراصل دونوں کی معیت ہی ہے، اور صحیح اسلامی زندگی تو بہر حال ان دونوں پہیوں کو ساتھ ساتھ چلانے بغیر کسی طرح چل ہی نہیں سکتی خواہ لگے بانسکل کے دو پہیوں کی طرح آگے پیچھے ہی ہوں اور مسلمان جہاں کتاب و سنت کی صراطِ مستقیم یا میزانِ اعتدال سے ہٹ کر ایمانی مرجعیت یا "عملی خارجیت" کی افراط و تفریط میں جا پڑا کہ اسلامی زندگی کا توازن بگڑا۔

کوئی نظریہ دعوت اپنے عملی ظہور و اس طرح دنیا کے ہر عمل کی قدر و قیمت اس نظر و نظریہ طاقت کے بغیر موثر نہیں ہو سکتا یا آئیڈیالوجی کے تابع ہوتی ہے جس پر وہ مبنی ہو، اسی طرح دین بھی ان اعمال کی کوئی قیمت نہیں لگاتا جن کی بنیاد صحیح ایمان و عقیدہ پر نہ ہو، ساتھ ہی جس طرح دنیا کا کوئی اصول و نظریہ دعوت و دعویٰ عمل میں لائے اور آئے بغیر کوئی محسوس و موثر حقیقت نہیں بنتا، اسی طرح دین کا کوئی



ایمان و عقیدہ بھی اپنے عملی ظہور و طاقت کے بغیر نہ دنیوی زندگی کے حقائق و واقعات میں جگہ پاتا ہے نہ اخروی زندگی کی کامل نجات و فلاح کی ضمانت دیتا ہے، دین دنیا دونوں کی پوری پوری برکات و ثمرات کا حصول و ظہور ایمان و عمل صالح دونوں کی پوری پوری ہم آہنگی ہی پر قیام و موافق ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا خَالِدِينَ فِيهَا رِجًا، یہ تو آخرت کی مغفرت و جنت کے ایمان اور عمل صالح دونوں ہی کی جامع زندگی پر دعویٰ کی مثال ہے دنیا میں بھی مرد و عورت جو فرد بشر بھی ایمان و عمل صالح دونوں کی زندگی اختیار کرے (مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ) اس کے لئے بھی کیسا حتمی وعدہ ہے کہ ہم اس کو قطعاً فریدار انفرادی زندگی عطا کر کے رہیں گے (فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً) پھر اجتماعی زندگی میں بھی خصوصاً آج کل سب سے بڑی کامیابی و کامرانی کسی قوم کے سیاسی اقتدار و حکومت کو جانا جاتا ہے، فرودی و فرعونی حکومت کو (خواہ اس کا نام جمہوریت ہو یا اشتراکیت) تو اسلام دنیا کے حق میں بھی سراسر لعنت ہی جانتا ہے اور جو حکومت حاکم و محکوم سب کے لئے رحمت ہی رحمت ہے کہ انسان اپنے کو آمر و حاکم نہیں بلکہ امترا حکم الحاکمین کے احکام و اوامر کا محکوم و مامور بندہ و کار بندہ یا نمایندہ و خلیفہ جانے اس کا قطعی وعدہ بھی بالکل پہلے ایمان و عمل صالح کی توام زندگی اختیار کرنے ہی پر ہے۔

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِي الْأَرْضِ - (۲۴)

ایمان سے عمل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور یہی نہیں کہ اسلام کی دعوت ایمان کے سارے عمل سے ایمان میں قوت آتی ہے! دینی و دنیوی انفرادی و اجتماعی ثمرات و برکات ایمان کے ساتھ اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے ہی پر موعود ہیں، بلکہ ان عملی لوازم سے خالی ایمان بجائے خود بھی بیجان ہی رہتا ہے، جس طرح اگر ہم اپنے کسی عضو کو معطل و بیکار رکھیں تو بالآخر وہ مفلوج و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے، اسی طرح جس ایمان سے کام نہ لیا جائے وہ بھی مضحل و مردہ ہو کر رہ جاتا ہے، دونوں میں جان و تن سے زیادہ کی دوئی و دوری نہیں، بلکہ دونوں ایک ہی حقیقت کے ظاہری و باطنی یا ذہنی و خارجی دورخ ہیں، ظاہر اگر اپنے وجود میں باطن کے تابع ہے تو باطن اپنی نمود میں ظاہر کا محتاج ہے، عمل کا اگر بلا ایمان کے اعتبار نہیں تو ایمان کا بھی بلا عمل کے اتمام نہیں ہوتا، ایمان سے عمل میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو عمل سے ایمان میں قوت آتی ہے دینی زندگی کی توانائی کا کردگی دونوں کی رگر فعل و انفعال یا عمل اور رد عمل ہی سے وجود پاتی ہے۔

حدیثوں میں بھی ایمان و عمل کی اس پیوستگی کی انتہائی اہمیت کو ظاہر کرنے کیلئے عمل کو جا بجا ایمان کا مرادف ہی نہیں عدم عمل کو عدم ایمان تک کا مرادف ٹھہرایا گیا ہے مثلاً جس میں امانت نہیں ایمان بھی نہیں (لا ایمان لمن لا امانت له) مشہور حدیث

جس میں ایمان کے کچھ اوپر شریعتی ٹھہرائے گئے ہیں اس میں اقرار لا الہ الا اللہ کے ایمانی فضل و تقدم کے ساتھ راستہ سے کسی اذیت کی چیز کو ہٹا دینے کے حقیر سے حقیر عمل کو بھی ایمان ہی کا شعبہ ٹھہرایا گیا ہے، پھر تدبر و تحقیق سے اہل علم نے ان شعبوں کے ساتھ اوپر شریعتی تاثر تک کی جو فہرست مرتب کی ہے ظاہر ہے کہ اس میں گئے چنے خالص ایمانیات و عقائد سے بہت زیادہ تعداد اعمال صالحہ ہی کی ہے، جن میں حتی امانت ادا کرنا، قرض ادا کرنا، حاجتمند کو قرض دینا، پڑوسی کے کام آنا، سلام اور تحنیک کا جواب دینا، عیسیٰؑ کا چھوٹی سی چھوٹی عملی نیکیاں و نفع رسائیاں تک شمار کی گئی ہیں۔

ایمان و عمل کے باہمی رابطہ و رشتہ پر محدثین و فقہاء اور متکلمین کی عالمانہ و اصطلاحی بحثوں کو چھوڑتے نفس قرآن و حدیث کے سرسری مطالعہ سے اتنی بات بے تکلف سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام کی طرف سے دراصل مطالبہ ایمان و عمل دونوں کے جمع کرنے ہی کا ہے، البتہ ارجار و اعتزال یا مرجعیت و خارجیت کے نئے پرانے فتنوں سے بچنے بچانے اور عمل کے مقابلے میں ایمان کی بنیادی قدر و قیمت یا افضلیت کو ذہن نشین کرنے کرانے کے لئے بس ایک مثال کافی ہوگی جو مثالوں کے بادشاہ حضرت حکیم الامتؒ اپنی تحریروں میں دیا کرتے ہیں بے عمل ایمان ایسا ہی ہے جیسے لنگڑا، لہجہ، اندھا، بہرا، ابا، بیج آدمی، آدمی کہلایا جاتا ہے، سب جانتے ہیں کہ ایسا آدمی کس درجہ کا آدمی ہوتا ہے، قرون الامان نام جو رسالہ کچھ اوپر ایمان کے ستر شعبوں والی حدیث ہی کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے اس کی چند تہیدی سطروں میں صدیوں کے نزاعی مسئلہ کا کپسا صاف پے لاگ فیصلہ مل جاتا ہے۔

”ان سب شعبوں کو اپنے ہم وطن اسلامی بھائیوں کی آگاہی کے واسطے عام فہم اردو میں لکھتا ہوں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ جس ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں اس کے اس قدر شعبے ہیں اور غور کریں کہ ہم میں کتنی باتیں ہیں اور کتنی نہیں ہیں تاکہ اس سے اپنے ایمان کے نقصان و کمال کا اندازہ کر سکیں اور بدون تکمیل (اپنے ایمان کے) دعوے سے شربائیں، گو اصولِ دین کے مان لینے سے ادنیٰ درجہ کا ایمان سیر آجاتا ہے مگر وہ ایمان ایسا ہی ہے جیسے لنگڑا، لٹجا، اندھا، بہرا، اپاہج آدمی آدمی کہلاتا ہے، سب جانتے ہیں کہ ایسا آدمی کس درجہ کا آدمی ہوتا ہے۔“

بس ایمان و عمل کے تعلق کی عقلی و نقلی بحثوں میں پڑے بغیر کام کی فیصلہ کن بات یہی ہے کہ خالی اسلام کا نام اور لیبیل لگا کر جو ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ دعویٰ کیسا شرمناک اور خود ہمارے ہاتھوں اسلام کی رسوائی کا کیسا سامان ہے تاہم اہل انصاف کو چاہئے یہی کہ اسلام کے متعلق رائے ہم رسوا کن مسلمانوں کے اعمال سے نہیں بلکہ خود اسلام کے اوصافِ کمال سے قائم کریں۔ لہذا

”دوسری غرض ان شعبوں کے بتلانے کی یہ بھی ہے کہ غیر قوموں کو یہ بات معلوم

ہو جائے کہ اسلام کی تعلیم بجائے خود کافی و روانی کامل و نام ہے اور اسلام اسی کو

پورا مسلمان جانتا ہے جس میں یہ سب خصائل خیر و اوصاف کمال ہوں ناقص مسلمانوں

کو دیکھ کر اسلام کی تعلیم کو ناقص بے وقعت نہ سمجھیں کیونکہ اسلام کا کام بتلانا دنیا ہے

نہ ویسا ہی زبردستی کسی کو بنا دینا، یہ قصور ہم لوگوں کا ہے اسلام پر کوئی الزام نہیں۔“

ہماری اصل غفلت یہ ہے کہ ہم دین کے معاملہ میں محض دعویٰ ایمان پر مطمئن ہیں | ادنیٰ غفلت کا روگ ہم مسلمانوں کو سب سے بڑا ہی لگ گیا ہے کہ دنیا کے تو ادنیٰ سے ادنیٰ کاموں اور معاملوں

میں بھی خالی خیالی پلاؤ پکاتے رہنے پر ہم بس نہیں کرتے، چٹنی روٹی کھانے والا بھی اس کا نمک مرچ ٹھیک اور کچی پیکی دیکھ کر ہی کھاتا ہے، حالانکہ نفس بری بھلی زندگی کے لئے بری بھلی چٹنی روٹی بلکہ روکھی سوکھی روٹی بھی کافی ہے لیکن دین کے معاملہ میں ہماری بہت بڑی، شاید ہزاروں نوسوتانوے کی اکثریت محض اسلام کے ٹھپہ یا زبانِ دعویٰ ایمان اور خالی باتوں پر قانع و مطمئن ہو کر رہ گئی ہے جس کی نوعیت بڑی حد تک نری سلیبی (NEGATIVE) ہے یعنی کوئی مسلمان اپنے کو کافر و مشرک یا ہندو سکھ یا عیسائی وغیرہ کہنے کہلانے پر راضی نہ ہوگا اس سلب و نفی سے آگے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی ایجابی و اثباتی تصور ان کے ذہن میں اس سے زیادہ مشکل ہی سے کچھ ہو سکتا ہے کہ مسلمان نام گھر گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں شادی غمی وغیرہ کی کچھ رسمیں عید و بقر عید، شب برات، محرم، میلاد و مجلس وغیرہ کے کچھ تہوار یا تقریبیں غیر مسلموں کی ہولی دیوالی، دہرا، ختم ششمی اور کرسمس وغیرہ سے الگ رکھتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ اس درجہ میں بھی جو خود اپنے کو کہتا سمجھتا بہر حال مسلمان ہی ہے دوسروں کو بھی اس کو کہنا سمجھنا مسلمان ہی پڑے گا، جیسا کہ لنگڑا لولا اندھا بہرہ طرح ناکارہ آدمی سمجھا بہر حال آدمی ہی جاتا ہے، اسی طرح بے عمل سے بے عمل مسلمان بھی رہتا مسلمان ہی ہے کافر نہیں ہو جاتا اور آخرت میں بھی بالآخر اس کے ساتھ

اسلام سے صریح کفر و انکار کرنے والوں کا معاملہ کسی طرح جائز و منصفانہ نہ ہوگا۔ تاہم نہ دنیا میں خالی اس سلبی یا بے عمل ایمان کے زبانی جمع خرچ سے ایجابی و عملی ایمان و اسلام کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ایسے ایمان پر دین اسلام نجات کامل کی ضمانت دیتا ہے، یہ تو قریب قریب صد فی صد عوام و جہلا کے "لنگڑے لنگڑے لنگے اندھے بہرے" معطل و مفلوج ایمان کا حال ہے۔

ہمارے خواص کی حالت بھی | خواص و علماء کی یہ حالت اور بھی حیرت و عبرت کا مجموعہ ہے  
حیرت و عبرت کا مجموعہ ہے کہ انھوں نے ایمانی شعبوں کی فہرست کو زورے عقائد و ایمانیات

سے ایک قدم بڑھ کر عبادات اور ان میں بھی زیادہ تر صرف نماز روزہ کی بدنی عبادت تک محدود کر لیا ہے۔ زکوٰۃ کی مالی عبادت تک کا بہتوں کو اہتمام نہیں اور بعض انتہائی عبرت کی مثالیں تو یہاں تک نظر آئیں کہ "علم" کے زور سے زکوٰۃ و سود تک کی حقیقت ہی ایسی بدل دی کہ نہ ہر سال زکوٰۃ واجب ہو اور نہ وہ سود جس کو ساری دنیا سود ہی جانتی ہو حرام رہے، رہی دوسرے عام مالی حقوق و معاملات میں احتیاط تو اس میں طرح طرح کی کوتاہیاں عام علماء میں بھی قریب قریب عام مسلمانوں ہی کی طرح عام ہیں۔ دینانیت و معاملات کے بعد اخلاق کو لیجئے تو یہ اب ان مکارم اخلاق کے بجائے جن کی تکمیل و اتمام کے لئے حضور نبی الاسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص طور پر بعثت ہی ہوئی تھی (بعثت کا تم مکارم الاخلاق) اخلاق نام رہ گیا ہے کچھ ظاہری تعظیم و تکریم تواضع و تکلف وغیرہ کی رسمی و مصنوعی باتوں کی خوش اخلاقی کا،

ورنہ کذب و فریب، مکر و دغا، حیانت و خود غرضی، عہد شکنی و محسن کشی، سازباز ضد انتقام  
 حرص و ہوس، ریا و نفاق، کبر و غرور، جاہ و شہرت، بعض و حسد، غیبت و بدگوئی، فخر و  
 خود ستائی، بد بینی و خود بینی، بد زبانی و بد نگاہی، تعلق و پاپلوسی شاید ہی کوئی چھوٹا بڑا  
 ظاہری و باطنی اخلاقی مرض و فساد ہو جو الا ماشاء اللہ قریب قریب ہم سب چھوٹے  
 بڑے اس میں مبتلا و گرفتار نہ ہوں، اور کیوں نہ ہوں؟ کہ ان سارے اخلاقی مفسد و  
 امراض کی جڑ یا ام الامراض تو قلب کی خرابی اور نفس کی بیماری ہے اور ساری دنیا کو  
 سب سے زیادہ بے فکری انفرادی و اجتماعی سیاسی و سماجی قومی و بین الاقوامی تمام  
 تباہیوں بربادیوں کے اسی سرچشمہ سے ہے اور بالواسطہ ان تمام بربادیوں کی ذمہ داری  
 اس خیر امت پر ہے جس کے ہاتھ میں ختم نبوت کے بعد پوری انسانیت کی اصلاح و نگرانی  
 دی گئی تھی (اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) سو خود اسی امت کے علماء و مصلحین نگرانِ قاندین  
 ہی ہیں دو سہروں کی اصلاح سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ ہی خود اپنے قلب کی  
 اصلاح و سلامتی اور نفس کے تزکیہ و صفائی کی فکر کتنوں کو ہوتی ہے، افسوس و حیرت  
 کی بات ہے کہ جو لوگ پورے دین کی اقامت کے مدعی ہیں ان کو بھی سب سے زیادہ چڑھ  
 قلب و نفس کی اصلاح و تزکیہ کے خصوصی خادمانِ دین (صوفیا و مشائخ) ہی سے ہے۔

۱۰  
 ۱۱  
 ۱۲  
 ۱۳  
 ۱۴  
 ۱۵  
 ۱۶  
 ۱۷  
 ۱۸  
 ۱۹  
 ۲۰  
 ۲۱  
 ۲۲  
 ۲۳  
 ۲۴  
 ۲۵  
 ۲۶  
 ۲۷  
 ۲۸  
 ۲۹  
 ۳۰  
 ۳۱  
 ۳۲  
 ۳۳  
 ۳۴  
 ۳۵  
 ۳۶  
 ۳۷  
 ۳۸  
 ۳۹  
 ۴۰  
 ۴۱  
 ۴۲  
 ۴۳  
 ۴۴  
 ۴۵  
 ۴۶  
 ۴۷  
 ۴۸  
 ۴۹  
 ۵۰  
 ۵۱  
 ۵۲  
 ۵۳  
 ۵۴  
 ۵۵  
 ۵۶  
 ۵۷  
 ۵۸  
 ۵۹  
 ۶۰  
 ۶۱  
 ۶۲  
 ۶۳  
 ۶۴  
 ۶۵  
 ۶۶  
 ۶۷  
 ۶۸  
 ۶۹  
 ۷۰  
 ۷۱  
 ۷۲  
 ۷۳  
 ۷۴  
 ۷۵  
 ۷۶  
 ۷۷  
 ۷۸  
 ۷۹  
 ۸۰  
 ۸۱  
 ۸۲  
 ۸۳  
 ۸۴  
 ۸۵  
 ۸۶  
 ۸۷  
 ۸۸  
 ۸۹  
 ۹۰  
 ۹۱  
 ۹۲  
 ۹۳  
 ۹۴  
 ۹۵  
 ۹۶  
 ۹۷  
 ۹۸  
 ۹۹  
 ۱۰۰  
 ۱۰۱  
 ۱۰۲  
 ۱۰۳  
 ۱۰۴  
 ۱۰۵  
 ۱۰۶  
 ۱۰۷  
 ۱۰۸  
 ۱۰۹  
 ۱۱۰  
 ۱۱۱  
 ۱۱۲  
 ۱۱۳  
 ۱۱۴  
 ۱۱۵  
 ۱۱۶  
 ۱۱۷  
 ۱۱۸  
 ۱۱۹  
 ۱۲۰  
 ۱۲۱  
 ۱۲۲  
 ۱۲۳  
 ۱۲۴  
 ۱۲۵  
 ۱۲۶  
 ۱۲۷  
 ۱۲۸  
 ۱۲۹  
 ۱۳۰  
 ۱۳۱  
 ۱۳۲  
 ۱۳۳  
 ۱۳۴  
 ۱۳۵  
 ۱۳۶  
 ۱۳۷  
 ۱۳۸  
 ۱۳۹  
 ۱۴۰  
 ۱۴۱  
 ۱۴۲  
 ۱۴۳  
 ۱۴۴  
 ۱۴۵  
 ۱۴۶  
 ۱۴۷  
 ۱۴۸  
 ۱۴۹  
 ۱۵۰  
 ۱۵۱  
 ۱۵۲  
 ۱۵۳  
 ۱۵۴  
 ۱۵۵  
 ۱۵۶  
 ۱۵۷  
 ۱۵۸  
 ۱۵۹  
 ۱۶۰  
 ۱۶۱  
 ۱۶۲  
 ۱۶۳  
 ۱۶۴  
 ۱۶۵  
 ۱۶۶  
 ۱۶۷  
 ۱۶۸  
 ۱۶۹  
 ۱۷۰  
 ۱۷۱  
 ۱۷۲  
 ۱۷۳  
 ۱۷۴  
 ۱۷۵  
 ۱۷۶  
 ۱۷۷  
 ۱۷۸  
 ۱۷۹  
 ۱۸۰  
 ۱۸۱  
 ۱۸۲  
 ۱۸۳  
 ۱۸۴  
 ۱۸۵  
 ۱۸۶  
 ۱۸۷  
 ۱۸۸  
 ۱۸۹  
 ۱۹۰  
 ۱۹۱  
 ۱۹۲  
 ۱۹۳  
 ۱۹۴  
 ۱۹۵  
 ۱۹۶  
 ۱۹۷  
 ۱۹۸  
 ۱۹۹  
 ۲۰۰  
 ۲۰۱  
 ۲۰۲  
 ۲۰۳  
 ۲۰۴  
 ۲۰۵  
 ۲۰۶  
 ۲۰۷  
 ۲۰۸  
 ۲۰۹  
 ۲۱۰  
 ۲۱۱  
 ۲۱۲  
 ۲۱۳  
 ۲۱۴  
 ۲۱۵  
 ۲۱۶  
 ۲۱۷  
 ۲۱۸  
 ۲۱۹  
 ۲۲۰  
 ۲۲۱  
 ۲۲۲  
 ۲۲۳  
 ۲۲۴  
 ۲۲۵  
 ۲۲۶  
 ۲۲۷  
 ۲۲۸  
 ۲۲۹  
 ۲۳۰  
 ۲۳۱  
 ۲۳۲  
 ۲۳۳  
 ۲۳۴  
 ۲۳۵  
 ۲۳۶  
 ۲۳۷  
 ۲۳۸  
 ۲۳۹  
 ۲۴۰  
 ۲۴۱  
 ۲۴۲  
 ۲۴۳  
 ۲۴۴  
 ۲۴۵  
 ۲۴۶  
 ۲۴۷  
 ۲۴۸  
 ۲۴۹  
 ۲۵۰  
 ۲۵۱  
 ۲۵۲  
 ۲۵۳  
 ۲۵۴  
 ۲۵۵  
 ۲۵۶  
 ۲۵۷  
 ۲۵۸  
 ۲۵۹  
 ۲۶۰  
 ۲۶۱  
 ۲۶۲  
 ۲۶۳  
 ۲۶۴  
 ۲۶۵  
 ۲۶۶  
 ۲۶۷  
 ۲۶۸  
 ۲۶۹  
 ۲۷۰  
 ۲۷۱  
 ۲۷۲  
 ۲۷۳  
 ۲۷۴  
 ۲۷۵  
 ۲۷۶  
 ۲۷۷  
 ۲۷۸  
 ۲۷۹  
 ۲۸۰  
 ۲۸۱  
 ۲۸۲  
 ۲۸۳  
 ۲۸۴  
 ۲۸۵  
 ۲۸۶  
 ۲۸۷  
 ۲۸۸  
 ۲۸۹  
 ۲۹۰  
 ۲۹۱  
 ۲۹۲  
 ۲۹۳  
 ۲۹۴  
 ۲۹۵  
 ۲۹۶  
 ۲۹۷  
 ۲۹۸  
 ۲۹۹  
 ۳۰۰  
 ۳۰۱  
 ۳۰۲  
 ۳۰۳  
 ۳۰۴  
 ۳۰۵  
 ۳۰۶  
 ۳۰۷  
 ۳۰۸  
 ۳۰۹  
 ۳۱۰  
 ۳۱۱  
 ۳۱۲  
 ۳۱۳  
 ۳۱۴  
 ۳۱۵  
 ۳۱۶  
 ۳۱۷  
 ۳۱۸  
 ۳۱۹  
 ۳۲۰  
 ۳۲۱  
 ۳۲۲  
 ۳۲۳  
 ۳۲۴  
 ۳۲۵  
 ۳۲۶  
 ۳۲۷  
 ۳۲۸  
 ۳۲۹  
 ۳۳۰  
 ۳۳۱  
 ۳۳۲  
 ۳۳۳  
 ۳۳۴  
 ۳۳۵  
 ۳۳۶  
 ۳۳۷  
 ۳۳۸  
 ۳۳۹  
 ۳۴۰  
 ۳۴۱  
 ۳۴۲  
 ۳۴۳  
 ۳۴۴  
 ۳۴۵  
 ۳۴۶  
 ۳۴۷  
 ۳۴۸  
 ۳۴۹  
 ۳۵۰  
 ۳۵۱  
 ۳۵۲  
 ۳۵۳  
 ۳۵۴  
 ۳۵۵  
 ۳۵۶  
 ۳۵۷  
 ۳۵۸  
 ۳۵۹  
 ۳۶۰  
 ۳۶۱  
 ۳۶۲  
 ۳۶۳  
 ۳۶۴  
 ۳۶۵  
 ۳۶۶  
 ۳۶۷  
 ۳۶۸  
 ۳۶۹  
 ۳۷۰  
 ۳۷۱  
 ۳۷۲  
 ۳۷۳  
 ۳۷۴  
 ۳۷۵  
 ۳۷۶  
 ۳۷۷  
 ۳۷۸  
 ۳۷۹  
 ۳۸۰  
 ۳۸۱  
 ۳۸۲  
 ۳۸۳  
 ۳۸۴  
 ۳۸۵  
 ۳۸۶  
 ۳۸۷  
 ۳۸۸  
 ۳۸۹  
 ۳۹۰  
 ۳۹۱  
 ۳۹۲  
 ۳۹۳  
 ۳۹۴  
 ۳۹۵  
 ۳۹۶  
 ۳۹۷  
 ۳۹۸  
 ۳۹۹  
 ۴۰۰  
 ۴۰۱  
 ۴۰۲  
 ۴۰۳  
 ۴۰۴  
 ۴۰۵  
 ۴۰۶  
 ۴۰۷  
 ۴۰۸  
 ۴۰۹  
 ۴۱۰  
 ۴۱۱  
 ۴۱۲  
 ۴۱۳  
 ۴۱۴  
 ۴۱۵  
 ۴۱۶  
 ۴۱۷  
 ۴۱۸  
 ۴۱۹  
 ۴۲۰  
 ۴۲۱  
 ۴۲۲  
 ۴۲۳  
 ۴۲۴  
 ۴۲۵  
 ۴۲۶  
 ۴۲۷  
 ۴۲۸  
 ۴۲۹  
 ۴۳۰  
 ۴۳۱  
 ۴۳۲  
 ۴۳۳  
 ۴۳۴  
 ۴۳۵  
 ۴۳۶  
 ۴۳۷  
 ۴۳۸  
 ۴۳۹  
 ۴۴۰  
 ۴۴۱  
 ۴۴۲  
 ۴۴۳  
 ۴۴۴  
 ۴۴۵  
 ۴۴۶  
 ۴۴۷  
 ۴۴۸  
 ۴۴۹  
 ۴۵۰  
 ۴۵۱  
 ۴۵۲  
 ۴۵۳  
 ۴۵۴  
 ۴۵۵  
 ۴۵۶  
 ۴۵۷  
 ۴۵۸  
 ۴۵۹  
 ۴۶۰  
 ۴۶۱  
 ۴۶۲  
 ۴۶۳  
 ۴۶۴  
 ۴۶۵  
 ۴۶۶  
 ۴۶۷  
 ۴۶۸  
 ۴۶۹  
 ۴۷۰  
 ۴۷۱  
 ۴۷۲  
 ۴۷۳  
 ۴۷۴  
 ۴۷۵  
 ۴۷۶  
 ۴۷۷  
 ۴۷۸  
 ۴۷۹  
 ۴۸۰  
 ۴۸۱  
 ۴۸۲  
 ۴۸۳  
 ۴۸۴  
 ۴۸۵  
 ۴۸۶  
 ۴۸۷  
 ۴۸۸  
 ۴۸۹  
 ۴۹۰  
 ۴۹۱  
 ۴۹۲  
 ۴۹۳  
 ۴۹۴  
 ۴۹۵  
 ۴۹۶  
 ۴۹۷  
 ۴۹۸  
 ۴۹۹  
 ۵۰۰  
 ۵۰۱  
 ۵۰۲  
 ۵۰۳  
 ۵۰۴  
 ۵۰۵  
 ۵۰۶  
 ۵۰۷  
 ۵۰۸  
 ۵۰۹  
 ۵۱۰  
 ۵۱۱  
 ۵۱۲  
 ۵۱۳  
 ۵۱۴  
 ۵۱۵  
 ۵۱۶  
 ۵۱۷  
 ۵۱۸  
 ۵۱۹  
 ۵۲۰  
 ۵۲۱  
 ۵۲۲  
 ۵۲۳  
 ۵۲۴  
 ۵۲۵  
 ۵۲۶  
 ۵۲۷  
 ۵۲۸  
 ۵۲۹  
 ۵۳۰  
 ۵۳۱  
 ۵۳۲  
 ۵۳۳  
 ۵۳۴  
 ۵۳۵  
 ۵۳۶  
 ۵۳۷  
 ۵۳۸  
 ۵۳۹  
 ۵۴۰  
 ۵۴۱  
 ۵۴۲  
 ۵۴۳  
 ۵۴۴  
 ۵۴۵  
 ۵۴۶  
 ۵۴۷  
 ۵۴۸  
 ۵۴۹  
 ۵۵۰  
 ۵۵۱  
 ۵۵۲  
 ۵۵۳  
 ۵۵۴  
 ۵۵۵  
 ۵۵۶  
 ۵۵۷  
 ۵۵۸  
 ۵۵۹  
 ۵۶۰  
 ۵۶۱  
 ۵۶۲  
 ۵۶۳  
 ۵۶۴  
 ۵۶۵  
 ۵۶۶  
 ۵۶۷  
 ۵۶۸  
 ۵۶۹  
 ۵۷۰  
 ۵۷۱  
 ۵۷۲  
 ۵۷۳  
 ۵۷۴  
 ۵۷۵  
 ۵۷۶  
 ۵۷۷  
 ۵۷۸  
 ۵۷۹  
 ۵۸۰  
 ۵۸۱  
 ۵۸۲  
 ۵۸۳  
 ۵۸۴  
 ۵۸۵  
 ۵۸۶  
 ۵۸۷  
 ۵۸۸  
 ۵۸۹  
 ۵۹۰  
 ۵۹۱  
 ۵۹۲  
 ۵۹۳  
 ۵۹۴  
 ۵۹۵  
 ۵۹۶  
 ۵۹۷  
 ۵۹۸  
 ۵۹۹  
 ۶۰۰  
 ۶۰۱  
 ۶۰۲  
 ۶۰۳  
 ۶۰۴  
 ۶۰۵  
 ۶۰۶  
 ۶۰۷  
 ۶۰۸  
 ۶۰۹  
 ۶۱۰  
 ۶۱۱  
 ۶۱۲  
 ۶۱۳  
 ۶۱۴  
 ۶۱۵  
 ۶۱۶  
 ۶۱۷  
 ۶۱۸  
 ۶۱۹  
 ۶۲۰  
 ۶۲۱  
 ۶۲۲  
 ۶۲۳  
 ۶۲۴  
 ۶۲۵  
 ۶۲۶  
 ۶۲۷  
 ۶۲۸  
 ۶۲۹  
 ۶۳۰  
 ۶۳۱  
 ۶۳۲  
 ۶۳۳  
 ۶۳۴  
 ۶۳۵  
 ۶۳۶  
 ۶۳۷  
 ۶۳۸  
 ۶۳۹  
 ۶۴۰  
 ۶۴۱  
 ۶۴۲  
 ۶۴۳  
 ۶۴۴  
 ۶۴۵  
 ۶۴۶  
 ۶۴۷  
 ۶۴۸  
 ۶۴۹  
 ۶۵۰  
 ۶۵۱  
 ۶۵۲  
 ۶۵۳  
 ۶۵۴  
 ۶۵۵  
 ۶۵۶  
 ۶۵۷  
 ۶۵۸  
 ۶۵۹  
 ۶۶۰  
 ۶۶۱  
 ۶۶۲  
 ۶۶۳  
 ۶۶۴  
 ۶۶۵  
 ۶۶۶  
 ۶۶۷  
 ۶۶۸  
 ۶۶۹  
 ۶۷۰  
 ۶۷۱  
 ۶۷۲  
 ۶۷۳  
 ۶۷۴  
 ۶۷۵  
 ۶۷۶  
 ۶۷۷  
 ۶۷۸  
 ۶۷۹  
 ۶۸۰  
 ۶۸۱  
 ۶۸۲  
 ۶۸۳  
 ۶۸۴  
 ۶۸۵  
 ۶۸۶  
 ۶۸۷  
 ۶۸۸  
 ۶۸۹  
 ۶۹۰  
 ۶۹۱  
 ۶۹۲  
 ۶۹۳  
 ۶۹۴  
 ۶۹۵  
 ۶۹۶  
 ۶۹۷  
 ۶۹۸  
 ۶۹۹  
 ۷۰۰  
 ۷۰۱  
 ۷۰۲  
 ۷۰۳  
 ۷۰۴  
 ۷۰۵  
 ۷۰۶  
 ۷۰۷  
 ۷۰۸  
 ۷۰۹  
 ۷۱۰  
 ۷۱۱  
 ۷۱۲  
 ۷۱۳  
 ۷۱۴  
 ۷۱۵  
 ۷۱۶  
 ۷۱۷  
 ۷۱۸  
 ۷۱۹  
 ۷۲۰  
 ۷۲۱  
 ۷۲۲  
 ۷۲۳  
 ۷۲۴  
 ۷۲۵  
 ۷۲۶  
 ۷۲۷  
 ۷۲۸  
 ۷۲۹  
 ۷۳۰  
 ۷۳۱  
 ۷۳۲  
 ۷۳۳  
 ۷۳۴  
 ۷۳۵  
 ۷۳۶  
 ۷۳۷  
 ۷۳۸  
 ۷۳۹  
 ۷۴۰  
 ۷۴۱  
 ۷۴۲  
 ۷۴۳  
 ۷۴۴  
 ۷۴۵  
 ۷۴۶  
 ۷۴۷  
 ۷۴۸  
 ۷۴۹  
 ۷۵۰  
 ۷۵۱  
 ۷۵۲  
 ۷۵۳  
 ۷۵۴  
 ۷۵۵  
 ۷۵۶  
 ۷۵۷  
 ۷۵۸  
 ۷۵۹  
 ۷۶۰  
 ۷۶۱  
 ۷۶۲  
 ۷۶۳  
 ۷۶۴  
 ۷۶۵  
 ۷۶۶  
 ۷۶۷  
 ۷۶۸  
 ۷۶۹  
 ۷۷۰  
 ۷۷۱  
 ۷۷۲  
 ۷۷۳  
 ۷۷۴  
 ۷۷۵  
 ۷۷۶  
 ۷۷۷  
 ۷۷۸  
 ۷۷۹  
 ۷۸۰  
 ۷۸۱  
 ۷۸۲  
 ۷۸۳  
 ۷۸۴  
 ۷۸۵  
 ۷۸۶  
 ۷۸۷  
 ۷۸۸  
 ۷۸۹  
 ۷۹۰  
 ۷۹۱  
 ۷۹۲  
 ۷۹۳  
 ۷۹۴  
 ۷۹۵  
 ۷۹۶  
 ۷۹۷  
 ۷۹۸  
 ۷۹۹  
 ۸۰۰  
 ۸۰۱  
 ۸۰۲  
 ۸۰۳  
 ۸۰۴  
 ۸۰۵  
 ۸۰۶  
 ۸۰۷  
 ۸۰۸  
 ۸۰۹  
 ۸۱۰  
 ۸۱۱  
 ۸۱۲  
 ۸۱۳  
 ۸۱۴  
 ۸۱۵  
 ۸۱۶  
 ۸۱۷  
 ۸۱۸  
 ۸۱۹  
 ۸۲۰  
 ۸۲۱  
 ۸۲۲  
 ۸۲۳  
 ۸۲۴  
 ۸۲۵  
 ۸۲۶  
 ۸۲۷  
 ۸۲۸  
 ۸۲۹  
 ۸۳۰  
 ۸۳۱  
 ۸۳۲  
 ۸۳۳  
 ۸۳۴  
 ۸۳۵  
 ۸۳۶  
 ۸۳۷  
 ۸۳۸  
 ۸۳۹  
 ۸۴۰  
 ۸۴۱  
 ۸۴۲  
 ۸۴۳  
 ۸۴۴  
 ۸۴۵  
 ۸۴۶  
 ۸۴۷  
 ۸۴۸  
 ۸۴۹  
 ۸۵۰  
 ۸۵۱  
 ۸۵۲  
 ۸۵۳  
 ۸۵۴  
 ۸۵۵  
 ۸۵۶  
 ۸۵۷  
 ۸۵۸  
 ۸۵۹  
 ۸۶۰  
 ۸۶۱  
 ۸۶۲  
 ۸۶۳  
 ۸۶۴  
 ۸۶۵  
 ۸۶۶  
 ۸۶۷  
 ۸۶۸  
 ۸۶۹  
 ۸۷۰  
 ۸۷۱  
 ۸۷۲  
 ۸۷۳  
 ۸۷۴  
 ۸۷۵  
 ۸۷۶  
 ۸۷۷  
 ۸۷۸  
 ۸۷۹  
 ۸۸۰  
 ۸۸۱  
 ۸۸۲  
 ۸۸۳  
 ۸۸۴  
 ۸۸۵  
 ۸۸۶  
 ۸۸۷  
 ۸۸۸  
 ۸۸۹  
 ۸۹۰  
 ۸۹۱  
 ۸۹۲  
 ۸۹۳  
 ۸۹۴  
 ۸۹۵  
 ۸۹۶  
 ۸۹۷  
 ۸۹۸  
 ۸۹۹  
 ۹۰۰  
 ۹۰۱  
 ۹۰۲  
 ۹۰۳  
 ۹۰۴  
 ۹۰۵  
 ۹۰۶  
 ۹۰۷  
 ۹۰۸  
 ۹۰۹  
 ۹۱۰  
 ۹۱۱  
 ۹۱۲  
 ۹۱۳  
 ۹۱۴  
 ۹۱۵  
 ۹۱۶  
 ۹۱۷  
 ۹۱۸  
 ۹۱۹  
 ۹۲۰  
 ۹۲۱  
 ۹۲۲  
 ۹۲۳  
 ۹۲۴  
 ۹۲۵  
 ۹۲۶  
 ۹۲۷  
 ۹۲۸  
 ۹۲۹  
 ۹۳۰  
 ۹۳۱  
 ۹۳۲  
 ۹۳۳  
 ۹۳۴  
 ۹۳۵  
 ۹۳۶  
 ۹۳۷  
 ۹۳۸  
 ۹۳۹  
 ۹۴۰  
 ۹۴۱  
 ۹۴۲  
 ۹۴۳  
 ۹۴۴  
 ۹۴۵  
 ۹۴۶  
 ۹۴۷  
 ۹۴۸  
 ۹۴۹  
 ۹۵۰  
 ۹۵۱  
 ۹۵۲  
 ۹۵۳  
 ۹۵۴  
 ۹۵۵  
 ۹۵۶  
 ۹۵۷  
 ۹۵۸  
 ۹۵۹  
 ۹۶۰  
 ۹۶۱  
 ۹۶۲  
 ۹۶۳  
 ۹۶۴  
 ۹۶۵  
 ۹۶۶  
 ۹۶۷  
 ۹۶۸  
 ۹۶۹  
 ۹۷۰  
 ۹۷۱  
 ۹۷۲  
 ۹۷۳  
 ۹۷۴  
 ۹۷۵  
 ۹۷۶  
 ۹۷۷  
 ۹۷۸  
 ۹۷۹  
 ۹۸۰  
 ۹۸۱  
 ۹۸۲  
 ۹۸۳  
 ۹۸۴  
 ۹۸۵  
 ۹۸۶  
 ۹۸۷  
 ۹۸۸  
 ۹۸۹  
 ۹۹۰  
 ۹۹۱  
 ۹۹۲  
 ۹۹۳  
 ۹۹۴  
 ۹۹۵  
 ۹۹۶  
 ۹۹۷  
 ۹۹۸  
 ۹۹۹  
 ۱۰۰۰

زندگی کے سوشل پہلو کی اہمیت | زندگی کا ایک اور شعبہ مجلسی و معاشرتی (سوشل) تعلقات اور اس سے عمومی غفلت !  
 کا ہے جن کو زندگی کے بناؤ و سنوار میں غیر اہم دخل نہیں ،

جامع و کامل دین ان تعلقات کے حقوق و آداب سے بھی کیسے قطع نظر کر سکتا تھا ایسے جزئیات تک کا امر وہی فرما کر حسن معاشرت کی اہمیت ہی پر متوجہ فرمایا ہے کہ مثلاً "اے ایمان والو، جب مجلس میں کہا جائے کہ ذرا جگہ کھول دو تو کھول دیا کرو کہ دوسرا بھی بیٹھ جایا کرے اس سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا و آخرت میں کثادگی فرمائے گا اور جب کسی ضرورت سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو اس سے اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان و اہل علم کے درجات بلند فرمائے گا" دیکھئے بظاہر کیسی حقیر ذرا سی بات لیکن کیسے اہتمام سے اس کا امر و حکم اور ساتھ ہی کیسے عظیم اجر و جزا کا وعدہ، اس حکم سے تو ممکن ہے کہ کم ہی لوگ واقف ہوں لیکن یہ نہیں و ممانعت خود قرآن کی مشہور ہے کہ بلا سلام کئے اور بلا اجازت لئے دوسرے کے گھر میں نہ داخل ہونا چاہئے۔ اور اگر وہ کہے کہ لوٹ جاؤ، تو

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) یَوْمَ لَا يَنْفَعُ قَالٌ وَلَا بَيِّنَةٌ إِلَّا مَن آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (۲۶)  
 نیر دین اور اقامت دین کی بھی کتاب جس پر نازل ہوئی اس نے قلب ہی کے صلاح و فساد پر کس قوت و شدت کے ساتھ متنبہ فرمایا کہ جس کے بناؤ بگاڑ پر سارا بناؤ بگاڑ موقوف و منحصر ہے آگاہ رہو کہ وہ قلب ہی ہے۔ الا وہی القلب۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا لِقَابِ اللَّهِ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانشُرُوا وَارْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (۵۸) عَه يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ (۲۷)  
 ۳۸ وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ ارجِعُوا فَارجِعُوا (۲۸)



لوٹ جانا چاہیے۔ باقی حدیثوں میں تو حسن اخلاق و حسن معاشرت کے احکام و جزئیات کا شمار ہی کہاں تک ہو سکتا ہے اور ان جزئیات کی تعلیم کا جیسا اہتمام تھا اس کا ایک ہی جزیہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک صحابی بلا سلام کے حضور کی خدمت میں چلے آئے تو حکم دیا کہ واپس جاؤ اور السلام علیکم کہہ کر پھر آؤ۔

ساتھ ہی ان اداب معاشرت سے ہمارے اُس بُعد و اجنبیت کا بھی اندازہ کیجئے کہ اگر اب کوئی مجالس سے اٹھ جانے یا دروازہ سے لوٹ جانے کو کہدے یا بلا سلام آجانے والے کو لوٹا دے تو اس سے بڑا بد اخلاق کون ہوگا۔

غرض جہاں تک دنیوی و مادی زندگی کا تعلق ہے ہم پاؤں کی جوتی تک اپنی بساط بھر بہتر سے بہتری پہننا چاہتے ہیں اور پیر کی ایک انگلی بھی سنسی خوشی کاٹنے کٹوانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے لیکن دین و ایمان ظاہری و باطنی زندگی کے عقائد و عبادات معاملات و اخلاق اور معاشرت سب ہی میں اوامر و نواہی و واجبات و مستحبات کے اعتبار سے "لنگڑے لوٹے، اندھے بہرے" سرتاپا مفلوج و معطل بن کر اس طرح چہ غم ہیں کہ گویا ہمارے دینی جسم کا کوئی رُوں بھی میلا نہیں۔

لے خود اپنا حال تو یہ ہے کہ آستانہ تھا تو یس میں بار پانے سے پہلے شاید ہی ایسی باتوں کے دین ہونے کا کبھی و ہم بھی ہوا ہو اور وقت کے مجدد حروف ہی فرمایا کرتے تھے کہ "دیس کسی اور چیز کا مجدد ہوں یا نہ ہوں لیکن معاشرت کا ضرور ہوں" بلکہ حسن معاشرت کے اہتمام و تعلیم ہی کو انسانیت قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ "ولی و زورگ تو نہ میں ہوں نہ بنانا ہوں لیکن اگر کوئی ٹھہر جائے تو آدمی بنا دیتا ہوں" غالب نے بالکل سچ کہا ہے کہ "آدمی کو بھی بیسیر نہیں انساں ہونا" حتیٰ کہ خود حضرت علیہ الرحمۃ کے حلقہ بگوشوں میں آدمی گئے چنے ہی ملتے ہیں۔

۵۰ امام بخاری نے الاذیاب المفردہ کے زیر عنوان اسی ہی احادیث کا مجموعہ مرتب و تدوین فرمایا ہے جو مسلم کلمہ میں پڑھے پڑھائے جانے کا مستحق ہے (صفحہ ۴۰)

امت کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ طبقہ کی بھی انتہائی غفلت و بطالت ہماری اسلامی زندگی کے  
حق میں زہرِ قاتل اور سب سے ہلک بیماری ہے تاہم جب تک ہمارا بے حس و حرکت  
ایمان بھی سانس لے رہا ہے مرضِ لاعلاج ہرگز نہیں۔

ضرورت ہے کہ توحیدِ الہ اور انگریزوں کی ہی علاج ہے کہ ایمان و عمل صالح دونوں کی توام  
یقینِ آخرت کا عملی ظہور ہو! تبلیغی و اصلاحی جدوجہد کو فرنگی نقالیوں کے بجائے خود

اسلام ہی کی کتابِ ہدایت ہمہ گیر نظامِ ہدایت کے تحت برپا کیا جائے جس میں کمیت  
یا طول و عرض سے اگر مقدم زائد نہیں تو کم از کم اس کے ساتھ ساتھ اور برابر ہی کیفیت  
یا عمق پر بھی زور و توجہ ہو اور اس اصلاحی جدوجہد میں قلب و نفس کی باطنی اصلاح

یا تہذیب و تزکیہ کا حق جسم و جوارح کے ظاہری اعمال سے بھی اہم و اقدم ہو ظاہر و  
باطن دونوں کی تیز گام اصلاح کے لئے جس طرح ایک طرف یہ لازم ہے کہ توحیدِ

الہ اور یومِ آخرت پر ایمان کو خصوصاً خالی اقراری و قولی لَمَّا يَدَّخِلُ الْاِيْمَانَ فِي  
قُلُوْبِكُمْ و الے ایمان سے بڑھا کر قلب میں داخل و راسخ یا دل میں گھر کر جانے والا

زندہ و بیدار ایمان بنایا جائے جس سے عملی جسم میں حیات و حرکت رونما ہو اسی طرح  
دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ عملی حیات و حرکت کو پورے دینی قالب میں اسی طرح

دوڑانے کی فکر و سعی ہو کہ ظاہری و باطنی کوئی عضو مفلوج و معطل نہ رہنے پائے کیونکہ  
چھوٹے سے چھوٹے عضو کی بیماری و ناکارگی کا اثر کم یا زیادہ دوسرے اعضا اور جوارح

پر بھی خراب ہی نہیں پڑتا بلکہ خود روح و ایمان کو مضحک کرنے والا ہوتا ہے جس طرح

داڑھ کا درد بھی جسم و جان دونوں کو بے چین و بے قرار کر دیتا ہے۔

ایمان اور عمل پر متوازی توجہ | غرض ایمان و عمل دونوں کی طرف متوازی توجہ اور دونوں ہی خسران کا واحد علاج ہے! کے رسوخ و قوت اور باہمی عمل اور رد عمل تاثر و تاثر ہی سے انشاء اللہ دونوں کی صحت مند و متوازن زندگی حاصل ہوگی اور اسلامی عضو یہ (ORGANISM) اور مشین کا ہر ہر عضو اور پرزہ ظاہری و باطنی انفرادی و اجتماعی طور پر پتھر و ہم آہنگ کارکردگی کے حقوق ادا کر سکے گا مسلمان ہی نہیں "إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ" والے انسان یا پوری انسانیت کو زیان و خسران سے بچانے کا بس یہ ایک ہی علاج ہے۔

## ”صلاح کے ساتھ اصلاح کی ضرورت و اہمیت“

(رَوَّاصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّاصُوا بِالصَّيْرِ)

خسران سے کامل بچاؤ کے لئے | اگے بڑا عملی سوال یہ ہے کہ یہ ایک ہی علاج ہو کیسے؟ کل انسانیت پر تبلیغ ضروری ہے اور کرے کون؟ وَتَوَّاصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّاصُوا بِالصَّيْرِ

اسی شکل کا دو لفظوں میں حل ہے، انسان کو بحیثیت مجموعی خسران سے بچانے کے لئے صرف کچھ افراد کا اپنی اپنی جگہ ”أَمَّنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کا حق ادا کر کے مومن صالح بن جانا کافی نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح کی اس حقانی زندگی کو پوری نوع انسان میں پھیلانے اور پیداکرنے کے لئے آپس میں ایک دوسرے کو اس کی فہمائش و تاکید کرتے رہنا بھی لازم ہے

اور اس تاکید یا تعلیم و تبلیغ کی راہ میں جو مشکلات و موانع پیش آئیں ان پر صبر و تحمل کی بھی باہم تاکید ضروری ہے یعنی پوری انسانیت کو خسران سے بے اس کے نہیں بچایا جاسکتا کہ اپنے کو بچانے والے افراد ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بھی بچانے کی اپنی والی پوری جدوجہدیں لگے رہیں۔

اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح کی فکر و تدبیر یا تواصی بالحق و تواصی بالصبر کے بعد بجز مشیتِ حق کے عالم اسباب میں اور تیسری چیز رہ ہی کیا جاتی ہے جو انسان کے کسی فرد و جماعت معاشرہ و ملت کی اصلاح و فلاح یا اس کو خسران سے بچانے کا راستہ روک سکے "تواصی بالحق" کے اس اصول و تعلیم کے لئے قرآن مجید کی عام اصطلاح "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے یعنی اسلام نے مسلمان پر صرف اپنی بُرائی بھلائی کی ذمہ داری عائد نہیں کی ہے بلکہ اس کے اسلامی فرائض ہی میں، دوسروں کو بھلائی کا حکم و تاکید اور بُرائی پر روک ٹوک بھی داخل ہے۔ اس اصول پر عمل کی اصولی تفصیلات بھی خود قرآن ہی پر ذرا فکر و تدبیر سے پوری طرح معلوم و متعین ہو جاتی ہیں۔

ختم نبوت کے بعد اب اصلاح و اصلاح | اصلاح و اصلاح کا کامل ترین نمونہ حضرات انبیاء کی ذمہ داری امتِ محمدیہ پر عائد ہوتی ہے | علیہم السلام ہوتے ہیں ایک طرف ان کی ذات بجائے خود "أَمِنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" یا ایمان و عمل صالح کا اسوہ کاملہ ہوتی ہے اور دوسری طرف دوسروں کو "تواصی بالحق و تواصی بالصبر" یعنی اسی ایمان و

عمل صالح کی زندگی کے تمام معروفات کا امر اور منکرات سے نہی تو ان کی پوری زندگی کا مقصد اور مشن ہوتا ہے جس کے لئے وہ خاص طور پر مبعوث ہی ہوتے ہیں۔ ختم نبوت کے بعد اس مشن اور مقصد کی تکمیل کے لئے یہ حیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کو "امت مبعوثہ" یا "امت مخرجة" قرار دیا گیا ہے کہ وہ من حیث امت اٹھائی اور نکالی ہی اس غرض سے گئی ہے کہ ایمان و عمل صالح کا خود بہترین نمونہ "خیر امتہ" بن کر پوری انسانیت (للناس) کے حق میں حق و صبر کی تو اسی یا معروف کے امر اور منکر سے نہی کے انبیائی فرض کا حق ادا کرے۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (پہلے) امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم)** کی اسی دہری ذمہ داری کو دوسری جگہ بجائے "خیر امت" کے ہر پہلو سے کامل توازن و اعتدال والی امت یا "امت وسطہ" ٹھہرا کر ایک دوسرے عنوان سے اسی طرح واضح فرمایا کہ تم کو پوری انسانیت کے لئے زندگی کی عملی شہادت بنے رہنا اور خود اپنے حق میں یہ شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنائے رہنا ہے۔ **وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۱۲۳)**

مثال و نمونہ یا شہادتِ عمل ہے ہی ایسی زبردست طاقت کہ اس سے حق ہی نہیں، حق و باطل خیر و شر سب ہی کو خوب فروغ ہوتا ہے بلکہ باطل و شر کو اور زیادہ اس لئے کہ اس کو اندر سے نفسانی میدانوں اور باہر سے دنیا کی ظاہری زندگی

دظاہر من الحیوة الدنیاء کی برابر شہ بلیتی رہتی ہے، اس کی بہترین مثال تاریخ کی سب سے  
مفسدانہ تحریک فلسفہ اشتراکیت و معیشت ہے جو فلسفیانہ یا با بعد الطبیعیاتی حیثیت  
ہی سے نہایت بودا نظریہ و نظام نہیں ہے بلکہ خالص معاشی لحاظ سے بھی نہایت  
غیر فطری غیر متوازن اور گونا گوں بے اعتدالیوں کے بلغوبہ کے سوا کچھ نہیں مگر صدیوں  
سے سرمایہ داروں جاگیرداروں کی جو بے اعتدالیاں زر و زرین کی بد استعمالیوں کی  
راہ سے چلی جا رہی تھیں ایک طرف انہوں نے اس تحریک کے لئے میدان صاف  
کر رکھا تھا دوسری طرف اس کے حامیوں کو انقلاب کی راہ سے اس کی عظیم الشان  
حکومت پر قبضہ پا کر اس نظام و نظریہ کو پوری طرح دل کھول کر عمل میں لانے کا  
موقع مل گیا پھر کیا تھا کہ عمل و نمونہ کی یہ شہادت پر وسیگنڈہ اور حکومت کے بل پر  
آندھی کی آگ کی طرح دیکھتے دیکھتے ساری دنیا میں پھیل گئی حتیٰ کہ اشتراکیت دشمن  
کیمپ درمیان جمہوریت اور شخصی و انفرادی آزادی کا دعویٰ کرنے والوں تک  
میں سرمایہ داری و جاگیرداری کیا سرے سے ذاتی و انفرادی ملکیت ہی کو مٹانے کے  
اشتراکی نعروں ہی کا روز افزوں پول بالا ہو رہا ہے۔

جس طرح فرد کی صحبت پر انفرادی زندگی کا بناؤ اور بگاڑ	غرض انسان کی سرشت ہی یہ ہے کہ
متنصر ہے اسی طرح انسانیت کے بناؤ اور بگاڑ کی	وہ کان کے بجائے آنکھ یا قول کے
ذمہ داری مستقل امت پر عائد ہوتی ہے!	بجائے عمل کی شہادت سے زیادہ

قابل و متاثر ہوتا ہے اور جس طرح فرد کے لئے فرد کی نیک و بد صحبت خالی نصیحت سے

زیادہ کارگر ہوتی ہے اسی طرح جماعت و معاشرہ کے لئے جماعت و معاشرہ کی یا پوری انسانیت کے لئے کسی ایسی مستقل بین اقوامی ملت و امت کی ضرورت ہے جو نسلی و جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہو کر مختلف قوموں اور ملکوں میں رہتے بستے ہوئے بھی ایمان و عمل صالح کی زندگی پر مستقیم رہ کر دوسروں کے لئے اس مثالی عملی شہادت کا کام دیتی رہے اور پھر اس شہادت عمل کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، یا "تواصی بالحق" کا بھی حق کما حقہ ادا کرتی رہے۔

قرآن یہ ذمہ داری امت محمدیہ پر | قرآن مجید نے اسی بین اقوامی قوم کو بہترین قوم  
عائد کرتا ہے! خیر امت کا لقب دیا ہے اور "شہادت علی الناس"

کا فرض ادا کرنے کے لئے اس امت کی خاص خصوصیت اس کا "امت وسط" یا اعتدال پسند قوم ہونا ٹھہرایا ہے، دیکھا جائے تو دنیا کے ہر قسم کے انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی شرف و فساد کا سرچشمہ اعتدال و توسط سے تجاوز یا افراط و تفریط کی گمراہیاں ہی ہوتی ہیں، اسلامی تعلیمات کا سب سے زیادہ نمایاں وصف زندگی کے ہر ذہنی و ذنبوی شعبہ میں توسط و توازن کی "صراطِ مستقیم" ہے اس ناقص و محدود عالم کون و فساد کی ہر چیز کم و بیش خیر و شر کا مجموعہ ہے نہ کوئی خیر بالکل شر سے پاک اور نہ کوئی شر بالکل خیر سے خالی۔ اسلام کی صراطِ مستقیم یا سیدھی راہ کا اس بہر حال خیر و شر آئینہ زندگی کی ہر راہ میں کمال توازن و توسط ہی ہے کہ وہ نسبتاً خیر کے پہلوؤں کی زیادہ سے زیادہ جامع ہے اور شر کے پہلوؤں کی زیادہ سے زیادہ مانع

ہوتی ہے، اسی جامع و مانع توازن و اعتدال کا لازمہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کم و بیش ہر معاملہ میں جامع اضداد معلوم ہوتی ہیں اور لوگ اپنے محدود و ناقص علم و نظر کی بنا پر کسی ایک ہی پہلو پر زور دے کر اسلامی اعتدال و توازن کے سارے حسن و کمال کو بلیا میٹ کر دیتے ہیں۔

مثلاً اسلام نہ دنیا پرستی کا معلم ہے اور نہ دنیا بیزاری کا، مگر آج کل کے مادہ پرست غوغائیوں سے مرعوب اور خود اپنی حرص و ہوس سے مغلوب مسلمان پورے اسلام کو ایسے قالب میں ڈھال دینا چاہتے ہیں کہ گویا اسلام کی نظریں بھی نہ اس دنیا کی زندگی سے مادہ را کوئی زندگی ہے اور نہ اس کی صلاح و فلاح کی کوئی تعلیم و دعوت، اسی طرح سیاسیات و معاشیات کو لیجئے کہ کسی کو اسلامی سیاست و معیشت تمام تر روسی اشتراکیت و اشتمالیت نظر آتی ہے جس میں انفرادی آزادی و ملکیت تک کی سرے سے گنجائش نہیں اور کسی کو سرشماری والی جمہوریت اور بے قید و بند والی ملکیت و بلوکیت اور جب ہٹلر کا زور تھا تو اسلامی امارت آمریت بنائی جانے لگی تھی اور کہیں ہٹلر کامیاب ہو جاتا تو یقیناً دنیا میں آج اشتراکیت و جمہوریت سب کے بجائے آمریت ہی کے گن گائے جاتے ہوتے لیکن اسلام کے تمام جامع و مانع عناصر کو مد نظر رکھا جائے تو نہ وہ روس کی اشتراکیت ہے نہ امریکہ و انگلستان کی جمہوریت اور نہ ہٹلر سوینی کی آمریت و فسطائیت بلکہ اشتراکیت و جمہوریت انفرادیت و اجتماعیت سب کے فوائد و منافع کی جامع اور سب کے نقائص و مضار کی مانع،



آج مسلمانوں کی حکومتیں تو ہیں مگر آج بھی مسلمانوں کی چھوٹی بڑی بری بھلی بیسیوں ایک بھی اپنی ذمہ داری سے آگاہ نہیں! حکومتیں موجود ہیں لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک بھی اسلام کے جامع و مانع نظام سیاست و معیشت کی نمائندہ "امتہ وسطہ" بن کر دنیا کے دوسرے سیاسی و معاشی نظامات کے بالمقابل "شہادت علی الناس" کا حق ادا کر رہی یا اسلامی سیاسیات و معاشیات کی عملی گواہی دے رہی ہے، صد فی صد کا کیا کہنا اگر یہ عملی شہادت کسی محسوس و معتبرہ درجہ میں بھی کہیں کار فرما ہوتی تو وہ اپنی ذات میں انسان کی انفرادی و اجتماعی فطرت کے مختلف و متضاد عناصر و مطالبات کی ایسی متوازن جامعیت و مصالحت کی حامل ہوتی کہ نام نہاد اشتراکیت و جمہوریت کے ہنگاموں میں بھی اس کو مسلسل و مستقل طور پر نظر انداز کرتے رہنا انسانیت کیلئے عملاً ناممکن ہی ہوتا۔

خود محکوم مسلمان بھی حاکم قوم پر اسی طرح کم و بیش تمام چھوٹے بڑے غیر مسلم ملکوں اور اپنی ایمانی سیرت اثر انداز ہو سکتے ہیں حکومتوں میں مسلمان ایک بین اقوامی قوم کی حیثیت میں اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ محکومی کی معذوریوں کے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ اسلام کے خدا پرستانہ انفرادی و معاشرتی معاملات و اخلاق کا حق ادا کر کے نہ صرف خود حاکموں کے لئے اسلامی تفوق و برتری کے عملی گواہ بن سکتے تھے بلکہ دنیوی زندگی کے اعتبار سے بھی ہر جگہ ذلت و کمتری کے بجائے خود حکومت و حاکم قوم کے دلوں میں عزت و وقعت کی جگہ حاصل کر سکتے ہیں، ہونہیں سکتا کہ بڑی سے بڑی

اکثریت و حکومت میں پھنس کر بھی مسلمان اگر مقدور بھراپتی انفرادی و جماعتی یا سماجی زندگی میں خدا و آخرت کے ایمان پر مبنی صالح زندگی کے معاملات و اخلاق اور معاشرت میں عملاً اسی طرح گواہی دیتے رہیں کہ گھر میں بھی مومن صالح ہوں اور باہر بھی اپنیوں میں بھی پرائیوں میں بھی، دوستوں میں بھی، دشمنوں میں بھی، کچھری میں بھی، دفتر میں بھی، اسکول و کالج میں بھی، دکان و بازار میں بھی، تو کیا کوئی متعصب سے متعصب اکثریت و حکومت بھی اُن سے مسلسل غیر متاثر رہ سکتی یا اُن کو مستقلاً نظر انداز کر سکتی ہے، جس قوم و ملک کے لوگوں کو بھی دن رات یہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ مسلمان نام ہی اس کا ہے جو دنیا کے نفع و ضرر سود و زیاں سے کہیں زیادہ اپنی زندگی خدا کی رضا و ناراضی یا آخرت کی فلاح و خسران کے ماتحت بسر کرتا ہے اور اس لئے اس کو دنیا کی حکومت اس کے قانون و عدالت فوج و پولیس، قید و بند کا خوف ہونہ ہو وہ کھلے چھپے، اندھیرے اجالے، شہر و پرانے کہیں کسی حال میں بھی راستی و راست بازی، حق پسندی و فرض شناسی کی راہ سے منحرف ہونا گوارا نہ کرے گا، اُن کو چار و ناچار مسلمانوں پر اعتماد و اعتبار اور لازماً خود ان کی اور ان کے دین دونوں کی عزت و رعایت کرنے پر دیر و سویر مجبور ہونا پڑے گا۔

اس کی چند تاریخی مثالیں | یہ نری قیاسی و فرضی بات نہیں، ماضی کے آئینہ میں اب بھی کہیں کہیں ایسے مسلمانوں کی صفات و شفاف صورت دیکھی جاسکتی ہے، چوتھی صدی ہجری کا ابن حوقل نامی ایک سیاح بہت سے ایسے ملکوں اور علاقوں کا

جہاں غیر مسلموں کی اکثریت وغلبہ ہے چشم دید تجربہ لکھتا ہے کہ

”ان ہی علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی جن کی پارسائی اور

اخلاقی برتری کا حال یہ ہے کہ اپنے مقدمات میں غیر مسلم طبقات کے افراد بھی

عمومًا ان کو اپنا گواہ مقرر کر کے حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور مقدمہ کا فریق

ثانی بھی ان کی شہادت کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے کبھی کسی خاص

گواہ کی گواہی پر فریق ثانی کو اگر اعتراض بھی ہوتا ہے تو اس کی جگہ گواہی میں پھر

مسلمان ہی کو پیش کیا جاتا ہے اور اسی کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے“

دیکھا آپ نے یہ شہادت علی الناس کی کیسی لفظی و معنوی شہادت ہے پھر جس امت

یا جماعت کے متعلق بھی لوگوں کو علانیہ دن رات کے معاملات میں یہ تجربات ہوتے

رہتے ہوں کہ وہ خدا و آخرت کے ایمان پر اپنی تقویٰ یا ”پارسائی اور اخلاقی برتری“ والی

زندگی میں اپنی والی کوئی کوتاہی روا نہیں رکھتے خواہ اس کی قیمت ان کو دنیا کے

جان و مال ضرر و نقصان ہی کی چھوٹی بڑی صورتوں میں ادا کرنی پڑتی رہے تو بالآخر

ان کے اس دین و ایمان کی رعایت ہر اس حکومت و اکثریت کو بھی کرنا پڑے گی جس میں

انسانیت یا انسانی شرافت کی کوئی رفق زندہ ہے، ابن سہول ہی کا بیان ہے کہ

”ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم و فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے

جب تک کہ ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہوں ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ

کا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں

خواہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔“

خود ہندوستان کے کسی ساحلی علاقہ بلہرا کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس علاقہ میں کچھ مسلمان بھی آباد ہیں ان مسلمانوں پر بلہرا کی طرف سے وہی آدمی حاکم ہو سکتا ہے جو مسلمان ہو، بلہرا کا وہ ان مسلمانوں پر نمائندہ ہوتا ہے۔“

دیکھنے کی بات وہی ہے کہ خالق و مخلوق خدا و انسان دونوں کی طرف

سے یہ معاملہ ہمارے جیسے نام کے خالی نسلی و قومی پائزے بے جان نماز روزہ وانے مسلمانوں کے ساتھ نہ تھا، بلکہ ان کے ساتھ جو دوست و دشمن مسلمان و غیر مسلمان سب کے ساتھ فلاح و تقویٰ یا پارہ سائی اور اخلاقی برتری کی عملی شہادت مسجرو مصلیٰ سے باہر زندگی کے دنیوی معاملات میں دیتے پائے جلتے تھے اور سچ پوچھنے تو ایسے ہی مسلمانوں کو اس دعویٰ کا حق تھا کہ وہ ”کسی حکم و فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم نہ کرتے“ جب تک وہ ان کی خداداد آخرت والی زندگی کو فساد و خسران سے بچانے والا نہ ہو، یہ تو ماضی میں خیر امتہ کے شہداء علی الناس ہونے کے ثمرات کی ایک جھلک تھی، اب ذرا اس کے بالمقابل حاضر کے آئینہ میں ہم اپنی صورت دیکھیں اور پہچانیں۔

۱۵ یہ تینوں اقتباسات مولانا سید مناظر حسن صاحب گیلانی رح کی مختصر مگر بڑی سبق آموز کتاب ”ہزار سال پہلے“ سے منقول ہیں۔

البتہ چند صالح افراد سے ساری امت | مستثنیات کا ذکر نہیں، کہ بڑے بھلے مستثنیٰ افراد سے  
 ”خیر امت“ نہیں بن سکتی! | نہ کوئی جماعت یا امت خیر امت بنتی ہے نہ شہر امت

بہتر سے بہتر جماعت و معاشرہ میں بدتر سے بدتر اور بدتر سے بدتر سوسائٹی میں بہتر  
 سے بہتر کچھ نہ کچھ اشخاص پائے جاسکتے بلکہ ضرور پائے جاتے ہیں، مگر سیکڑوں  
 ہزاروں میں دو چار بڑوں کی برائیاں مجموعی سماج کے دباؤ میں سراٹھاپاتی ہیں اور نہ دو  
 چار بھلوں کی بھلائیاں کسی سماج کو دوسرے سماج والوں کی نظر میں کوئی موثر سبق آموز  
 مثال و نمونہ بنا سکتی ہیں، امت من حیث الامت کی خیریت و شریعت کا مدار اس میں  
 خیر یا شر کے کما و کیفاً محسوس و مشاہد غلبہ ہی پر ہوتا ہے۔

”امت مبعوثہ“ کی | جس امت پر ساری امتوں اور قوموں کی فلاح و اصلاح کے  
 موجودہ زبوں حالی | لئے خیر امت بننے اور بنے رہنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس لئے  
 ایمان و عمل صالح کی پوری ظاہری و باطنی زندگی میں کیفیت و کم ہر اعتبار سے اپنی  
 ایمانیت و صالحیت دونوں کو اس طرح مسخ و پامال کیا ہے کہ ایمانیت میں  
 کھلی کھلی کفرانہ و شرکانہ باتوں سے لیکر اعمال خصوصاً معاملات و اخلاق اور معاشرت  
 کا شاید ہی کوئی فساد و گندگی ہو جس میں ہمارے عوام ہی نہیں خواص تک دوسری  
 امتوں یا قوموں سے زیادہ ہی لت پت نہ ملتے ہوں۔ توحید جو سارے ایمانیت کا  
 جوہر اور ساری طاعات و حسنات کی جڑ (لا اس الطاعات و بلاک الحسنات) ہے  
 اور جس سے مراد توحید الہیہ یعنی وہی زندگی کے پورے کاروبار اور تمام انفرادی

اجتماعی شعبوں میں ہر نفع و ضرر و سود و زیاں کو تداپیر و اسباب سے نظر بلند کر کے بالکل فی الواقع صرف مسبب الاسباب خدائے واحد کے ہاتھ میں شعوری طور پر دیکھنا کتنے ہم میں ہوں گے جن کی نظر اسباب سے آگے جاتی ہو یا جو جائز و ناجائز کی بحث کے بغیر اسباب پرستی کی دوڑ میں مسبب الاسباب کے قطعی منکرین سے پیچھے رہتے ہوں، اسی طرح ہمارا ایمان بالآخرت کتنوں کو اس پر آمادہ کر پاتا ہے کہ وہ آخرت کے نفع و ضرر کو دنیا کے نفع و ضرر پر مقدم رکھتے ہوں اور کیسے رکھ سکتے ہیں جب ہمارے علم و شعور پر بھی دنیا کی ظاہری زندگی منکرین آخرت ہی کی طرح اس درجہ چھائی ہوئی ہے کہ کسی دوسری زندگی کا خیال کسی کو بھولے ہی سے آتا ہوگا۔

يَجْمَعُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ (نح: ۳)

مسلمان ہونا الگ رہا میں تو کہا کرتا ہوں کہ توحید و آخرت کو بھول بھلا کر انسان بجز درندہ و حیوان کے کچھ رہ ہی نہیں جاسکتا، اس کا ثبوت بے خدا و آخرت کی روز افزوں ماڈرن زندگی کی روز افزوں درندگی و حیوانیت سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ فرد فرد جماعت جماعت قوم قوم سب ہی ایک دوسرے کو کھا اور نگل جانے کے تاک میں لگی ہیں۔ یہاں تک کہ ”پرامن بقائے باہم“ کی دعوت بھی سچ پوچھے تو کمزوروں کی طرف سے اسی ڈر میں ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے زور آزاؤں کی زور آزمائی میں ہماری خیریت نہیں خود اپنے گھر سے اپنے سے کمزوروں کو دبانے اور نکلنے میں یہ بھی کب کس سے پیچھے ہیں وہ تو کہتے کہ انبیائی تعلیم کی بچی کھچی اخلاقی قدریں اب

بھی کچھ نہ کچھ افراد و اقوام سب کے دلوں میں ظلم و زیادتی حق و انصاف امن و امان کی تھوڑی بہت بھلائی برائی جمائے ہوئے ہر ملک و معاشرہ میں کچھ نہ کچھ انفرادی و اجتماعی درندگیوں کے مقابلے میں سپر نی ہوتی ہیں، نہیں تو خدا و آخرت سے انکار و غفلت کی بدولت انسانی بستیوں کے اشتراکیت و جمہوریت کی چکی کے پاٹوں کے درمیان پس جانے کے سامانوں میں کسری کیا رہ گئی ہے، بلکہ اشتراکیت و جمہوریت کا حاصل ہی اس کے سوا کیا ہے کہ جس جتھے کے ہاتھ میں حکومت و اکثریت کی لاٹھی آجائے ہر محکوم اور بڑی سے بڑی اقلیت کی بھینس بھی اسی کی ہے، یا پھر وہی اجتماع و شورش ہنگامہ پسندی و بدامنی کا زور و دباؤ و خواہ وہ نام تہادستینہ گرہ اور من برت ہی کی انفعالی صورت میں ہو لاٹھی والوں کو بھی حق و انصاف کی نہیں موقع و مصلحت کی خاطر تھوڑا بہت قبول ہی کرنا پڑتا ہے، جب انسان کی شخصی یا جماعتی من مانی رائے و خواہش کے باوجود حق و انصاف کا کوئی اور برتر معیار ہی نہیں تو اس سے چارہ ہی کیا ہے کہ جو شخص یا جماعت غالب آجائے وہ اپنی رائے و خیال کو حق و انصاف قرار دیکر مغلوبوں سے منواتی رہے اور خالی حق و انصاف کی دہائی خواہ وہ زبان و کلمہ ہی کے نام سے اور ساڑھے بیس لاکھ دستخطوں کی عرضداشت ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو اس کی صحیح جگہ ردی کی ٹوکری کے سوا کہاں ہو سکتی ہے۔

اس زبوں حالی کے اسباب کا اجمالی جائزہ | یہ تو موقع آجانے پر اپنی بھڑاس کا ایک جملہ معترضہ تھا کہ خدا و آخرت کا ایمان نکل جانے کے بعد دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اصل ذکر اس امت کا

تھا جس کے سپرد اس ایمان کی دعوت اور اسی پر عمل کی شہادت کی گئی ہے کہ یہ ایمان خود ہمارے اندر کس درجہ بے جان ہو کر رہ گیا ہے لازماً ”عمل صالح“ کی عملی شہادت کا بھی جو حشر مونا تھا وہ سامنے ہے ایمان باللہ کا اہم واقعہ مطالبہ حقوق اللہ یا نماز روزہ وغیرہ کے عبادتی اعمال صالحہ ہیں ان میں بھی سب سے مقدم نماز کو پورے دین کا ستون ٹھہرایا گیا ہے اس کا کمی یا عددی حال یہ ہے کہ شاید فی صدر دو چار سے زیادہ نمازیوں کی تعداد نہ ہو اور کیفی اعتبار سے یہ نماز کی صرف ویسی ہی صورت ہوتی ہے جو مسجد و مصلیٰ سے فواحش و منکرات سے باز رکھنے والی سیکڑوں کی ہزاروں میں ایک آدھ کی ہوتی ہوگی خصوصاً اخلاق و معاملات کی زندگی میں تو ہجرت گزاروں کو بھی بالعموم بے نمازیوں کے دوش بدوش ہی پائے گا۔ بلاشبہ مامور و مطلوب چونکہ نماز کی صورت بھی ہے اس لئے صوری فرض ضرور اتر جاتا ہے لیکن صورت بے حقیقت کے حقیقی دینی و دنیوی ثمرات سے تو بہر حال محروم ہی رہتا پڑے گا، یہی حال روزہ داروں کے روزوں کا عام طور سے بلے گا کہ وہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ والے تقویٰ کے اثرات سے عین روزہ کی حالت میں بھی خالی اور محض فاقہ کی صورت ہوتا ہے، اس کے بعد زکوٰۃ کو لیجئے تو اس کے ادا کرنے والے تو صوم و صلوة کے پابندوں میں بھی شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں البتہ یہ عجیب انمل بات ہے کہ حج کا شوق نسبتاً کچھ زیادہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے خواص تک میں پایا جاتا ہے یا ایسے عوام میں جو استطاعت اور زاد راہ کے حدود و احکام کا بھی پوری طرح خیال نہیں رکھتے، باقی ادب حج کا لحاظ یا ”فسوق و جدال“ سے بچنے کا اہتمام تو کچھ خاص خاص اللہ کے



بندے ہی کرتے ہوں گے، نذر و نیاز سجدہ و طواف بھی خالص اللہ ہی کے حقوق ہیں ان میں مزاروں، تعزلیوں وغیرہ کے ساتھ عوام اور جہلا ہی نے شرک کا معاملہ نہیں کر رکھا ہے علما تک کی پوری پوری جماعتوں نے ان مشرکانہ اعمال و افعال کو اپنا مستقل علمی و دعوتی مسلک بنا رکھا ہے۔ تن ہمہ دلغ دلغ شد، نپہ کجا کجا ہم۔

حقوق اللہ کے بعد حقوق عباد کے اعمال صالحہ پر آئیے تو یہاں میدان او بھی صاف قدم قدم پر ہی مجدد وقت حکیم الامتہ علیہ الرحمۃ ہی کا قول سامنے آتا رہتا ہے کہ نماز روزہ کی سچی سچی عبادات کے علاوہ زندگی کے تمام دوسرے شعبوں کو تو مسلمانوں کے کم و بیش تمام طبقوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال چھوڑا ہے، کہا تو بالکل بجا طور پر جاتا ہے کہ اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کا دین و قانون ہے، بلکہ دین و دنیا کی دونی قطعاً غیر اسلامی تصور ہے لیکن حقیقت حال یہ اپنوں پر ایوں کسی سے مخفی نہیں ہے کہ خود قرآن نے عین نزول کے وقت مسلمانوں کی جن دو قسموں کی نشان دہی فرمائی تھی، ہرید و نیا اور ہرید آخرت **مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ** (۱۵۲) اب ہمارے اندر دنیا کی زندگی اور معاملہ میں آخرت کی زندگی و فلاح کا ارادہ کرنے والے کتنے ہیں۔

گھر ہو کہ باہر، کچھری ہو کہ دفتر، کارخانہ ہو کہ بازار، اسکول ہو کہ کالج، ملازمت ہو کہ تجارت، وکالت ہو کہ ڈاکٹری و طبابت، استاد ہوں کہ طالب علم کہیں کسی جگہ کسی طبقہ و پیشہ والوں میں آپ بتا دے سکتے ہیں کہ مسلمان بحیثیت امت

جماعت دوسروں کے مقابلہ میں اپنی زندگی اور معاملات میں دنیا کے نفع و نقصان سے رتی بھر بھی زیادہ خدا کی رضا و نرااضی یا آخرت کے سود و زریاں فلاح و خسران کی پرواہ کرتے نظر آتے یا دیکھنے والوں کو دکھاتے ہوں کہ ان کی نظر حقوق و فرائض کی ادائیگی میں تنخواہ و اجرت پولیس و عدالت افسروں و عدالت کی نگرانی یا بازار پر سب سے کہیں بڑھ چڑھ کر حکم الحاکمین کی نگرانی اور آخرت کی جواب دہی پر ہے۔

اگر یہ کچھ نہیں تو پھر اللہ کوئی بتائے کہ مسلمانوں کی خیرامتہ ہونے کو دوسری امتوں یا قوموں والے کس طرح پہچانیں؟ نت نئی انجمنوں اداروں سے؟ اسکولوں کالجوں یا ان میں تعلیم پانے والوں کی کثرت سے؟ تقریروں تحریروں کی بھرمار سے؟ خطابتوں انشاپردازیوں کی زور آزمائیوں سے؟ تالیفات و تصنیفات کے انباروں سے؟ اخباروں و رسالوں کی بے شمار تعدادوں سے؟ خصوصی چمک بھڑک والے نمبروں سے؟ آئے دن کے جلسے جلوسوں سے؟ اپنی پرانی حکومتوں کے خلاف احتجاجوں شورشوں سے؟ مرن برتوں سنتیہ گریہوں سے؟ توکریوں چاکریوں میں عددی مطالبوں سے؟ سوان چیلوں کی دوسروں کے ہاں کیا کمی ہے؟ ان میدانوں میں وہ پہلے بھی آپ سے آگے تھے آج بھی اور غالباً آئندہ بھی رہیں گے۔

اس سے بڑھ کر غیروں ہی کی نقل و نقالی میں خود دین و مذہب کا نام اور ٹھپہ لگا لگا کر کم و بیش سال کے تین سو ساٹھ دن چھوٹے بڑے عرسوں، عرسی میلیوں ٹھیلوں، نیازوں، فاتحوں من گھڑت تہواروں اور اب روز افزوں میلادی

جشنوں کا جو دور دورہ ہے، ذرا ہم اپنے گریبانوں میں سر ڈال کر سوچیں کہ ان سے دوسروں کو ہماری اسلامیت کی اس کے سوا کیا شہادت ملتی ہے کہ ان کے یہاں دسہرہ ہے تو ہمارے ہاں محرم، ان کے ہاں دیوالی ہے تو ہمارے ہاں شبِ برات، ان کے ہاں جنم اسٹی ہے تو ہمارے ہاں میلاد، ان کے ہاں آئے دن نہان اور نہانی میلے ٹھیلے ہیں تو ہمارے ہاں عرس و عرسی میلے ٹھیلے، حد یہ کہ وہ جو کچھ مندروں میں کرتے ہیں وہی ہم کو مزاروں میں کرتا دیکھتے ہیں ہماری اس اسلامیت کو دیکھ کر دوسرے کیا ایسی انوکھی بات دیکھتے اور پاتے ہیں جس بنا پر ان کے اندر اسلام کی طرف کوئی کشش یا اس کی تعلیمات کی تحقیق و تجسس کے لئے کوئی چونک پیدا ہو۔

رہا محض طلبِ حق کا سوال تو کتنوں کو اس کی اتنی لگن ہوتی اور عملاً اتنی فرصت ہو سکتی ہے کہ وہ سارے دھندوں کو چھوڑ کر خالص حق جوئی کی نیت سے بیسیوں مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کرے اور پھر اسلامی ایمان اور عمل صالح کی برتری کو پا کر اس کی طرف جھکے، اس کے علاوہ آدمی کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ زبان و قلم سے کم اور مثال و نمونہ سے زیادہ سیکھتا اور متاثر ہوتا ہے۔

ننگوں کی نوآبادی یا کلب میں جب سب ننگے ہی ننگے ہوتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے کسی شرم و کجاظ یا کسی بدنامی و رسوائی کا سوال ہی کیا تاہم ظاہری معاملات میں کھلے خزانے بد معاہدگیوں اور علانیہ فسق و فجور کی باتوں میں بہتوں کا اب بھی کچھ نہ کچھ بدنامی و رسوائی کا خیال ہاتھ پکڑ لیتا ہے لیکن بد اخلاقیوں میں

غصہ، گرمی، بدگوئی و بدزبانی، سب و ستم کھلی کھلی شخی و فحاری خوشامد و چا پوسی وغیرہ کے علاوہ ریا و نفاق، بغض و حسد، نفس و نفسانیت، حرص و ہوس، خود غرضی و دنیا پرستی وغیرہ جن اخلاقی بیماریوں کا تعلق قلب و نیت کے باطنی محرکات سے زیادہ ہے، ان میں عوام تو عوام نمبر شاید خواص ہی کا زیادہ بڑھا ہوگا، ان سے بھی زیادہ قلبی و خفی معاملہ خالص دینی و روحانی فضائل اخلاق، اخلاص و للہیت، خوف و خشیت، صبر و شکر، تسلیم و رضا توکل و استغناء، اللہ کی اور اللہ ہی کے لئے محبت و عداوت وغیرہ کا ہے کہ ان کا خفا تو اب فنا و فقدان کی اس انتہا تک جا پہنچا ہے کہ خانقاہیں جو اخلاق کے ان باطنی فضائل و کمالات ہی کی خصوصی تربیت گاہیں تھیں وہاں بھی مشکل ہی سے کہیں کوئی نشان ملتا ہوگا۔

اسلام کی تبلیغ و تفہیم میں عقائد و عبادات سے کہیں زیادہ اہم معاملات و اخلاق ہیں | عقائد و ایمانیات برے ہوں یا اچھے اسلامی ہوں یا غیر اسلامی ان کا تعلق تمام تر قلب و

باطن سے رہتا ہے عبادات کی صورت میں ان کا جو کچھ یا جس طرح ظہور ہوتا ہے اس کا بھی تعلق عام مخلوق کے بجائے زیادہ تر عبید و معبود یا بندہ و خدا کے درمیان محدود رہتا ہے اور مذہب کے متعلق جو یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ آدمی کا اپنا ذاتی و شخصی یا نجی معاملہ ہے یہ بھی انھیں مذاہب و ادیان والوں کی نسبت درست ہے جنہوں نے غلط یا صحیح طور پر اپنے دین و مذہب کے تصور کو کچھ خاص عقیدوں اور ان کے مناسب پوجا پاٹ یا پرستش کی خاص خاص عبادتی رسموں کے اندر محدود کر رکھا ہے، باقی

اسلام جس کے دینی احکام نے انسان کی انفرادی اجتماعی تمدنی و تہذیبی اخلاقی و معاشرتی، سیاسی و معاشی پوری دنیوی زندگی کو گھیر رکھا ہے وہ نہ کسی فرد کا کوئی انفرادی و ذاتی معاملہ ہو سکتا ہے اور زندگی کے دنیوی معاملات سے الگ کر کے علماً و عملاً اس کے تصور و نمائندگی کا صحیح حق ادا ہو سکتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے دیکھتے تو اسلام کو سمجھنے سمجھانے پہچاننے پہچنوانے دونوں کے لئے عقائد و عبادات دونوں سے کہیں اہم و اقدم مسئلہ معاملات و اخلاق اور معاشرت ہی کا ہو جاتا ہے، بلکہ معاشرت کا معاملات و اخلاق سے بڑھ چڑھ کر، اس لئے کہ لین دین وغیرہ کے معاملات تو ہر روز ملنے جلنے والے سے پیش نہیں آتے اخلاق میں بھی بڑے بھلے باطنی اخلاق یا دل کی خوبیوں خرابیوں کا تجربہ زیادہ طویل سابقہ ہی سے ہوتا ہے بخلاف معاشرت کے کہ گھر باہر سفر و حضر جہاں کہیں جب جس حیثیت میں بھی آدمی آدمی سے ملتا ہے تو میل جول یا نفس آدمیت کی برائی بھلائی سے تو کہنا چاہئے کہ ہر آن ہی سامنے آتی رہتی ہے جس میں مذہب و ملت رشتہ و قرابت ذات پات دوستی و محبت وغیرہ کے تمام تعلقات سے قطع نظر کر کے انسان کا صرف انسان کی حیثیت میں تجربہ ہوتا رہتا ہے اسی کا نام انسانیت یا آدمیت ہے۔

اس انسانیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کیا حیوان کو بھی ہماری ذات یا کسی چھوٹی بڑی حرکت سے بلا وجہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف و اذیت بھی نہ پہنچنے

پائے، ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ میں اس انسانیت کی اہمیت و وسعت کا اندازہ اسلام کی نظر میں اس سے کرو کہ راستہ سے کسی ایسی چیز کا ہٹا دینا جس سے چلنے والوں کو تکلیف کا احتمال ہو اس کو بھی خود ایمان کا ایک شعبہ یا لازمہ قرار دیا گیا ہے اور جس کا اجر بھی دنیوی نہیں خالص دینی و اخروی اتنا عظیم ہے کہ حدیث ہی میں آتا ہے کہ کسی نے راہ میں کوئی پرخار شلخ پڑی دیکھ کر اس کو ہٹا دیا تاکہ راہ گروں کو تکلیف نہ ہو تو اسی پر اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا تکلیف سے بچانا ہی نہیں رحمت پہنچانا بھی اسلامی معاشرت کا اتنا وسیع و عظیم باب ہے۔

کسی کا دل خوش کرنے کے لئے کوئی خوش کن بات کہہ دینا روپیہ پیسہ کی خیر و خیرات ہی کی طرح ایک کار خیر یا صدقہ (چیریٹی) ہے، متفق علیہ حدیث ہے کہ  
 الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ۔ حدیث ہی میں نہیں خود کتاب اسلام میں بھی قانون استیذان اور مجلس میں اٹھنے بیٹھنے راستہ میں چلنے پھرنے کی بعض انتہائی جزئیات معاشرت تک کے اوامر و نواہی موجود ہیں۔

۱۰ حکیم الامت کا تو بلا شرکت غیرے یہ خاص و خصوصی بڑا تجدیدی کارنامہ ہے کہ معاشرت کے احکام کو بعض حیثیات سے عقائد و عبادات و معاملات سب سے اہم و اقدم قرار دیا ہے، عقائد و عبادات سے تو اس لئے کہ ان میں خلل سے اپنا ہی ضرر ہے، اور معاشرت میں خلل سے دوسروں کا اور دوسروں کو ضرر پہنچانا اشد ہے اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے۔ اور معاملات پر گو معاشرت اس حیثیت سے مقدم نہیں کہ معاملات کے خلل سے بھی دوسروں کو ضرر پہنچا ہے مگر ایک دوسری حیثیت سے معاملات سے بھی اہم ہے، وہ یہ کہ عوام نہ ہی مگر خواص معاملات کو داخل دین سمجھتے ہیں اور معاشرت کو بجز خاص خواص کے بہت سے خواص بھی داخل دین نہیں سمجھتے (باقی صفحہ آئندہ)

عہ جامع المجددین صفحہ ۵۰۰

غرض ذات و صفات کے اعتبار سے ہمہ گیر توحیدی ایمان باللہ اور ایمان  
بالآخرت کا تو یہ غیر منطک لازمہ و مطالبہ ہی ہے کہ اعمال صالحہ کے اعتبار سے بھی مسلمان  
کی زندگی ہمہ گیر ہو اور دوسری امتوں کے حق میں مسلمان خیر امت یا شہادتِ عمل

(تفسیر حاشیہ از صفحہ ۱۰۰ شنبہ) اور بعض جو سمجھتے بھی ہیں وہ معاملات کے برابر اس کو ہتم  
بالشان نہیں مانتے اور اس وجہ سے عملاً اس کی پرواہ کم کرتے ہیں :-

غرض معاشرت کا تمام اجزائے دین سے کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل  
الوجہ مقدم ہتم بالشان ہونا ثابت ہے مگر اس کے باوجود عوام کا تو بکثرت او  
خواص میں بھی بعض کا تو اس کی طرف خود عملاً بھی کم التفات ہے اور اگر کسی نے  
خود عمل کر لیا تو دوسروں کو خواہ وہ اجنبی ہو یا اپنے متعلقین ہوں ان کو روک  
ٹوک یا تعلیم و اصلاح کرنا تو مفقود ہی ہے۔

مفقود کیا معنی اکثر اچھے خواص و اکابر تو ان باتوں میں روک ٹوک کی سخت گیری تو کیا رواداری بلکہ الٹے  
تعلیم و تبلیغ کی نام نہاد حکمت ہی کے منافی جانتے ہیں، باقی عملاً اس پر عمل تو خاص خواص کیا صرف  
وقت کے مجدد تھا نویں ہی کے ہاں دیکھا فرماتے بھی تھے ”احقر بدتوں سے اپنے متعلقین کو ایسے  
مواقع پر زبانی احتساب کرتا رہتا ہے گو اس میں اتنی خطا ضرور ہے کہ بعض وقت مزاج میں حدت  
پیدا ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ معاف کرے اور اکثر وعظ میں ایسے امور کی تبلیغ کرتا ہوں،  
اور کیوں نہ کرتے یا محض (حدت مزاج) کی وجہ سے دین کے ایسے ہتم بالشان حصہ کی تجدید  
سے بے اعتنائی فرماتے جس کو عوام و خواص سب

”لوگوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال دیا ہے سمجھتے ہیں کہ نماز روزہ حج، زکوٰۃ،  
ذکر و شغل تلاوت قرآن نفلیں بس ان چند چیزوں کے متعلق احکام ہیں آگے جو  
چاہیں کرتے پھر بس، جس کے معنی آجکل آزادی کے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ تم کو ہرگز  
ہرگز آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا ہے مثل بھینسے اور سانڈ کے کہ جس کے گہروں چاہی کھائیں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۱۵ و ۱۶ جامع المجددین صفحہ ۵۱ و ۵۲ -

جب ہی بن سکتے ہیں جب عملی طور پر عقائد و عبادات یا دنیات سے بھی زیادہ معاملات  
 و اخلاق اور معاشرت میں اسلام اور رسول اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی  
 اور اسوۂ حسنہ کا کسی معتدبہ و نمایاں درجہ میں نمونہ ہوں، اس لئے کہ دیکھنے والے کو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) جس کے چنے چاہیں کھالیں، سو ہم کو ایسا نہیں چھوڑا گیا ہے  
 بلکہ شریعت نے ہماری رفتار، گفتار، نشست و برخاست، لین دین، کھانے پینے  
 ہر چیز سے تعرض کیا، شریعت مکمل قانون ہے۔

اس ”مکمل قانون والی شریعت“ کے مزاج شناس کی مجلس میں معاشرت کی بات بات پر احتساب  
 اور روک ٹوک کو دیکھ کر جن لوگوں نے بزرگی نام بے حسی کا سمجھ رکھا ہے (بلکہ بہت سے بزرگوں نے  
 خود ہی اس کو اپنا کمال سمجھ سمجھا رکھا ہے) ان کو حضرت کی مجلس میں بڑا اچنبھا ہوتا تھا کہ ہم تو  
 بہت بزرگوں کی مجلس میں گئے لیکن کہیں ایسی باتوں پر روک ٹوک نہیں دیکھی۔

ایسوں کو حضرت کا جواب سنئے کہ بھائی میں تو اپنی مجلس کو بزرگوں کی مجلس نہیں بنانا  
 چاہتا آدمیوں کی مجلس بنانا چاہتا ہوں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ شاہ صاحب بننا آسان، ملک التجار  
 بننا آسان، بزرگ بننا آسان، قطب بننا آسان مگر انسان بننا مشکل . . . . اور یہ بھی کہا کرتا ہوں  
 کہ بزرگ بننا ہو، ولی بننا ہو، قطب و غوث بننا ہو تو کیسے اور جاؤ اور اگر انسان بننا ہو تو میرے  
 پاس آؤ میں انسان بنانا ہوں۔

اس سلسلہ میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے کہ

زاید شدی و شیخ شدی و دانشمند این جملہ شدی و لے مسلمان نشدی

اور چونکہ مسلمان ہونا ہی عین انسان ہونا ہے بلکہ بے مسلمان ہونے انسان ہونے کے کوئی معنی ہی  
 نہیں آسکتے دوسرے مصرع میں تصریح فرمادیتے کہ ”این جملہ شدی و لیکن انسان نشدی“ اور خود اس  
 تقابلی ”انسان گر“ میں ”اسلامیت“ والی انسانیت کا جیسا جمال دیکھا اس کو آنکھیں ڈھونڈھتی اور  
 ترستی ہی رہیں خدا بھلا کرے ہمارے مولانا دریا آبادی سلمہ کے کمال قلم کاری کا کہ اس نے انسانیت و  
 اسلامیت کے اس جامع مرقع کو جہانتک کوئی قلم محفوظ کر سکتا ہے الحمد للہ کہ دوسروں کیلئے بھی  
 حکیم الامت میں خوب ہی خوب محفوظ فرمادیا ہے۔ احسن اللہ جزاء۔

لے جامع المجددین صفحہ ۵۰۲۔ ۵۳ ایضاً ۵۰۲ ۵۳ ایضاً ۳۶



ہمارے ایمانیات و عبادات سے زیادہ دکھائی زندگی کے یہی تینوں شعبے پڑتے ہیں، اپنے پرانے جانے انجانے سب کو گھر باہر سابقہ ہمارے معاملات اخلاق اور سب سے بڑھ کر معاشرت یا ہماری انسانیت سے پڑتا ہے اور ان سے چونکہ ہر شخص کا براہ راست ذہنی نفع و ضرر مفاد و مضار وابستہ ہوتا ہے اس لئے قدرۃً وہ ہمارے تلخ و شیریں عمل کے پھلوں ہی سے ہمارے ایمان کے درخت کو پچھانتے اور اس کی طرف بڑھتے یا اس سے بھاگتے ہیں۔ اسی عظیم و اہم حقیقت کو حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے اپنی تجریدی جامعیت کے قل و دل جامع الفاظ میں اس طرح واضح فرمایا ہے کہ

”وقوع میں اظہر و اکثر یہی تینوں (معاملات اخلاق اور معاشرت) ہیں کیونکہ عقائد کا حصہ گوارم یا لازم زیادہ ہے مگر اظہر نہیں (یعنی دل سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہ دوسروں پر زیادہ ظاہر نہیں ہوتا) اور دیانات کا حصہ خاص خاص اوقات میں ظاہر ہوتا ہے، پس وقوع میں اکثر نہ ہو بخلاف اس کے آخر کے تینوں اظہر بھی ہیں اور اکثر بھی۔“

اس بنا پر دیکھنے والوں کو اکثر اذرا امت میں یہ انقلاب عظیم ہر وقت ہی نظر آئے گا تو جو شخص ہر وقت یہ انقلاب عظیم دیکھے اور پھر یہ دعویٰ سنے کہ میں محمد کی امت میں ہوں تو وہ شخص حیرت میں واقع ہوگا کہ یا اللہ یہ شخص کس بات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے جو ایسا دعویٰ کرتا ہے۔“

جب تک امتِ مسلمہ خود کو "خیر امت" کے معیار پر | مطلب وہی ہو کہ جب بحیثیت امت،  
 نہیں پہچائے گی انسانیت خسران سے نہیں بچ سکتی!! | امتِ محمدیہ کے وہ مرنی اعمال و اخلاق

جو دوسروں کو دکھائی دیتے اور جن سے ان کو زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، جب ان میں  
 محمدی اسوہ حسنہ یا ایمان باللہ و بالآخرت پر مبنی اسلامی اعمال صالحہ کا کوئی مرنی و  
 محسوس مشاہدہ کیا معنی اُلٹے دن رات خلاف ہی شہادت ملتی رہتی ہے تو پھر دوسری  
 امتوں یا قوموں کے لئے ہم مسلمانوں کے اندر خیر و فلاح کا کونسا سبق رہ جاتا ہے جس کی  
 بنا پر ان کو اسلام کی طرف کوئی جذب و کشش ہو، جب تک ہی بے نمک ہو کر رہ گیا  
 ہو تو دوسری چیزوں کو نمکین کہاں سے بنایا جاسکتا ہے۔ ختم نبوت کے بعد خیر امت کے  
 مقام پر جس امت کو کھڑا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ پوری انسانیت کے حق میں روشنی  
 کا بینار بن کر قولا و عملاً خیر و معروف کا راستہ دکھاتی اور شر و منکر کی گمراہیوں سے بچاتی  
 رہے، جب وہی من حیث الامت کم و بیش ہر طرح عملاً "شیر امت" بن کر رہ گئی تو پھر دنیا  
 بھر میں اب گھٹا ٹوپ اندھیرے پر اندھیرا چھاتے جانے میں تعجب کی بات ہی کیا اور  
 انسان کو انسان بنانے یا زبان و خسران سے بچانے کی صورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔  
 سب سے زیادہ سوچنے سمجھنے کا سوال یہ ہے کہ جس دین کامل نے اپنے ماننے  
 والوں پر صرف اپنے ایمان و عمل کی جو ابدی عائد نہیں کی بلکہ "خیر امت" بن کر دنیا کی  
 تمام دوسری امتوں یا قوموں کی فلاح و اصلاح کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے، اس نے  
 کیا خیر امت بننے اور بنے رہنے کا کوئی نظم و نظام نہ عطا فرمایا ہوگا؟ آگے انشاء اللہ

اسی سوال کا جواب آتا ہے۔

یہ جواب دہی ”تواصی بالحق“ یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایسا ہمہ گیر نظام و انتظام ہے کہ گویا ہر اپنا پرایا امت کا کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی طبقہ اپنے محل و مقام کے مناسب اس کے افادہ و استفادہ سے باہر اور محروم نہ رہنے پائے۔ یہ جب ممکن ہے کہ کسی بڑے چھوٹے ملکی معاشرہ میں، ایک پوری کی پوری مستقل جماعت کا کام اسلامی زندگی و شریعت کے ہر شعبہ کے احکام ————— جن میں ظاہر ہے کہ خود معروف و منکر کے امر و نہی کے احکام بھی داخل ہیں ————— ان کی تحصیل و تعلم اور پھر عمر بھران کی قولاً و فعلاً دعوت و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ ان کا خاص دینی و منصبی فریضہ ہو، سورہ آل عمران کی مشہور و معروف آیت ہے کہ

”یہ امر نہایت ضروری ہے کہ تمہارے اندر ایک ایسی جماعت موجود رہے جو لوگوں کو خیر (یا بھلائی) کی طرف بلاتی اور معروف (یا نیک کاموں) کے کرنے کی تاکید کرتی اور منکر (یا برے کاموں) سے روکتی رہے۔“

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ  
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ  
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

(۳۳)

یہی دعوت خیر اور معروف و منکر کا امر و نہی حضرات انبیاء اور نبی الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاص انبیائی و منصبی فریضہ اور ان کی بعثت کا خصوصی مقصد اور مشن تھا، اس میں وہ کامیابی و ناکامی کے نتائج سے قطع نظر کر کے بھی زندگی بھر لگے رہتے

کے لئے نامور تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھو کہ باوجود اور بظاہر اس انتہائی ناکامی و ہمت شکنی کے کہ لوگوں کو جتنا بلاتے ہیں اتنا ہی وہ بھاگتے ہیں (لَمَّا يَزِدُّهُمْ دُعَايَ الْكَافِرِ اِرَادًا) پھر بھی لگے سیکڑوں سال کی طویل عمر پا کر عمر بھر دن رات بلانے (دعوت و تبلیغ) ہی میں رہے (دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا) یہی حال تمام حضرات انبیاء کا رہا کہ ان کی زندگی کا پیش بہاد نہ کھانا کمانا ہوتا ہے، نہ اہل و عیال، نہ ملک و مال اور نہ نام و تہاد سیاسیات و معاشیات کی کوئی دعوت رعایت بلکہ اس کے بجائے تمام تر معادیات کی فلاح و خسران کے مد نظر ایمان و عمل صالح کی ایک ہی دعوت ہے جس کی طرف بلانے کی لگن ہے، تَن مِّن دَهْنٍ سَبَّحَ بِهَا سُبْحَانَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ اَسْمَاءُ طَيِّبَاتٌ لِّمَن لَّا يَرْجُو كِبَارًا وَرَبَّهُم بِحُجُبٍ مُّحْدَمَاتٍ سَتَرْنَا عَنْهُمْ آيَاتِنَا لَعَلَّ يَفْقَهُوْنَ شَيْئًا

اسی پر لگ رہی ہے، اسی سلسلہ میں کسی کسی کو استثنائی طور پر دولت و حکومت بھی کسی خاص غیبی حکمت و نصرت کے تحت عطا ہو گئی، ورنہ زیادہ اور بہت تعداد ایسے ہی انبیاء علیہم السلام کی ہے جن کو جاہ و مال، دولت و سلطنت سے دور کا بھی کوئی لگاؤ نہیں ملتا، قال و حال، علم و عمل دونوں سے اپنی والی ساری جدوجہد بس پہنچانے ہی پہنچانے یا "رسالت و پیغام بری" کا فرض ادا کرنے ہی کی رہی، خواہ کوئی سننے نہ سنے، ماننے نہ مانے، ایسے بھی گزرے ہیں جن کی دعوت و پیغام کو ماننے سننے والا ایک بھی معلوم نہیں۔

علماء کی خصوصی ذمہ داری | اسی دعوت خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی انبیائی اور ان کا امتیازی مقام | وراثت کے وارث براہ راست امت کے علماء ہوتے ہیں

العلماء ورثة الانبياء — امام غزالی نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ  
 ”درجۂ نبوت کے زیادہ سے زیادہ قریب اہل علم اور اہل جہاد ہوتے ہیں“ اہل علم اس لئے  
 کہ وہ رسولوں کی لائی ہوئی باتوں کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اہل جہاد  
 اس لئے کہ وہ رسولوں کی لائی ہوئی چیزوں کو قائم کرنے کے لئے تلوار سے کوشش کرتے  
 ہیں۔ خصوصاً ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ کے علماء اپنے کام و مقام کے لحاظ سے  
 انبیاء ہی کی حیثیت رکھتے ہیں، علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل — بلکہ امام غزالی  
 ہی نے وَاِذَا اخَذَ اللهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ اٰتَوْا الْكِتٰبَ (۲۴۸) کی ایک تفسیری  
 حدیث نقل فرمائی ہے جس کی بنا پر علماء کی حیثیت انبیاء اور ان کے ورثا کی کیا معنی  
 خود براہ راست اللہ تعالیٰ سے انبیاء ہی کی طرح اسی ميثاق و معاہدہ کی ہے کہ ”جو کچھ  
 علم انہوں نے حاصل کیا ہے اس کو چھپا کر نہ رکھیں گے بلکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و تبلیغ  
 کرتے رہیں گے۔“

مقصد و طریق کا فرق | ذاتی علم و ایمان و تقویٰ کے اعتبار سے انبیائی حیثیت و وراثت  
 ملحوظ رکھنا ضروری ہے | کا مقام رکھنے والے علماء کی یاب ہونے پر بھی نایاب بحمد اللہ اب

لہ اقرب الناس من درجۃ النبوة و اهل العلم و الجهاد انا اهل العلم قد لو الناس  
 علی ما جاءت بالرسول و اما اهل الجهاد فجاہد و اباسیما فہم علی ما جات بہ  
 الرسل (اجیار العلوم باب فضیلة العلم)

۲۷ قال صلے اللہ علیہ وسلم ما اتی اللہ عالمًا علمًا الا و اخذ علیہ من الميثاق  
 ما اخذ علی النبیین ان یتبینوہ للناس ولا یکتونہ۔

بھی نہیں لیکن ایک بہت بڑی غلطی یا غلط فہمی خدا جانے کیسے راہ پاگئی ہے کہ دعوتِ خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کے اصل مقصد و خدمت کے بجائے، بہت زیادہ بلکہ کہتا چاہتے سارا زور اس کے وسائل و مقدمات پر اس طرح لگایا جا رہا ہے کہ گویا وسائل ہی مقاصد ہیں۔

حضرات انبیاءؑ نہ مدرسے قائم کرنے تشریف لاتے تھے، نہ کتب خانے کھولنے نہ کتابیں لکھنے، نہ رسالے نکالنے، نہ انجمنیں اور جماعتیں بنانے، نہ جلسے اور تقریریں کرنے بلاشبہ ان چیزوں سے وسائل کا ————— بہ نظر وسائل و بقدر وسائل ————— کام لینا وقتی مصالحوں و حالات کے لحاظ سے ضروری ہے لیکن مرجع و منتہا تو ہر وسیلہ یا راستہ کے ہر ہر قدم کا بالذات منزل مقصود ہی رہنا چاہئے، اس منزل و مقصد ہی کے اوجھل ہو جانے کا نتیجہ ہو رہا ہے کہ مثلاً درسوں پر مدرسے قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں، سیکڑوں ہزاروں کی تعداد ان سے فراغت کی سندیں لے لے کر نکلتی رہتی ہیں، باایں ہمہ حال حال ہی ان میں کسی کو اس کا شعور و احساس ہوتا ہوگا کہ یہ علم انھوں نے خود عمل کرنے اور دوسروں کو علم و عمل کے اسی خیر کی طرف بلانے یا معروف و منکر کے امر و نہی کے لئے حاصل کیا ہے، بڑا سبب اس کا وہی عام مغالطہ ہے کہ جس علم کا اصل مقصد خود عمل اور دوسروں کو دعوتِ عمل تھا وہ بطور ”علم برائے علم“ خود ہی مقصود و معبود بن کر رہ گیا ہے، علم بھی اس طرح کا کہ کتابوں کا ایک مقررہ نصاب پورا کر کے ————— خواہ کتابی استعداد بھی پوری نہ ہو ————— جو بھی



والتحیۃ کے ”اسوۃ حسنہ“ کی اتباع کا ذوق و ولولہ پیدا ہوتا بلکہ صحیح ایمانی و اسلامی خودی و خودداری کی تربیت ہوتی۔

ہمارے دینی کام بھی | دینی مدارس ہی پر کیا موقوف، دینی تصنیف و تالیف، تخریر و انبیائی روح سے محروم ہیں | تقریر، مجالس و مجالس سب کی حیثیت انبیائی وراثت و تراثت کی جگہ بالعموم دنیوی پیشوں کی طرح زیادہ سے زیادہ بس دینی پیشوں کی ہو کر رہ گئی ہے، جو وسائل بھی مقاصد کی روح سے خالی ہو جائیں بے جان پیشہ و رسم ہی بن کر رہ جاتے ہیں، نتیجہ ایک ہی ہے کہ ہمارے خالص دینی دارالعلوموں کی بے جان مشینوں کے ڈھالے ہوئے علما بھی اکثر خالص دنیوی اسکولوں، کالجوں کے تعلیم یافتوں کی طرح اپنے علم دین سے بھی زیادہ تر دنیا ہی کے کسب و حصول کی راہیں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں یا جو تھوڑے بہت دین ہی کے نام سے تقریری و تخریری علمی و تعلیمی بلکہ دعوت اصلاح کی بالکلیہ انبیائی خدایات میں لگ بھی جاتے ہیں وہ بھی انبیائی روح و ارادہ سے دور ہی ہوتے ہیں۔

اچھے اچھے علما و مخلصین بھی آج غیر شعوری طور پر | انبیائی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو خدا و دنیا پرستانہ دعوتوں سے مرعوب ہیں! | آخرت پر غیر متزلزل ایمان و ایقان یا ان کا نہایت زندہ اور جاندار تعلق و تصور ہوتا ہے، زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام میں ان کی نظر تمام تر خلق کے بجائے خالق اور دنیا کے بجائے آخرت پر ہوتی ہے، یہی راز ہے کہ ان کی دعوت و اصلاح کا رخ براہ راست نہ معاشیات و سیاسیات کے کسی خاص



نظریہ و نظام کی طرف ہوتا ہے، نہ کسی خاص تہذیب و تمدن یا ثقافت کے وہ داعی و مبلغ ہوتے ہیں کہ یہ دراصل ہرکچھ کے دنیوی زندگی ہی کی دعوت و رعایت ہے بنگراب ہمارے اچھے اچھے علم و اخلاص والے علما و صلحا تک مغرب اور مغرب پرستوں کی ان دنیا پرستانہ دعوتوں سے غیر شعوری طور پر اتنا مسحور و مرعوب ہیں کہ ان کی تقریروں و تحریروں میں ثقافت و انسانیت، سیاست و معیشت کے ورد و تکرار کے مقابلہ میں خدا و آخرت کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا بھی ہے وہ اس طرح لپیٹ میں گویا (معاذ اللہ) شراب شرمی کہ دین بزاروں کی نظریں کہیں خدا نخواستہ یہ "ملازم" کے مجرم نہ ہو جائیں۔

ہمارے مخلصین و صادقین کی یہ کمزوری بھی دراصل دین بزار مغرب کے سیاسی غلبہ و پروسیپیڈہ کی ساحری ہے کہ نادانستہ خالق کے مقابلے میں خلق اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا ان کی نظروں میں بھی اتنی سما گئی ہے کہ خدا و آخرت پس پشت پڑ جاتی ہے یا پھر اس حکمت و مصلحت میں ایسا غلو ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا پرست اپنی دنیا ہی کی خاطر دین کی ضرورت کو کچھ تسلیم کر لیں، نیک نیتی کے ساتھ دنیا کے لالچیوں کے حق میں اس مصلحت کی مناسب رعایت قابل ملامت ہرگز نہیں، بشرطیکہ خدا و آخرت کے ذکر و تذکرے سے یہ مصلحت علانیہ طور پر مغلوب نہ نظر آئے حضرات انبیاء کی خاص شان یہی ہے کہ ان کی دعوت میں خدا و آخرت کے سوا بالذات کسی دوسری شے کے مطلوب و مقصود ہونے کا شائبہ و شبہ تک راہ نہیں پانا، نہ ان کی نظر کسی

اجروصلہ کے لئے قطعاً غیر اللہ پر پڑتی ہے اور لَا اسْتَكْمَلُ عَلَيْهَا مَا لَهَا لِانْ اَجْرِي اِلَّا  
 عَلَى اللّٰهِ (۱۱۱) کا جو یہ تکرار مختلف انبیاء سے اعلان کرایا گیا ہے سچ پوچھتے تو ان کے  
 اس قال کا قدم قدم پر ان کے حال میں تجربہ ہی ان کی نبوت کی سب سے بڑی شہادت  
 ہوتی ہے کہ غیر معاند انسانی فطرت کے لئے اس کا دور کرنا آسان نہیں ہوتا۔

دینی مدارس میں قال سے بڑھ کر ہمارے دینی مدارس اور اداروں میں بھی جب تک قال  
 حال کی تربیت ضروری ہے کی تعلیم کے ساتھ اس سے بڑھ کر حال کی اس تربیت کا

پورا اہتمام نہ ہوگا اس وقت تک نہ وہاں کا علم میراث انبیاء ہوگا، نہ وہاں سرورائت  
 انبیاء کا حق ادا کرنے والے علماء پیدا ہوں گے۔ نبوت کا وارث تو وہی عالم ہے جو  
 کتابوں سے کہیں زیادہ خود خدا کو جانتا اور اس کی ذات و صفات کا خالی کتابی نہیں  
 عالی علم رکھتا ہو جس کی پہچان ہی ہے کہ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و خشیت  
 اتنی غالب ہو کہ غیر اللہ سے امید و بیم اگر مفقود نہیں تو مغلوب یقیناً ہو، سرور انبیاء  
 (فداہ بانی و امی) کا ارشاد ہے کہ "میں تم سب سے زیادہ اللہ کو جانتے والا اور تم سب  
 سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ انا اعلمکم باللہ واخشاکم اللہ"

اسی حقیقت حال کا اظہار بلکہ خود اللہ ہی کے اس ارشاد کی ترجمانی ہی

کہ اللہ سے ڈرنے کا حق تو بس اس کے جاننے والے بندے ہی ادا کرتے ہیں۔

لَا تَمَّا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۳۵/۳۸) یعنی علم دین جس کی جان

خدا کو جانتا پہچانتا ہی ہے وہ مراد ف ہے، خدا سے ایسے تعلق کے جو زندگی کے سارے

اعمال معاملات میں خالق کی خشیت کو مخلوق و دنیا کے ہر اجر و صلہ خوف و طمع پر غالب کر دے، اسی حدیث کی تفہیم میں حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے ہماری نام نہاد دینی تعلیم و تعلم اور اس کے علماء کا کیسا حسرتناک حال بیان فرمایا ہے کہ

”علم کو میراث انبیاء کہا جاتا ہے، تو اب دیکھ لو کہ انبیاء کی میراث کو نسا علم ہے کیا انبیاء کا علم نعوذ باللہ ایسا ہی علم تھا جس میں محض مسائل و اصطلاحات کا تلقف ہو اور خشیت کا نام نہ ہو۔۔۔۔۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں، پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ اس طرح تعلیم و تعلم کو مقصود سمجھ لینا حد سے تجاوز ہے۔“

غرض مطلوب شرعی (یاد دینی) علم وہی ہے جو اپنے اثر کے ساتھ ہو جیسے تلواریں وہی مطلوب ہے جس میں کاٹ ہو، ورنہ برائے نام تلواریں ہوں گی،۔۔۔۔۔ اسی کو کہتے ہیں

علم چہ بود آن کہ رہ بنما پدیت	زنگ گمراہی زد دل بزوایدت
ایں ہو سہا از سرت پیروں کند	خوف و خشیت در دلت افزوں کند
تو نہ دانی جز بجز لایبجوز	خود نہ دانی تو کہ جوی یا عجوز <sup>لہ</sup>

قرآن محض کتاب ہدایت نہیں | کون نہیں جانتا کہ اب ہمارے علوم دین کے بڑے بڑے دارالعلوم بلکہ نظام ہدایت ہی! کے علم کا جائز زیادہ تر بس ”بجوز و لایبجوز“ کا علم ہی ہو کہ

رہ گیا ہے، خود اپنے قال کو حال بنانے یا ایمان و علم کو قلب و قالب کے اعمال صالحہ سے سنوارنے کے بعد بلکہ ساتھ ساتھ اب دیکھئے کہ اسی علم و عمل کی دعوت و اصلاح یا دوسروں تک اس علم کو پہنچانے اور ان کے عمل کو سنوارنے کے لئے خود کتاب و سنت نے کیا نظام عمل عطا فرمایا ہے، راقم عاجز ہمیشہ کہا کرتا ہے کہ کتاب اسلام صرف "کتاب ہدایت" نہیں، نظام ہدایت بھی ہے، یہ نظام کیا ہے؟ اور اس کو وقت کے زمانی و مکانی احوال و ظروف خصوصاً ہندوستان و پاکستان میں کیونکر بہ روئے کار لایا جاسکتا ہے، اس کا ایک پورا خاکہ تو ایک مستقل کتاب — تجدیدِ تعلیم و تبلیغ — میں پیش کیا جا چکا ہے، یہاں اس نظام کے ایک بڑے اور اہم جزو پر خصوصیت سے توجہ دلانی ہے کہ اصلاح و ہدایت کا سب سے مؤثر و کارگر جزو وہی ہے اور اسی سے سب سے زیادہ غفلت ہے۔

سورۃ وَالْعَصْرِ | سورۃ وَالْعَصْرِ اسی کی خاص تعبیر "تواصی بالحق و تواصی بالصبر" اس کی خاص تعبیر ہے اور کتاب و سنت کی عام اصطلاح امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے یعنی ہر جانی پہچانی بھلائی کا ایک دوسرے کو حکم و تاکید کرتے رہنا اور ہر چھوٹی بڑی بُرائی سے باز رہنے کی کوشش کرتے رہنا، خواہ اس کا بُرا بھلا ہوتا ہم نقل و شرع سے پہچانتے ہوں یا عقل و تجربہ سے، مسلمان جس طرح خود اس معروف کو پہچان کر اس پر چلنے اور منکر کو جان کر اس سے بچنے کا نامور و مکلف ہے اسی طرح دوسروں کو بتلانے چلانے اور بچانے کی امکانی جدوجہد کا فرض بھی اس پر

انفرادی و اجتماعی دونوں طرح عائد ہے اور جس طرح خود اپنے تیک و بد معروف و منکر کے معاملہ میں اس سے مواخذہ ہوگا، اسی طرح مقدور بھروسوں کو معروف پر چلنے اور منکر سے بچانے میں اس سے جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کا بھی جواب دہ ہوگا اور دنیا و آخرت دونوں ہی میں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ حضرت امام غزالیؒ کا اسی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب میں اچھا رالعلوم میں ارشاد ہے کہ

”دین کا یہ مدار اعظم ہے، یہی وہ مہم ہے جس کے لئے تمام انبیاءؑ بھیجے گئے، اگر اس کی بساط اٹھ دی جائے اور اس کے علم و عمل کو ترک کر دیا جائے تو نبوت ہی معطل و بے کار ہو جائے دین مضحل ہو جائے، سستی و گمراہی اور جہالت عام اور عالمگیر ہو جائے، ملک برباد اور مخلوق تباہ ہو جائے حتیٰ کہ پھر اس تباہی کا احساں تک (اتنا مر جائے کہ) قیامت تک نہ ہو۔“

اس کے بعد ان اللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر تہایت حسرت سے فرماتے ہیں کہ جس کا ڈر تھا آخر وہ ہو کر رہا یعنی

”دین کے اس مدار اعظم کا علم و عمل جانا رہا حقیقت بھی بالکل مٹ گئی، اور صورت بھی نتیجہ یہ ہے کہ دلوں پر مخلوق کی بدابہت و خوشامد چھا گئی اور خالق کا ڈر نکل گیا، لوگ نفس پرستی اور شہوت رانی میں جانوروں کی طرح آزاد ہو گئے روئے زمین پر ایسا سچا مومن ملتا دشوار ہو گیا جو خدا کے معاملہ میں بندوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔“

## معروف و منکر کے قرآنی نظام کے پنجگانہ اجزاء

۱۔ ایک مستقل جماعت یا امت در معروف و منکر کے اس قرآنی نظم و نظام کا سب سے پہلا  
 امت کی ضرورت! اہم و اقدم جز یہی ہے کہ اسلامی معاشرہ و امت میں

ہمیشہ ایک ایسی مستقل جماعت یا امت در امت موجود رہے جس کی زندگی کا خاص  
 و خصوصی مقصد اور مشن ہی یہ ہو کہ سب کام چھوڑ کر لوگوں کو خیر کی طرف بلاتی، معروف  
 کا امر اور منکر سے نہی کرتی رہے، یہی جماعت صحیح معنی میں علماء کی جماعت ہے جیسا  
 کہ اوپر اچھی طرح واضح ہو چکا۔ یہ جماعت جس طرح دنیوی یا معاشی علوم و فنون کے  
 بجائے طلب علم یا طالب علمی کی پوری زندگی دینی و معادی علوم و احکام کے  
 حصول میں صرف کرتی ہے اسی طرح فراغت کے بعد ان کی تمام عمر کا اصلی و منبصری  
 فریضہ سارے کاموں سے بڑھ کر بلکہ ان کو چھوڑ کر انبیائی وراثت کی یہی خدمت ہے  
 کہ ان علوم و احکام کی تعلیم و تبلیغ، اشاعت و دعوت اور امر و نہی میں لگے رہیں۔  
 جب ان ہی نے سب سے زیادہ دین اور دینی اوامر و نواہی کے علم کو حاصل کیا اور  
 ان کو جانا پہچانا ہے تو قدرۃً ان ہی کو سب سے زیادہ دوسروں کو پہچنوانے یا ان تک  
 پہنچانے کا حق بھی حاصل ہے اور لا زماناً ہی پر سب سے زیادہ امر و نہی کا فرض بھی عائد  
 ہے اور ان ہی کے اس حق کو علماً و عملاً کما حقہ ادا کرنے اور فرض کو پوری طرح  
 پورا کرنے سے امت کے باقی طبقات کو بھی احساس ہو گا کہ معاشی و دنیوی مشاغل

اور خود اپنے ایمان و عمل صالح کی فکر و اہتمام کے ساتھ ساتھ اپنے خاص زیر نگرانیوں  
 عزیزوں، دوستوں اور عام مسلمانوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہنا بھی  
 ان کے ایمانی و اسلامی فرائض ہی میں داخل ہے اور اپنے محل و مقام یا حدود کے  
 اندر کسی طرح اس فرض کو انجام دیتے رہنا چاہئے، جب حضرات علما "مَا أَسْأَلُكُمْ  
 عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجَرْتُمْ إِلَّا عَلَى رِبِّ الْعَالَمِينَ (الشعراء) کی استغنائی ہمت و  
 غرہیت کے ساتھ بلا درہمت اپنے اس فرض کو پاس پڑوس گاؤں، گاؤں، بستی بستی اور  
 محلہ محلہ زیادہ تر وعظ و تقریر یا اپنی مجلسوں میں خطاب عام و خاص کے ذریعہ مسلسل  
 فرماتے اور بار بار لوگوں کو جھنجھوڑتے رہیں گے، تب ہی جا کر پوری امت ملکی معاشرہ  
 کے ہر طبقہ اور ہر فرد کو بھی اس بارے میں اپنے اپنے انفرادی واجبات کا علم و احساس  
 ہوگا کہ جس طرح ہمارے ذمہ مثلاً اپنے بال بچوں کے کھانے پینے رہنے سہنے، بیماری  
 آزاری اور علاج وغیرہ معاشی امور کی فکر ہے اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا  
 بڑھ کر ان کے ایمان و عقیدہ، نماز روزہ، معاملات و اخلاق، عادات و اطوار یا  
 معاشرت کے معادی امور کی نگرانی بھی واجب ہے اور جس طرح دوستوں عزیزوں  
 ملنے جلنے والوں کی شادی و غمی میں شرکت و ہمدردی کے معاشرتی یا سماجی حقوق  
 و آداب کا لحاظ ضروری ہے اسی طرح تمام چھوٹی بڑی تقریبوں مجلسوں یا یوں ہی  
 خالی عزیزانہ دوستانہ ملاقاتوں میں موقع محل کے مناسب لوگوں کو معروف و منکر کی  
 باتیں بتلاتے اور تعلقات و اثرات کے لحاظ سے معروف پر چلاتے اور منکر سے بچاتے رہنا

بھی لازم ہے۔

خیال کیجئے کہ جس ملک معاشرہ یا امت میں معروفات و منکرات یا معاصی و طاعات کا پورا علم رکھنے والے علماء کے پورے ایک گروہ کے گروہ کا یہی خاص کام ہو کہ چھوٹی بڑی تمام آبادیوں میں اس کے افراد پہنچ اور پھیل کر لوگوں کو خیر و شر کے صحیح احکام سناتے اور امر و نواہی سے خبردار کرتے، برے بھلے کاموں کا دینی و دنیوی نفع و نقصان سمجھاتے، ترغیب و ترہیب سے کام لیتے، بالفاظ دیگر معروف و منکر کے امر و نہی کا فریضہ خطاب عام سے بھی اور خطاب خاص سے بھی، اور سب سے بڑھ کر خود اپنے عمل و مثال سے انجام دیتے رہتے ہوں، اس میں ان پڑھ سے ان پڑھ اور جاہل سے جاہل بھی معروف و منکر کی باتوں سے اتنے جاہل کیسے رہ سکتے ہیں کہ ان کو روزمرہ کی اسلامی زندگی کے احکام سے واقف کرنے کے لئے رسمی یا کتابی تعلیم ناگزیر ہو۔ آج بھی چھوٹے بڑے کتنے بے شمار دینی مدارس موجود ہیں جن کو ہمارے گئے گزرے امت کے امیر و غریب عوام اپنی بڑی بھلی مالی خدمت و توجہ سے چلا رہے ہیں یعنی امت کے عوام پھر بھی اس باب میں اپنا حق و فرض تھوڑا بہت ادا ہی کر رہے ہیں لیکن ان ہی مدرسوں سے سالہا سال کی محنت و مدت لگا کر خالص علوم دین حاصل کرنے والے جو علماء سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں باہر آتے رہتے ہیں ان میں سے کتنے فی صد ہوتے ہیں جو امت کے ان عوام کی دینی و اصلاحی خدمت یا معروف و منکر کے امر و نواہی و خیر کی دعوت کی خالص انبیائی وراثت کے حقوق و فرائض کے لئے اپنی



زندگیوں کو وقف رکھتے ہوں؟

خمیازہ یہ ہے کہ عوام کے جو افراد اپنی ذات کی حد تک کچھ تھوڑا بہت دین اور نیکواری کا خیال و اہتمام کر بھی لیتے ہیں وہ بھی دوسرے عام مسلمانوں کے متعلق کیا خاص اپنے اہل و عیال تک کے حق میں معروف و منکر کے امر و نہی کا کوئی دینی فرض عاید ہی اپنے اوپر نہیں جانتے، یعنی علما اگر اپنے اس فرض کو جان کر غافل ہیں تو عوام بالعموم اس سے سرے سے انجان اور جاہل ہی ہو کر رہ گئے ہیں کہ جس قرآن و حدیث میں ایمان و عمل، روزہ نماز، حلال و حرام وغیرہ کے احکام ہر فرد مسلمان کو اپنی اپنی ذات کے لئے دیئے گئے ہیں اسی میں دین و دنیا کے زیان و خسران سے بچنے بچانے کے لئے ایک دوسرے کو تو اسی بالحق یا معروف و منکر کے امر و نہی کے احکام بھی تو اپنے اپنے محل و مقام کے لحاظ سے ہر فرد مسلمان کے اسلامی فرائض و واجبات ہی کی حیثیت سے مامور و منصوص ہیں۔

(۲) سارے افراد میں ایک دوسرے کی دینی خیر طلبی کے عملی ظہور کی ضرورت

ہدایت کو برپا کرنے کے لئے مسلمانوں کی پوری امت پر ایک طرف یہ واجب ٹھہرایا ہے کہ ان میں ہمیشہ ایک خاص و مستقل جماعت (وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ) موجود رہے جس کا خاص و مستقل کام ہی ہو کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتی اور معروف و منکر کا امر و نہی کرتی رہے، اسی طرح دوسری طرف اسی کتابِ ہدایت پر ایمان لانے والوں کی نفس ایمانی ہمدردی، دوستی کے لوازم میں داخل کر دیا گیا ہے کہ بلا تخصیص مرد و عورت سارے افراد امت آپس میں ایک دوسرے کو معروف

کی تاکید اور منکر سے منع کرتے رہیں۔ — وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ  
بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹) اور اسی کی توسیع و تعمیم  
متفق علیہ حدیث میں یہاں تک فرمائی گئی ہے کہ جہاں راستہ کے حقوق ہیں راستہ  
چلنے والوں کو تکلیف دینے والی چیزوں کا راستہ سے ہٹا دینا اور سلام کا جواب دینا  
وغیرہ ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ایک بڑا حق معروف و منکر کے امر و نہی کا بھی ہے یعنی  
امر و نہی کا یہ حق ایسا ہے جس کے لئے کسی خاص تعلق کیا معمولی جان پہچان تک کی  
قطعاً کوئی شرط نہیں، اجنبی سے اجنبی کوئی راہ چلتا بھی کسی معروف سے ناواقف یا  
اس کے خلاف کرتا، یا کسی منکر میں مبتلا نظر پڑ جائے تو اس کو بھی بتلانا اور روکنا چاہئے  
معروف و منکر کے امر و نہی کے علاوہ اور بھی ہر طرح نفس مسلمان ہونے کی ہی حیثیت  
سے ہر مسلمان کی خیر خواہی (النصحة لكل مسلم) کا حق و فرض ہر مسلمان پر ہے  
بلا کسی دوسرے رشتہ و تعلق کے عائد ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز و زکوٰۃ  
کے ساتھ ہی "النصحة لكل مسلم" کی بھی بیعت لیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ ایمانی  
دوستی یا ولایت کا یہ فرض صرف وعظ و تقریر یا خطاب عام سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ مراد  
یہاں خصوصیت سے انفرادی امر و نہی ہے۔ یعنی "بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" کی نفس  
ایمانی ولایت و اسلامی رشتہ ہی کی بنا پر ہر فرد مسلمان پر دوسرے مسلمان کی خیر خواہی

۱۔ مثلاً حضرت جریر بن عبداللہ راوی کہ بایعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی  
اقامة الصلوة و ايتاء الزکوٰۃ و النصحة لكل مسلم۔

ہمدردی کا فرض عائد ہو جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر کسی کی ہمدردی یا دوستی کیا ہوگی کہ اس کو بھلائی برائی نیکی بدی کی ہر چھوٹی بڑی بات حسب موقع صرف بتلا ہی نہ دیجائے بلکہ امر و نہی کی تعبیری معنویت یہ ہے کہ اپنی والی پوری کوشش نیکی کی راہ پر لگانے اور بدی کی راہ سے ہٹانے کی جائے۔ صحیح مسلم کی مشہور حدیث میں اسی اپنی والی حسب استطاعت کوشش کے تین درجے فرمائے گئے ہیں۔ سب سے پہلا یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی کسی منکر یا برائی کو دیکھے تو جہاں تک بن پڑے اپنے ہاتھ یا قوت سے اس کو مٹا یا بدل ڈالے، اگر اس کی قدرت و استطاعت نہ رکھتا ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ زبانی ترغیب و ترہیب سے اس کی پوری کوشش کرے، بغرض اتنی بھی کسی جائز و معقول غدر سے استطاعت و مصلحت نہ ہو تو کم سے کم آخری درجہ یہ ہے کہ دل ہی سے برائی کو برا جانے، ساتھ ہی اس آخری درجہ کی نسبت ارشاد ہے کہ یہ ایمان کا بالکل ہی آخری اور سب سے کمزور درجہ ہے یعنی اگر مسلمان مسلمان ہو کر دل سے بھی برائی کو پوری طرح برا نہ جانے تو پھر اس کے ایمان ہی کی خیر نہیں، اس لئے کہ برائی کو دل سے بھی برا نہ جاننا درحقیقت خدا کی نافرمانی کو برا نہ جاننا یا اس کو ناقابل اعتنا اور حقیر و خفیف جاننا ہے جو ظاہر ہے کہ ایمان کے بجائے کفر کی شان ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

مسلم ہی کی دوسری ذرا لمبی روایت ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کی امت میں اس کے ایسے یا رودرگارا (اصحاب و حواری) ہونے جو اس کے طریقہ پر چلتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے، پھر ان کے بعد ایسے ناخلف

پیدا ہو جاتے جو دوسروں سے نیکی کی بات اگر کہہ بھی دیتے تو خود نہ کرتے اور اگر کرتے تو ایسے کام کرتے جن کا ان کو اپنے نبیوں کی طرف سے حکم نہیں دیا گیا تھا، مطلب یہ کہ یہی اندیشہ مجھ کو خود اپنی امت کے معاملہ میں ہے۔" تو جو شخص ایسے ناقربانوں سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے جو (اس کی قدرت نہ رکھ کر) زبان سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہے اور جو زبان سے عاجز ہونے کی بنا پر کم از کم دل ہی سے جہاد کرے گا وہ بھی مؤمن ہے لیکن جو اس سے بھی گیا گذرا ہوا، اس کے دل میں برائی بھرا ایمان رہا۔ ان روایات سے بزرگ اصل معروف و منکر کے قرآنی احکام و آیات ہی کی تفصیل و تفسیر ہیں، اس کے سوا کیا ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام کا اصلی مطالبہ برائی کو دیکھ کر صرف زبانی سکوت و خاموشی ہرگز نہیں، مقدر و بھری نہ کسی طرح اس کو مٹانے اور بدلنے ہی کا حکم ہے اس لئے کہ برائی کو دل سے بڑا جاننے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے تاہم امکان ہر طرح دور و نفور رہے اور کسی طرح اس سے ایسا تعلق نہ رکھے جس سے اس میں کسی درجہ کی بھی شرکت و تعاون یا ہمت افزائی نکلتی ہو۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲۳) کے قرآنی حکم کا مدعا یہی ہے، جس معاشرہ میں لوگ برائی سے کم از کم اس حد تک بھی نفرت و بیزاری برتتے ہوں، اس میں برائی کا پھلنا پھولنا ہرگز آسان نہ ہوگا اور آپ سے آپ وہ مٹ

لہ من جاهدہم بیدہ فہو مومن ومن جاهدہم بلسانہ وھو مومن ومن جاهدہم بقلبتہ فہو مومن لیس وراع ذالک من الایمان جبہ خردل۔

اور مرکرہ جائے گی، عام طور پر خدا و آخرت قانون و حکومت سب سے زیادہ پہلا دباؤ  
 آدمی پر سوسائٹی کا پڑتا ہے جس میں اس کو دن رات رہنا سہنا اور جس سے شادی و غمی کے  
 تمام احوال میں براہ راست سابقہ پڑتا ہے، اس لئے لازماً ہمارے لئے سوسائٹی کی نفرت  
 و بیزاری کا خریدنا آسان نہیں ہوتا اور نہ ایسے سماج میں کوئی برائی سماجی یا جماعتی طور  
 پر بڑھ کر پکڑ سکتی ہے نہ علانیہ رائج و جاری رہ سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ کچھ افراد چوری  
 چھپے انفرادی طور پر مبتلا و مرتکب ہو سکتے ہیں جن کا زہر پورے سماج میں پھیل کر وبا  
 کی صورت بہر حال نہیں اختیار کر سکتا، بقول حضرت بلال بن سعدؓ کے کہ برائی جب  
 چھپ کر کی جائے تو اس کا ضرر صرف کرنے والے تک رہتا ہے لیکن جب کھل کر ہو  
 اور اس کو روکا نہ جائے تو اس کا ضرر پھیل جاتا ہے۔

(۳) جو جتنا قریب ہے اس کے اصلاح کی جس دین میں محض دینی خیر خواہی یا ایمانی ولایت  
 اتنی ہی زیادہ ذمہ داری!

سے بے تعلق اور غیر سے غیر مسلمان بھائی کو بھی امکان بھر برائی سے روکنا اور  
 بھلائی پر چلانا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا مطالبہ اس معاملہ میں تعلق  
 والے دوستوں ملنے جلنے پاس پڑوس والوں سے حسب تعلق کیا کچھ نہ ہوگا اور  
 ان کے متعلق معروف و منکر کے اور امر و نہی کے بارے میں مسلمان کی اسلامی و دینی  
 ذمہ داری کتنی زیادہ ہوگی، سب سے قریب و قوی تعلق آدمی کا اپنے گھر والوں یا

۱۵ اجیاء العالم ص ۷۳، جلد اول طبع مصر۔

بال بچوں سے ہوتا ہے ان کی نسبت خود قرآن ہی کی سورہ تحریم میں کتنا تہدید و ترہیبی  
 عنوان اختیار فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو (مسلمانو) تم خود اپنے کو اپنے گھڑالوں  
 کو (دوزخ) کی اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور تمپھر ہیں جس پر ایسے تند خو  
 اور مضبوط فرشتے (متعین) ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو  
 ان کو حکم دیا جاتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اقْوُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا  
 النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ  
 وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۶۶) نبی الاسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام جو بھیجے ہی گئے تھے  
 قیامت تک پوری انسانیت (كَافَّةً لِلنَّاسِ) کے لئے بَشِيرًا وَنَذِيرًا بنا کر ان کو  
 بھی خاص طور سے حکم تھا کہ اپنے نزدیک کنبہ قبیلہ والوں کو ڈراؤ۔ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ  
 الْأَقْرَبِينَ (۶۷) اس سے بڑھ کر خاص اہل و عیال کے معاملہ کو لیجئے جن کے  
 رزق و نفقہ کی فکر خود شریعت نے واجب کی ہے، ان کی نسبت بھی ارشاد ہوا کہ آپ  
 کا اصل و مقدم کام یہ ہے کہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کریں اور اس (حکم و تاکید  
 میں اگر کچھ مشکلات پیش آئیں تو ان کے مقابلہ میں) جھے رہیں (رہا ان کے رزق کا  
 معاملہ تو ہم آپ سے رزق (کو مانا) نہیں چاہتے رزق تو آپ (اور آپ کے اہل و عیال)  
 کو ہم خود دیں گے، آپ کو اصل فکر انجام یا عاقبت کی بھلائی کی کرنا چاہئے) اور عاقبت  
 کا دار و مدار تمام تر تقویٰ یا پرہیزگاری پر ہے۔ وَأَمْرٌ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ  
 وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى (۶۸)

مفسر تھانوی علیہ الرحمۃ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے :-  
 ”کہ ہم آپ سے اور اسی طرح دوسروں سے ایسی معاش کو مانا نہیں چاہتے جو ضروری  
 طاعات (یا نیکیوں) میں ملنے ہو، روزی سب کو ہم دیں گے، غرض اصل مقصود  
 آج کل کی طرح پیٹ یا کسب معاش نہیں بلکہ دین و طاعت یعنی وہی ایمان و  
 عمل صالح کی زندگی ہے۔ اور کسب معاش کی ہا سی حالت میں (اور اسی درجہ تک)  
 اجازت یا امر ہے جبکہ اس سے ضروری طاعت میں خلل نہ ہو۔“

سورۃ لقمان میں حضرت لقمان کی زبان سے توحید، مکارم اخلاق اور حسن معاشرت کا  
 جو درس قریب قریب پورے ایک رکوع میں دیا گیا ہے اس میں خصوصی خطاب خاص  
 اپنے بیٹے ہی کی طرف کرایا گیا ہے اور اس میں خاص حکم و نصیحت اپنے بیٹے کو نماز  
 پڑھنے کی ہے کہ **يَبْنِيَّ اَقْبِلِ الصَّلٰوةَ** اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ لوگوں کو  
 معروف و منکر کا امر وہی بھی کرتے رہنا اور اس راہ میں جو مصائب و مشکلات آئیں ان پر  
 حتی الامکان صبر سے کام لینا کہ یہ بڑے عزم و ہمت کا کام ہے: **وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ  
 وَانْتَهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُورِ** (۱۳)  
 یعنی خالی اپنی نماز و عبادت تقویٰ و طاعت کا حق ادا کر لینے ہی پر دین کا مطالبہ ختم  
 نہیں ہو جاتا دوسروں کو دینداری اور نیکی کاری یا اعمال صالحہ کی راہ پر لگانا اور چلانا  
 بھی عین دین و ایمان ہی ہے۔

حدیث میں معروف و منکر کے امر وہی کی عام و عمومی تعلیمات کے ساتھ

خاص و خصوصی تعلقات کی بنا پر اس کی تعلیم کی سب سے "جوامع الکلم" والی تعبیر،  
یہ متفق علیہ روایت ہے کلکم دراعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ یعنی تم سب کے سب  
کسی نہ کسی کے نگراں ہو اور تم سب سے اپنے اپنے زیر نگرانیوں کے معاملہ میں سوال ہوگا۔  
سوچا جائے تو واقعی مشکل ہی سے کوئی ایسا چھوٹا بڑا بے تعلق آدمی نکلے گا جس پر کسی نہ  
کسی شخص یا کسی نہ کسی شے کی کوئی نگرانی یا ذمہ داری سرے سے نہ عائد ہوتی ہو ذمہ داری  
و مسئولیت کے اسی عموم و وسعت کو آگے چند مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے کہ "انعام  
یا حاکم اپنے محکوموں کا نگراں ہے جس سے ان زیر نگرانیوں کے متعلق سوال ہوگا، شوہر  
اپنے اہل و عیال کا نگراں ہے جس سے ان زیر نگرانیوں کی نسبت سوال ہوگا، عورت  
اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا، نوکر اپنے آقا  
کے مال کا نگراں ہے اس سے اس کے معاملہ میں سوال ہوگا۔ غرض تم سب ہی کسی نہ  
کسی کے نگراں ہو اور سب ہی پر اپنے اپنے زیر نگرانیوں کی جواب دہی عائد ہوتی ہے۔  
معروف و منکر کے اس امر وہی کے سلسلہ میں اجنبی سے اجنبی راہ چلنے تک کی  
جو ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی گئی ہے اس سے قطع نظر اگر ہر مسلمان اپنے ساتھ  
قُوا انْفُسَكُمْ وَاَهْلِيكُمْ نَارًا کے خود قرآنی حکم کے تحت صرف اپنے خاص اہل و عیال  
اور دوسرے زیر نگرانیوں ہی کی حد تک اس ذمہ داری کو ادا کرتا رہے تو فرمائیے کہ اسلامی  
معاشرہ میں کون سا فرد معروف و منکر کے علم و عمل سے جاہل و غافل بے فکر و بے پرواہ  
رہ سکتا ہے، جو شخص کسی اعتبار سے بھی کسی کے تھوڑا بہت بھی زیر اثر ہوتا ہے اس پر



قدرتاً زیادہ اثر اور دباؤ بھی پڑتا ہے چہ جائیکہ خود اپنے اہل و عیال، پھر اسی دباؤ اور تفہیم و ترغیب کے ساتھ حسب ضرورت ترمیم و تادیب کا بھی امر و اجازت ہے، مثلاً زبانی ترغیب و ترمیم سے کام نہ چلتا ہو تو بعض صورتوں میں بیوی کو مارنے تک کا حکم قرآن ہی میں ہے (وَاصْرِفْ وَظَانًا) اسی طرح دس سال کا بچہ اگر سمجھانے سے نماز نہ پڑھے تو اس کو بھی مارنے کا حکم حدیث میں وارد ہے۔

کتاب و سنت پر مبنی تو احی یا محرق و منکر کے اس ایک اصلاحی اصول ہی کو عوام کیا خواص بلکہ دینی اعتبار سے اخص خواص علماء و مشائخ بھی اختیار فرمائیں اور اپنے زیر نگران وزیر اثر افراد اور دینی مدارس و ادارات کے اساتذہ و طلباء اور دیگر متعلقین پر تعلیم و تربیت کی راہ سے اس اثر کو کما حقہ استعمال کیا جائے، اور خود ان کے اندر اپنے زیر نگرانوں سے متعلق اس کی اہمیت و اقدیمیت کا احساس پیدا کرایا جائے تو مستقل و مصنوعی دعوتی و اصلاحی یا تبلیغی جماعتوں، اداروں وغیرہ کے بغیر ہی یہ بالکل فطری طریق اصلاح کتنا زیادہ موثر و کارگر اور بالآخر ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔

ہندوستان و پاکستان اور دوسرے اسلامی و غیر اسلامی ملکوں میں آج اس گئی گذری حالت میں بھی الحمد للہ اپنی ذات کی حد تک عالم با عمل علماء و مشائخ اور ان کے اثر و نگرانی میں چھوٹے بڑے سیکڑوں دینی ادارے اور تعلیم گاہیں موجود ہیں جن کے ہزاروں تعلیمیافتوں کی تعداد لاکھوں مسلمانوں میں پھیلتی رہتی ہے اگر ہمارے ان دینی تعلیم یافتوں ہی کو ایک طرف کسی معتدبہ درجہ میں کماؤ کیفاً مجدد وقت

۴-۲) ملاحظہ ہوں متداول تفاسیر درخ-۴

کی تعریف والا "عالم باعمل" مولوی بتایا جائے اور دوسری طرف یہ بالکلیہ اپنے کو دینی و اصلاحی خدمت کے لئے وقف نہ بھی کر دیں، بلکہ معاشی و دنیوی مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے براہ راست زیر نگران، اہل و عیال، زیر اثر اعزہ و احباب، مسجد و محلہ نیز دنیوی کاروبار ہی کے سلسلہ میں دوکان و بازار، کچھری و دفتر وغیرہ میں عام ملنے جلنے والوں کو باتوں باتوں میں حسب موقع تھوڑی بہت ایمان و عمل صالح کی دعوت دیتے اور ان کے تقاضوں اور حکموں سے آگاہ کرنے کو اپنا دینی و اسلامی فریضہ جانتے تو بلا انجمن بازیوں اور جماعت سانیوں ہی کے تو اسی بالحق یا معرود و منکر کے امر و نہی کی خالص کتاب و سنت پر مبنی بے تکلف و بے خرچ قدرتی راہ سے لاکھوں بڑے مسلمانوں تک ایمان و عمل صالح کی پکار (یا نداء بدعوت) کس آسانی سے پہنچتی رہتی اور اوامر و نواہی سے جہالت اور ان پر عمل سے غفلت کی یہ نوبت نہ آتی کہ "یا اللہ یہ مسلمان کس بات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ ہیں جو امت محمدیہ میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں!"۔

پھر سچ پوچھئے تو کتاب و سنت کا یہی سیدھا سا دار نظام ہدایت ہر جگہ مسلمان معاشرہ یا امت کو خیر امت بنا کر پوری انسانیت کے لئے (اخرجت للناس) معروف و منکر کے امر و نہی والی (تأمرؤن بالمعروف و تنہون عن المنکر) (۳۱) چلتی پھرتی محسوس و مشاہد دعوتی امت بنا دیتا چھوٹا منہ بڑی بات، لیکن ہر یقیناً بالکل سچی بات کہ ہمارے اخص خواص علما و مشائخ ہی کی اپنے خاص فریضہ سے

بے اعتنائی کی بدولت پورے مسلمان معاشرہ میں معروف و منکر کا احساس اتنا کند ہو گیا ہے کہ ہم اپنے اہل و عیال اعزہ و احباب ملنے جلنے والوں سب ہی کو کم و بیش ہر طرح کے فواحش و منکرات میں گرفتار دیکھتے ہیں، لیکن نہ اُن پر رحم آتا ہے نہ غصہ، نہ امر ہوتا ہے نہ نہی، نہ ہاتھ سے، نہ زبان سے، نہ دل سے، بلکہ سچ یہ ہے کہ کتنے معروف و منکر ہیں جن کا معروف و منکر ہونا ہی ہم بھول چکے ہیں، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کتنے منکرات کو معروف اور معروفات کو منکر جاننے لگے اور **رُحْمٌ يُحَسِبُونَ أَنَّهَاً يُحْسِنُونَ صُنْعًا** (۱۸) کے انتہائی عملی خسران — **هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا** (۱۹) تک جا پہنچتے ہیں۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر ہی گفتگو کے سلسلہ میں اجیار العلوم میں اس پیشین گوئی کی ایک حدیث میں حضورؐ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ

”اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ جب تمہاری عورتیں سرکش اور تمہارے جوان بدکار ہو جائیں گے اور تم جہاد چھوڑ دو گے، لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ایسا ہونے والا ہے، فرمایا ہاں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ہوگا، عرض کیا گیا اس سے بڑھ کر کیا ہوگا یا رسول اللہ؟ آگے طویل ارشاد میں اس سے بڑھ کر جو ہونے والا تھا اور جو آج آنکھوں کے سامنے ہے وہی کان لگا کر سننے والا ہے۔“

فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ تم نہ معروف کا حکم کرو گے نہ منکر

منع کرو گے عرض کیا کہ کیا یہ بھی ہوگا۔ یا رسول اللہ؟ فرمایا ہاں، قسم ہے اس ذات کی

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ہوگا؟

صحابہؓ کی سمجھ میں یہی کیسے آسکتا تھا کہ کوئی زبانہ ایسا بھی آئے گا کہ مسلمان معروف و منکر

کے امر و نہی تک کو چھوڑ بیٹھیں گے اس لئے تہایت استعجاب سے عرض کیا کہ

”اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا یا رسول اللہ؟ فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا

جب معروف کو منکر اور منکر کو معروف جاننے لگو گے؟“

سننے والے حیران ہو کر رہ گئے اور عرض کیا کہ

یا رسول اللہ کیا یہاں تک نوبت آجائے گی؟ فرمایا ہاں قسم ہے اس ذات کی

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور یہ کیا اس سے بھی بڑھ کر ہو کر رہے گا۔ عرض کیا

یا رسول آخرا ب اس سے بڑھ کر کیا رہ گیا ہوگا؟

اس کا جواب کلیجہ تھام کر سنئے کہ معروف و منکر کے امر و نہی کا ابتدائی ترک بالآخر کس

انجام تک پہنچا کر رہتا ہے اور رہا، فرمایا کہ

”کیا حال ہوگا تمہارا جبکہ تم (الٹ کر معروف کی جگہ منکر کا حکم دینے اور منکر کی

جگہ معروف سے روکنے لگ جاؤ گے، عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا اس انتہا تک

معاملہ جا کر رہے گا فرمایا ہاں قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔“

دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قسموں پر قسمیں کھا کر کس آغاز کے کس ناگزیر انجام

کی خبر دے اور اس سے ڈرا رہے تھے کہ جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا تو اسی بالحق سے

ابتدائی غفلت کی بدولت آخر کار نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ لوگ معروف کو منکر اور منکر کو معروف جاننے سمجھنے لگ جائیں تو انتہائی نتیجہ اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ معروف سے روکا اور منکر پر آمادہ کیا جانے لگے، کیا ہم اس انتہا کے قریب نہیں آگے؟ بلکہ کیا آج بھی بہت سے منکر معروف اور معروف منکر نہیں بن چکے ہیں اور کتنے منکرات ہیں جن کی بے دھڑک تمدن و تہذیب کلچر اور آرٹ کے نام سے تعلیم و دعوت نہیں دی جا رہی ہے؟ اور کتنے معروفات ہیں جن کی وحشت و بربریت،

دقیانوسیت بلائیت (بلا ازم) کے نام سے ہنسی نہیں اڑانی جا رہی ہے!

منکرات کا روکنا جب اسلام کی نگاہ میں اتنا ضروری ہے کہ شریعت نے بہت سی منکرات کے لئے سخت سے سخت حدود و تعزیرات مقرر کر رکھی ہیں تو سوسائٹی کی پسند و ناپسند رد و قبول جس کا دباؤ آدمی قانون و حکومت کی تعزیرات کیا خدا و آخرت کے خوف اور خزا و سزا سے بھی زیادہ قبول کرتا ہے، اس کو کمزور کرنے والی ادنیٰ سزا دینی غفلت کو بھی کیسے روارکھا جاسکتا تھا۔

یہ تو معروف و منکر کے سلسلہ میں وہ تین داخلی و اندرونی ستون تھے جن پر اسلامی نظام ہدایت کے مطابق خود امت مسلمہ کی اندرونی صلاح و اصلاح کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور جن کے قیام و بقا ہی پر خیر امت کی تیسریت موقوف و منحصر ہے یعنی (۱) اولاً تو اس امت کے اندر ایک پوری امت یا جماعت (وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ) ہمیشہ ایسی موجود رہنی چاہئے جس کا خصوصی و منصبی کام لوگوں کو

بھلائی کی طرف بلانا، نیکی پر چلانا اور بدی سے ہٹانا ہو۔ (۲) دوسرے بلا استثنا ہر مسلمان مرد، عورت کی محض ایمانی ہمدردی و خیر خواہی (وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ) (۹) کا بلا کسی دوسرے رشتہ و تعلق یہ تقاضا ہے کہ کسی انجانے سے انجانے مسلمان کو بھی کسی منکر میں مبتلا پائے تو اس سے روکنے بچانے اور معروف کی راہ دکھانے چلانے میں اپنی والی کوئی کمی نہ کرے۔ (۳) اور محض ایمانی رشتہ کے علاوہ دوستی عزیزداری وغیرہ کا اگر کوئی مزید تعلق ہو تو اسی نسبت سے یہ ذمہ داری بھی مزید بڑھ جاتی ہے، خصوصاً اگر یہ تعلق ”راعی و رعیت“ یا نگران اور زیر نگرانوں کا ہو جیسا کہ سب سے بڑھ کر خود اپنے اہل و عیال کے حق میں ہوتا ہے تو پھر اس معاملہ میں مسئول عن رعیتہ والے پورے پورے مواخزہ و مسئولیت والی جوابدہی عائد ہو جاتی ہے اور جس طرح اپنے بال بچوں کے کھانے پینے ورہنے سہنے، دوا علاج وغیرہ ذمیوی و جسمانی ضروریات کی پوری فکر و تدبیر آدمی کے ذمہ ہے اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر مسلمان اپنے توابع کی دینی یا بدی و اخروی، روحانی و اخلاقی زندگی کی صلاح و اصلاح کا ذمہ دار ہے، مثلاً نابالغ اولاد پر خود نماز فرض نہیں مگر والدین یا اولیاء پر یہ فرض ہے کہ دس سال کی عمر ہی سے نماز کی عادت ڈلوانا شروع کر دیں، ضرورت ہو تو خوب تادیب سے بھی کام لیں، اسی طرح بیوی کا نان و نفقہ ہی واجب نہیں دینی و اخلاقی نگرانی و اصلاح بھی شوہر کے شوہری یا راعیانہ واجبات میں داخل ہے اور اس کے لئے بھی شوہر کو ناگزیر صورت میں ضرب و تادیب تک کا اختیار دیا گیا ہے۔

(۴) خیر امت بن کر پوری انسانیت | مسلمانوں کے جس ملک و معاشرہ میں بھی امر و نہی یا اصلاح  
کی ہدایت کا فریضہ | و اصلاح کے یہ تینوں اندرونی یا داخلی واجبات صرف

عقائد و عبادات ہی میں نہیں، ان سے بڑھ کر اخلاق و معاملات اور معاشرت میں اپنی  
اپنی جگہ جاری و برپا ہوں، عملاً اس کا دوسرے معاشروں یا قوموں کے مقابلہ میں  
تمایاں طور پر خیر امت اور لازماً ان کے حق میں امت و وسط، یا اسلام کی اعتدالی و متوازن  
زندگی کی شہادت و سبق بن جانا بالکل قدرتی بات ہوگی اور ایسی صالح و متوازن  
زندگی والی امت کی طرف سے انبیائی زندگی کے بالکل بے غرضانہ و **مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ**  
**مِنْ أَجْرٍ** معروف و منکر کے امر و نہی سے دوسری قوموں کا مسلسل اندھا بہرا رہنا ہرگز  
آسان نہ ہوگا اور ہو بھی تو مسلمان کا جو اصل نصب العین اللہ تعالیٰ کی راہ و رضا کا اجر  
ہے **(إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ)** (الشعراء) وہ تو انشا اللہ سر حال میں پورا  
ہی ہو کر رہے گا اور یہی معروف و منکر کے باب میں اسلامی نظام و ہدایت و اصلاح  
کا امت محمدیہ علیہ السلام والتجیت سے من حیث امت چوتھا مطالبہ ہے کہ  
اُمّت و وسط اور خیر امت بن اور رہ کر پوری انسانیت **(أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)** کے  
حق میں مشعل راہ بنی رہے۔

(۵) پھر خلافت ارضی کا منصب پا کر حکومت کو | پھر اسی خیر امت یا اسلامی ایمان و عمل  
شریعت کی خدمت کا ذریعہ بنائے رکھنا | صالح والی امت بننے پر اسلامی حکومت یا  
زمین پر خدا کی طرف سے خدائی خلافت و جانشینی عطا ہونے کا جو حتمی وعدہ ہے

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آيَةً (۱۱۰) اس کی بھی بالذات  
 غرض و غایت نہ نفس ملک و مال ہے نہ حکومت و تجارت، نہ کسی ملک و قوم والوں کے  
 حلق میں اس ہی جیسے انسانوں کی بنائی ہوئی کسی سیاسی و معاشی دعوت و داعیت  
 (آئیڈیالوجی) کو پروپیگنڈہ کے زور یا اقتدار کی قوت سے ٹھونسنے بلکہ اس اسلامی  
 یا الہی حکومت و خلافت کی اصل و واحد غرض و غایت بھی ایک طرف براہ راست  
 خود اللہ ہی کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق اللہ اور اس کے بندوں سب کے  
 حقوق و فرائض (اقامت الصلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ) کی اور دوسری طرف ساتھ  
 ہی ساتھ ان ہی خدائی احکام کے مطابق معروف و منکر کے امر و نہی کے واجبات  
 کی ادائیگی ہے یہی مسلمانوں کی طرف سے اللہ یا اس کے دین کی نصرت و خدمت ہے۔  
 اور اسی نصرت و خدمت کے صلہ میں قوت و عزت والے اللہ کی طرف سے ہماری  
 (مسلمانوں کی) نصرت و مدد کا قطعی وعدہ ہے: وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ  
 إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ  
 وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَنُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۱۱۰)  
 اسلام جس ایمان و عمل صالح کی دعوت و پیغام ہے اور جس پر مسلمانوں  
 ہی کے خیر امت ہونے کا نہیں دنیا بھر کی ساری امتوں اور قوموں، تمام  
 بنی نوع انسان کے زیان و خسران سے بچاؤ کا دار ہے خود اس کے بقا و قیام،  
 استواری و استحکام کا دار و مدار تمام تر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے خود کتاب اسلام



کے عطا کردہ مذکورہ صدر پنچگانہ نظام ہی پر ہے، اب آگے دیکھئے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی جگہ صحیح و سلامت رہ گیا ہے۔

## نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر امت کی پرکھ

۱) علما و خواص کی | سب سے اول "خشت اول" کو لیجئے، یہ پہلی اینٹ وہی "منکم زبوں حالی" والی امت درامت یا امت محمدیہ میں انبیائی مقام و منصب (علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل) رکھنے والے علماء ہیں کہ ایمان و عمل صالح کے پورے احکام، اصول و فروع، کلیات و جزئیات کی عالم و حامل ہی جماعت ہوتی ہے، اس جماعت کا مخرج و منبع ہمارے دینی یا عربی بڑے چھوٹے مدارس ہیں۔ یہ مدرسے کہنا چاہئے کہ اپنا سارا زور مقررہ نصاب کی کتابی تعلیم، کتابوں ہی کے امتحانات اور ان کے پاس کرنے والوں کی دستار بندی یا تقسیم اسناد پر لگا دیتے ہیں، تربیت کے ذریعہ خود ان کے قلب میں ایمان داخل کرنے کا ایذا دینا

۲) یادش بخیر۔ آج کل "پرامن بقائے باہم" کے ایک "پنج شیل" پر فخر و ناز کا بڑا غلغلہ ہے جس کی بنیاد تمام تر اس خود غرضی پر ہے کہ ہر ملک و حکومت کے حکمران جتنے کو دوسرے حکومتی جتنوں کی مداخلت و حملہ کے خوف کے بغیر اپنی اپنی من مانی چلانے کا موقع پوری آزادی سے ملتا رہے خصوصاً ایسے کمزوروں کو جن کے پاس ابھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم نہیں جب حق و باطل کا کوئی معیار و میزان انسان کی انفرادی یا اجتماعی رائے و خواہش سے بالاتر نہ رہ جائے تو کمزوروں کے لئے بالخصوص اپنی من مانی چلانے کا سستا ہتھیار "پنج شیل" کے نام نہاد پرامن بقائے باہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

فِي قُلُوبِكُمْ (۱۱۹) اور ظاہری و باطنی اعمال صالحہ میں خدا سے ڈرنے والے (اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) (۱۱۸) والے "راسخ العلم" علماء پیدا کرنے کا اہتمام کم و بیش ہر جگہ ناپید ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ناپید ایمان و عمل صالح کی دعوت الیٰ الخیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی عزیمت و ہمت پیدا کرنے کا اہتمام ہے، یعنی اپنے علم سے یہ علما نہ اپنے ہی عمل کو نمایاں طور پر ستواتے ہیں اور نہ دوسروں تک اس کے پہنچانے کا کوئی خاص و لولہ و حوصلہ لیکر ان مدرسوں سے باہر آتے ہیں۔

اپنی حد تک بہت سے بہت بس کچھ چلتا ہوا روزہ نماز کر لیتے ہیں، نہ نماز میں خشوع و خضوع اور حضور قلب کا پتہ نہ اس پر فحشاء و منکر سے بچانے والا کوئی نمایاں اثر مرتب، روزے رکھتے ہیں، لیکن وہ بھی ایسے ہی چلتے ہوئے کہ جو مبارک مہینہ خاص طور پر تقویٰ کی سالانہ تربیت کے لئے مقرر کیا گیا ہے (لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ) کہ سالوں بھر کی زندگی پر اس کا متقیانہ اور پرہیزگارانہ اثر چھایا رہے، خود اس مہینے میں کھانے پینے کے سوا دیگر معاصی و منکرات سے بچنے والے کتنے ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی بے روح عبادت زندگی کے معاملات یا ظاہری و باطنی اخلاق و عادات پر کوئی زندہ اثر کیا ڈال سکتی ہیں اور ایسے حامل اسفار سندرے بھاگنے والے علماء اپنوں پر ایوں مسلمانوں اور عام انسانوں کسی کو بھی غیر اسلامی کے مقابلہ میں اسلامی زندگی کے تفوق و برتری کا کیا سبق دے سکتے ہیں، یہ جب زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو اخلاق و معاملات، معاشرت اور عادات کسی بات میں بھی بہ مشکل ہی عوام الناس سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

پھر جو یہ علم حاصل کرتے ہیں چونکہ اس کے عملی نصب العین یا مقصد دعوت خیر اور امر معروف و نہی منکر — کو عملاً و عملاً اٹھتے بیٹھتے ان کے اندر طالب علمی میں رچایا بسایا نہیں جاتا اس لئے اپنے اندر غیر شعوری طور پر یہ ایک بے مقصد زندگی کا خلا پاتے ہیں جو دنیوی یا جدید تعلیم پانے والوں کے مقابلہ میں انتہائی احساس کمتری کی حد تک جا پہنچا ہے، یہی بڑی وجہ ہے کہ ان میں اسکول و کالج کے طلباء کی وضع قطع، طور و طریق، چال ڈھال کی نقالی و پسندیدگی کا رجحان اس درجہ بڑھتا جاتا ہے کہ اپنے مدرسہ کو دارالعلوم کہنے تک میں کمتری محسوس کرتے اور کالج کہہ کر اپنی رسوائی دور کرنا چاہتے ہیں! یعنی جو پوری امت بلکہ پوری انسانیت کی امامت و مقتدرانی کا علم حاصل کرتے ہیں ان میں اُلٹے غیروں کی تقلید و نقالی پرورش پاتی ہے اور جن کا مقام آگے چلنا تھا ان کو ناموں اور لفظوں تک کے سہارے اپنی عزت ہی پیچھے چلنے میں نظر آنے لگتی ہے۔

بات یہ ہے کہ اسکولی و کالجی طلباء کے سامنے صاف صاف کھلے ہوئے دنیوی مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن کے حصول کی وہ اپنی تعلیم سے بجا طور پر توقع رکھتے ہیں۔ لازماً ان میں ایک یا مقصد تعلیم کا جوش و خروش اور احساس برتری ہوتا ہے، بخلاف ہمارے دینی مدارس کے طلباء کے کہ وہ اپنی تعلیم سے دنیا کے میدانوں میں تو اپنی کوئی خاص جگہ دیکھتے نہیں، اور دینی مقاصد کا کوئی قوی شعور یا لگن ان کے دلوں میں پیدا نہیں کرائی جاتی۔ نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ اپنے دین دنیا

دونوں کے ہاتھ خالی پا کر دوسروں کے آگے پھیلانے لگتے ہیں۔

اس طرح خالی ہاتھ مدرسوں سے نکل کر جب زندگی میں شریک ہونا پڑتا ہے تو دراصل ان کو اپنا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا بعض مدارس کے بعض طلبہ اسی مصرف کی تلاش میں عالم دین بننے کے بعد انگریزی پڑھنے اور اس کے امتحانات پاس کرنے لگتے ہیں، بعض مولوی عالم و مولوی فاضل وغیرہ سرکاری سندوں کی فکر میں پڑ جاتے ہیں، بعض گھبرا کر طبی مدرسوں کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ کو اگر اخباری و انشائیٰ مناسبت ہوئی تو اخباروں رسالوں میں کھپنے کی کوشش کرتے ہیں، یا ذرا اونچی علمی و تحریری لیاقت ہوئی تو کچھ تالیف و ترجمہ کی مزدوری و پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، کچھ پھر ان ہی چھوٹے بڑے مدرسوں میں پلٹ کر درسی کی نوکریاں کر لیتے ہیں، اسی طرح کسی مرکزی نصب العین سے محروم جس کے جردھر سینگ سماتے ہیں گھس جاتا ہے اور کم ہی بلکہ شاذ و نادر ہی ایسے ہوتے ہیں جو ان مشاغل کے ضمن میں بھی اپنے علم دین کے مطابق خود اپنی یا براہ راست اپنے زیر نگران اہل و عیال ہی کی زندگی بنانے سنوارنے کا کوئی خاص اہتمام کرتے ہوں، بدیگراں چہ رسد۔ اور ایسی مثالیں تو عنقا ہی ہوتی ہیں کہ کوئی عالم دین اپنے علم دین کا مصرف و مقصد تمام تر اپنی اہلیت و صلاحیت کے مطابق "مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ" والی انبیائی شان و استغنا کے ساتھ اس علم کے عطا کئے ہوئے اوامر و نواہی یا معروف و منکر کے احکام کو دوسروں تک پہنچانے اور امت کی دینی اصلاح یا اس میں اسلامی

روح پھونکنے کی جدوجہد میں ہمہ تن لگ جانا ہو۔ جس فرض کا احساس و اہتمام استادوں ہی میں اتنا کیاب ہے کہ کتاب کا سبق پڑھا دینے کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی استاد اپنے شاگردوں کے ایمان و عمل کی خامیوں اور کوتاہیوں کا غم کھاتا یا ان پر کچھ روک ٹوک کرتا ہوگا، پھر شاگرد غریب تو شاگرد ہی ہیں ان میں اگر گھرباہر اپنے پرائیوں کی ان خامیوں کو تاہیوں کا احساس سرے سے نایاب ہو تو کیا تعجب اور جب احساس ہی ندرت تو اہتمام کا سوال ہی کیا!

(۲) عوام کے دینی احب مسلمانوں غیر مسلمانوں، پوری انسانیت کو زبان و خسران شعور کی تباہی سے بچانے والے پنچگانہ نظام صلاح و اصلاح کی پہلی اینٹ ہی اتنی ٹیڑھی رکھ گئی تو "تاثریامی رودرپوار کج" کا نتیجہ رکھا ہی تھا۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں سارے مسلمان یا پوری امت اسلامیہ تو پورے دین کی عالم بن یا بنائی جا نہیں سکتی۔ "مِنْكُمْ أُمَّةٌ" والے خاص علمائے دین ہی کی امت درامت کو ان دونوں فرائض میں تن من وھن سے لگنے کا حکم دیا گیا تھا، ایک دعوتِ خیر (يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ) جو تمام ہے ایمان و عمل صالح کے احکام کی دعوت یا تعلیم و تبلیغ یعنی ایسے ضروری ضروری اوامرو نواہی سے لوگوں کو واقف و آگاہ کرنا، جن سے روزمرہ کی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، دوسرے ان اوامرو نواہی پر عمل اور ان میں کوتاہیوں کی نگرانی اسی کا نام معروف و منکر کا امر و نہی ہے۔

ان ہی دونوں فرائض سے غفلت نے یہاں تک توبت پہنچائی کہ امت

کی بہت بڑی اکثریت کے ایمان تک کی خبر نہ رہی طرح طرح کے مشرکانہ عقائد و اوہام نے دلوں ہی میں گھر کر لیا ظاہر میں بھی کروڑوں دیوتاؤں کے پجاری، مشرکوں کیلئے اس کی صورت کیا رہ گئی ہے کہ وہ تعزیر پرستوں، قبر پرستوں کو اپنے سے ممتاز خدائے واحد کا پرستار دیکھنے اور جاننے لگیں، غریب عوام و جہلا کا شکوہ ہی کیا، جب خود حضرات علمائے مستقل مسلک اور خاتوادے ان مشرکانہ عقائد و اعمال کے مستقل داعی و مہر دار تک بن گئے ہیں! اسلامی توحید یا توحید الہ کا حقیقی علم و عمل الگ رہا لاکھوں مسلمان کلمہ توحید کے لفظی معنی کیا اس کے صحیح تلفظ تک سے عاری ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ شاید لاکھوں ہی ہوں گے جن کو غلط و صحیح کسی صورت میں بھی اس کلمہ کو سر سے عمر بھر زبان پر لاتے کی نوبت نہ آتی ہوگی۔ توحید جو تمام طاعات و حسنات کا سرچشمہ اس الطاعات ملاک الحسنات تھی جب وہی اس طرح گم ہو گئی تو پھر اس پر بنی اعمال صالحہ کا کیا رونا و ناخوہنا دو چار فی صد کے ٹوٹے پھوٹے روزہ نماز کے سوا، حقوق عباد یا معاملات و اخلاق اور معاشرت میں شاید ہی کوئی قوم و امت اس نام کی خیر امت سے زیادہ شریعت میں پھپھی رہ گئی ہو، علما و خواص تک کی اکثریت نماز روزہ کے علاوہ باقی اعمال صالحہ کو کم و بیش دین کے دائرہ سے عملاً خارج کر چکی ہے۔

بس لے دے کر غیروں کی نظروں میں بھی ہمارے عام مسلمان بھائیوں کو دیکھ کر اسلام کے معنی یہی رہ گئے ہیں کہ ان کے ہاں دسہرہ ہے تو ہمارے ہاں محرم، ان کے

ہاں دیوالی ہے تو ہمارے ہاں شبرات، اُن کے ہاں جنم اسٹی ہے تو ہمارے ہاں "میلاد شریف" ان کے ہاں آئے دن نہان اور نہانی میلے ٹھیلے ہیں تو ہمارے ہاں قبری عرسوں اور عرسی میلوں ٹھیلوں کا کاروبار، آج یہاں توکل وہاں سال بھر چلا جاتا ہے اور اب ان پر نئے رنگ کے عرسوں میلوں اور مولودوں کے ساتھ "اغیار ہی کی ریس میں جونے ماڈرن رنگ کے میلاد ڈرے یا جشن میلاد منائے جانے لگے ہیں، ان کا اثر بھی ان اغیار — ہندوؤں سکھوں عیسائیوں وغیرہ — سب پر آخر اس کے سوا کیا پڑتا ہوگا کہ جیسے ہمارے کچھ دینی ذبیوی بڑے لوگ ہیں جن کی پیدائش کی خوشی ہم مناتے اور ان کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں ویسے ہی مسلمان بھی جس کو اپنا بڑا مناتے ہیں، اس کی پیدائش کا دن دھوم دھام سے عالی شان پنڈالوں اور بجلی کے بے شمار قسموں میں مناتے اور ان کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں۔ ان میں آخر انوکھی بات کو نسی ہے جس کی بنا پر ہم اسلام کو حق و صداقت کی کوئی خاص آواز جانیں، نمک کی کان میں نمک کے سوار رکھا ہی کیا ہوگا۔" (تجدید معاشیات صفحہ ۴۹۸)

پھر ان ہی جشنوں میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ "تقریروں اور مشاعروں کی گریا گرمی میں تو پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے لیکن اسی پنڈال کے کسی گوشہ سے جب اذان کی آواز آتی ہے تو اس پر کان دھرنے والے اور نماز کا رخ کرنے والے سٹوئس دشل پانچ ہی ہوتے ہوں گے، ان تماشوں کو دیکھنے اور ان میں شریک ہونے والے اغیار یہی تو اثر لے سکتے ہیں کہ اصل دین مسلمانوں کا بھی روزہ نماز سے زیادہ جنم اسٹی کی سی یہ دھوم

دھام ہی ہے۔ نئی پرانی اس طرح کی بدعات و خرافات میں مبتلا ہونے والے عام مسلمانوں کی ذہنیت ہو بھی بالکل یہی گئی ہے کہ

جب ان چیزوں کو بھی وہ نماز روزہ ہی کی طرح بلکہ عملاً اس سے بڑھ کر دین سمجھتے ہیں تو بے نماز روزہ کے بھی آخر وہ اپنے کو مسلمان بلکہ دیندار کیوں نہ جانیں زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی دین کا ایک کام کرتا ہے کوئی دوسرا، سب کون کرتا ہے کون نہیں دیکھتا کہ بہترے مسلمان نہ سال بھر نماز پڑھتے ہیں نہ کبھی مسجد کو جھانگ کر دیکھتے ہیں نہ دن کے روزہ سے واسطہ نہ رات کی تراویح سے مطلب، لیکن جس دن مسجد میں ختم ہوتا ہے چراغاں کرنے مٹھائی بانٹنے کاغذی بلیں سجانے اور ان تاشوں میں چندہ اور وقت سب کچھ دینے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

یہ نتیجہ پرانی رسوم و بدعات ہی کو دین جاننے کا نہیں، آج بھی پرانی "ممولو شریف" کے بجائے نیا "جشن میلاد" منانے والوں کی نفسیات بالکل یہی تو ہوتی ہے، دل کھول کر ان میں چندہ دینے، جوش و خروش کے ساتھ ان کا انتظام کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں رات رات بھر تقریریں سننے والے اور تعنیہ مشاعروں میں ڈٹے رہنے والے کتنے ہوتے ہیں جو سال بھر تک گھروں مسجدوں کی سال کے اس ایک دن — یوم میلاد — میں اور جشن میلاد

کے عین پنڈال کے اندر جس کی پیدائش کے نام سے یہ ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اسی کی ۴۹۹ یاد و اتباع میں خدا کے حضور اپنی پیشانی ایک ہی موقع پر ٹیک دیتے ہوں۔ (تجدید معاشیات)



عوام و جہلا کا قصور ہی کیا، جب نئے پرانے بڑے بڑے علما خود ہی ان جشنوں کو  
 زینت بخش کر ان کے دین اور دینداری ہونے کی سند بخشتے رہتے ہیں اور شاید ہی ان میں  
 کسی کو ان مفاسد کے مفاسد ہونے کا خطرہ بھی گذرتا ہو تو ان پر کسی روک ٹوک کا سوال  
 ہی کیا بغرض علما و جہلا، عوام و خواص عملاً جب پورے کا پورا معاشرہ ہی ایمان و عمل  
 کے موٹے موٹے معروفات و منکرات تک کو کم و بیش اس طرح بھول بھلا چکا ہو تو  
 اس کی صورت ہی کیا رہی کہ سارے مسلمان بلا تفریق عورت و مرد محض اسلامی  
 رشتہ کی خیر خواہی و ہمدردی یا **وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ**  
 والے ایمانی حق ولایت کی بنا پر ایک دوسرے کو چھوٹے سے چھوٹے معروف و منکر  
 کے معاملہ میں روک ٹوک کرتے رہیں، جس برائی بھلائی کو آدمی خود ہی محسوس نہ کرتا ہو،  
 اس میں دوسروں کو مبتلا دیکھ کر کہاں سے اتنا احساس ابھر سکتا ہے کہ ان کو ہاتھ  
 زبان یاد دل سے روکنے کی فکر کرے!

(۳) اعزاء و اقربا بچہ بعدہ درویش“ کا سوال ہی کیا جب ”اول خویش“ ہی کے معاملہ  
 سے اغماض میں عوام و جہلا نہیں، اچھے اچھے دیندار خواص بلکہ مشائخ و علماء تک  
 کو دیکھا جاتا ہے کہ شوہر بیوی کو، باپ بیٹے کو، استاد شاگرد کو، پیر مرید کو، مالک نوکر کو،  
 اسی طرح کم و بیش ہر راعی یا نگران اپنے زیر نگرانیوں کو طرح طرح کی ایمانی و عملی کمزوریوں  
 غفلتوں کو تاہیوں بد عنوانیوں یا چھوٹی بڑی دینی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا دیکھتا  
 اور بس دیکھتا رہتا ہے، خود نماز روزہ کے پابند ہیں لیکن نماز روزہ کا نام تک

نہ لینے والے اہل و عیال کی غفلت و بے فکری کی اتنی بھی فکر و پرواہ کرنے والے کم ہی ہوتے ہیں، جتنی کہ ان کے نزلہ بخار کی معمولی بیماری کی! دوستوں عزیزوں، دن رات کے ملنے جلنے، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کو علانیہ دیکھتے ہیں کہ نماز روزہ کے تارک ہیں زکوٰۃ نہیں ادا کرتے، ترکہ کی شرعی تقسیم نہیں کرتے، حلال و حرام نہیں دیکھتے، رشوت لیتے ہیں، دھوکا دیتے ہیں، بدگوئی و چغلیخوری کرتے ہیں، بزدگاہی و بدکاری میں پڑے ہیں جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹے مقدمے لڑتے ہیں، جھوٹی گواہیاں دیتے دلاتے ہیں، قرض مارتے ہیں، گھوڑ دوڑ لائری اور معمرہ بازی کا جو ا کھیلنے ہیں، شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں سراسر غیر اسلامی و مسرفانہ رسوم و خرافات نام نمود فخر و مباہات کی حرکتوں میں گرفتار ہیں، جب تک نام نہ معلوم ہو، صورت و شکل وضع قطع تک سے مسلمان معلوم نہیں ہوتے۔

لیکن ہمارے دینداروں کی بھی یہ عجیب طرفہ تماشہ دینداری ہے کہ دین اسلام کو اس طرح ہر بازار رسوا کرنے والے اور کھلے خزانے خدا کے احکام کو ان ٹھکرانے والے <sup>سے</sup> ان سطروں کو لکھتے ہی لکھتے اخبار میں پڑھا کہ کسی سگ سرشت آدم نے فخر اولاد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی (فداہ بابی و امی) پر اپنے ہم سرشت کتے کا نام رکھ کر اسی سرشت کے ایک انگریزی اور ہندی روزنامہ میں اس کی تلاش کا اشتہار (۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو) دیدیا۔ بے دست و پا مسلمان سراسیمہ ہو کر جا بجا ناراضی اور احتجاج کے جلسے کر رہے ہیں، زبان سے ناراضی و احتجاج کیا چیز، اس نام پر توجان قربان کر دینا بھی عین ایمان ہی ہے۔

پھر بھی سوچتے کی بات ذرا ٹھنڈے دل سے یہ ہے کہ جو کورنجبت سرے سے ایمان ہی سے محروم ہے وہ اس نام والے کے مقام کی عظمت و رفعت کو کیا پہچانے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

مسلمانوں سے نہ عزیزوں کی عزیزداری میں کوئی فرق آتا ہے نہ دوستوں کی دوستی میں نہ ان کو باز رکھنے کے لئے اثر یا دباؤ سے کوئی کام لیا جاتا ہے نہ زبان سے کوئی تفہیم و تشبیہ ہوتی ہے اور نہ دل ہی سے کسی بیماری و بے تعلقی کا اظہار۔

ایک نماز ہی کو لے دیکھئے کہ حضرات صحابہؓ اسی سے مومن کو مومن اور کافر کو کافر جانتے پہچانتے تھے، غنیمت ہے کہ کوئی مسلمان مسلمان ہو کر علانیہ اس کی قرینیت کا منکر تو اب بھی شاید ہی ملے، لیکن عمل یہ ہے کہ اولاد نماز نہیں پڑھتی، مسجد کا منہ نہیں دیکھتی، تو نماز جماعت کے پابند والدین اس پر اتنی بھی باز پرس نہیں کرتے جتنی اسکول نہ جانے پر، بیماری آزادی میں حسب تعلق دوست دوست کے دوا علاج کی تدبیر کو اپنا دوستانہ و عزیزانہ فرض جانتا ہے لیکن آنکھوں کے سامنے گہرے سگریہ دوستوں عزیزوں کو علانیہ تارک نماز دیکھنے والوں میں شاید ہی کوئی بندہ خدا ہوتا ہو گا جو اس کی کوئی فکر و تدبیر کرتا یا خیر خواہی و دلسوزی سے سمجھانا بچھانا الگ رہا چھوٹے منہ ٹوک دینا بھی پسند کرتا ہو یا نماز نہ پڑھنے والے اپنے عزیزوں دوستوں ہم چشموں اور سوسائٹی میں اپنی عزت و وقعت میں کوئی کمی پاتے ہوں، خصوصاً اگر کچھ

دقیقہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) سوال تو درعیان ایمان و اسلام کو خود اپنے گریبانوں میں سر ڈال کر کرنا چاہئے کہ ہم مسلمانوں کے سے نام رکھ کر کام کتنے دن رات اسلام اور رسول اسلام کو علانیہ رسوا ہی کرتے رہتے ہیں اور پوری امت کی امت من حیث امت ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی سے دور و نفور ہو کر سراپا باعث رسوائی پیغمبر کے سامان کے سوا کیا رہ گئی ہے۔

ہر کس از دست غیر می نالد      سعدی از دست خویشین فریاد

صاحبِ جاہ و مال ہیں تو ہمارے نام تہادِ علما و مشائخ تک کو ان کی خوشامد و چاہلوسی میں کلمہ حق زبان پر لانے سے گریزاں پائیں گے بلکہ اچھے اچھے تہجد و اشراق والے علما صلیا کو بھی دیکھا کہ دامادِ نمازی یا دیدار کے بجائے بی اے ایم اے یا عہدہ دار ہی تلاش کیا جاتا ہے چاہے خیر اس کے ایمان کی بھی نہ رہی ہو اور کم ہی رہتی ہے۔

صحتِ روحانی | میں کبھی کبھی روزہ نماز والے والدین سے پوچھتا ہوں جن میں بعض نامی گرامی کی فکر نہ رہی! ”دارالعلوموں“ کے علما و اساتذہ تک ہوتے ہیں کہ آپ کی یہی بے نمازی اولاد اگر ذرا کسی اندیشہ ناک یا مہلک مرض میں مبتلا ہو تو بھی آپ اسی بے فکری اور سردہری سے کام لیتے رہیں گے؟ پھر کیا دین و ایمان کی بیماری بیماری نہیں یا آخرت کی ہلاکت ہلاکت نہیں! جواب بہتوں کا برف کا سا ٹھنڈا بس یہ ہوتا ہے کہ کہتا تو ہوں! ایک آدھ مثال اس کی بھی مل جاتی ہے کہ صرف معمولی طور پر زبان ہلا دینے سے آگے بڑھ کر ترغیب و ترہیب یا اثر و دباؤ کو بھی کام میں لاتے ہیں مگر کام چلتا نہیں۔ پوچھتا ہوں کہ بھائی اگر مرن و مہلک مرض میں گھر کے علاج سے نفع نہ ہو رہا ہو اور آب و ہوا کے بدلنے یا کسی اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ ہو جہاں بہتر آب و ہوا اور بہتر علاج و تیمارداری میسر ہو تو کیا اپنی والی اس کے انتظام و اہتمام میں کوئی کمی کریں گے؟ اسی طرح اگر خدا نخواستہ کوئی اولاد کسی متعدی مرض میں مبتلا ہے جس سے دوسروں کو متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو کیا اس کو علیحدہ نہیں رکھتے یا کسی متعدی امراض کے اسپتال میں داخل نہیں کر دیتے، پھر اگر دین و اخلاق کی بیماریاں بھی بیماریاں ہیں اور جسمانی بیماریوں سے

زیادہ ہلک و متعدی تو آخر ان کے ساتھ بھی ہی معاملہ کیوں نہیں کیا جاتا کہ جب تک ضرورت و مناسب ہو ان کو بھی دین و اخلاق کی کسی صحت مند و صحت بخش فضا اور ہمہ وقتی نگرانی میں رکھا جائے، یا اگر کسی کو خودکشی کرتے دیکھا جائے اور سمجھانے بچھانے سے باز نہ آتا ہو تو کیا زبردستی اس کو روکا نہ جائے گا، پھر بھی اندیشہ ہو کہ موقع پا کر جان دے ہی دے گا تو کیا ماں باپ دوست و عزیز اپنی والی کوئی سعی و تدبیر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ نگرانی اور دیکھ بھال کی اٹھا رکھیں گے، جب تک اس کے دل سے خود خود کسی کا خیال نکل جانے کا اطمینان نہ ہو لے سوال یہی ہے کہ کیا اپری زندگی کی ہلاکت یا آخرت کشتی کا خسران اس چند روزہ زندگی کی خودکشی کے برابر بھی نہیں جو خودکشی کے بغیر بھی صبح و شام کسی نہ کسی آن ختم ہی ہو کر رہے گی؟

ہماری جدید درسگاہیں | سوال کا عام عملی جواب یہ ہے کہ ہم اٹے اپنی اولاد کو ایمان و عمل ایمانی قتل گاہیں ہیں | دونوں کی دینی خودکشی و ہلاکت کی جو انتہائی و بازوہ متعدی آب و ہوا اسکولوں کا بچوں کی ہے اس تک میں بے تکان جھونکتے چلے جاتے ہیں، اسباب کچھ بھی ہوں لیکن کھلی آنکھوں اس تعلیم کے جن آثار کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہے، اس کا نقشہ امت کے حکیم مجدد وقت کے ہلکے سے ہلکے الفاظ میں بھی یہ ہے کہ

”نماند وزہ میں کاہلی بلکہ اغراض، عقائد میں ضعت و تشویش، اخلاق میں تکبر و

تصنع، کفار کی تقلید کا ذوق و شوق، مال و جاہ کی محبت کہ ان کی طلب میں دین کے

خارج ہونے کا صدر نہ ہونا اور دن رات دماغ میں مالی ترقی اور جاہ و منصب

کی ہوس پکاتے رہنا، جس چیز میں مالی جہا کی ترقی لیکن دین کا تنزل ہو تو مال جہا

کو ترجیح دینا اور دین کی پرواہ نہ کرنا۔ ۱۷

نماز روزہ میں کاہلی و اعراض کیا کھلے خزانے تارک ہوتے ہیں، بعضے قائل تک نہیں رہتے اور خدا تک کے منکر ہو جاتے ہیں۔ غیر منکروں کے بھی ایمانیات کی کوئی نہ کوئی چولہل ضرور جاتی ہے، خدا کی ذات و صفات، قضا و قدر، روحی و نبوت کے عقائد میں ضعف و تشویش ہی کو راہ نہیں مل جاتی، بارہا ان کی حقیقت ہی اتنی منقلب ہو جاتی ہے کہ ان کو اسلامی کہنا سرے سے بے معنی ہوتا ہے، یہ سنی سنی یا قیاسی باتیں نہیں چوتھائی صدی سے زیادہ اور یونیورسٹیوں کا (بمبئی و عثمانیہ) کا ذاتی تجربہ ہے حالانکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں کچھ نہ کچھ ان کی روک تھام اور رد عمل کا ظاہری انتظام بھی تھا، خود شعبہ دینیات کے طلبا جن کا انگریزی کے سوا باقی پورا کا پورا انصافِ تعلیم تفسیر و حدیث فقہ و کلام وغیرہ اسلامی علوم ہی ہوتے تھے وہ کبھی سمیت و تعدیہ سے غیر متاثر نہیں رہتے تھے بس جیسے کسی شدید و بانی فضا میں رہ کر کچھ سخت جان جاں بر ہو جاتے ہیں، اسی طرح کچھ بطنی سعادت مند اسکولوں کا کجوں کے سراپا دین دشمن ماحول سے بھی دین و ایمان سلامت لیکر نکل آتے ہیں، ورنہ سچ پوچھئے تو یہ غارت گرد دین و ایمان تعلیم گاہیں سیدھا جہنم کا ٹکٹ

۱۷ تحقیق تعلیم انگریزی کے عنوان سے حکیم الامت کا واقعی ایک بڑا حکیمانہ مضمون ہے، یہ اسی کا

اقتباس ہے اور تجدیدِ تعلیم و تبلیغ کے صفحہ ۴ سے صفحہ ۵۳ تک اس پر مفصل بحث ہے، ۱۲

ہوتی ہیں۔

ابتداء میں عام طور پر علما و صلحا کی طرف سے جو اس تعلیم کی شدید مخالفت ہوتی تھی بظاہر تعصب و تنگ نظری ہی کا شبہ ہوتا تھا لیکن تجربے نے بتایا کہ دراصل ان کی ایمانی فراست تھی اور آج دنیا بھر کے مسلمان جس سب سے بڑی دینی مصیبت کا شکار ہیں وہ یہی ہے کہ بالآخر ہر جگہ مسلمانوں کی قیادت و سیاست کم و بیش بالکلیہ اسی دین دشمن مغرب زدہ تعلیم و طبقہ کے ہاتھ میں چلی گئی کون نہیں جانتا کہ ان کا دین نام کے مسلمان ہو کر بھی تمام تر یہی دنیا اس کا جاہ و مال حکومت و سلطنت، عیش و عشرت، رقص و سرور، شراب و کباب لہو و لعب کی آزادیاں اور آزاد خیالیاں ہوتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ تعلیم ضمیر و قلب کی زندگی و جرأت اتنی مردہ کر دیتی ہے کہ عوام کے خوف و خطر سے ضمیر کے صریحاً خلاف زبان پر تو سیاسی نام و نعرہ اکثریوں کے اسلام کا ہوتا ہے لیکن اندر ہی اندر مغربی سیاست و معیشت، زندگی و معاشرت آزادی اور آزاد خیالی کی فکروں تندیروں اور سازشوں میں سرگرم رہتا ہے اور نام تہاد ملی و سیاسی آزادی حاصل کرنے پر بھی پرانے مغربی آقاؤں ہی کا دم بھرتا رہتا اور اور ان ہی کی پشت پناہی میں اپنا کام نکالتا رہتا ہے۔ اسی ناپاک صورت حال سے دوچار ہو کر غریب پاکستان غلامی کے دور سے بھی زیادہ روز بروز ناپاک ہوتا جا رہا ہے اور بھی مصر و انڈونیشیا وغیرہ مسلمان ملکوں میں کوئی صحیح اسلامی جماعت و تحریک ان فرنگی تعلیم کے آزاد غلاموں ہی کی بدولت مشکل سے پینے اور زندہ

رہنے پاتی ہے، مصری اخوان کا نازہ تازہ حشر کل کی بات ہے، حکومت پر قابض  
اسی طبقہ کے اندرونی کارروائیوں اور سازشوں کی کشمکش میں پاکستان کا دستور کسی  
طرح اسلامی نہیں بن پارہا ہے اور اس کی راجدھانی (کراچی) کے ایک بڑی ایمانی  
حرارت والے صاحبِ فاران کو بڑی حیرت ہے کہ

”تاریخ میں یہ واقعہ بھی ایک اعجوبہ کی صورت میں یادگار بن کر رہ جائے گا کہ  
ایک مملکت صرف اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی، اس مملکت کے  
ارباب اقتدار خدا کے فضل سے مسلمان تھے اور وہاں کی اکثریت بھی خدا  
اور رسول پر ایمان رکھتی تھی مگر اس جگہ مسلمانوں کو اسلامی دستور کا مطالبہ کرنا پڑا۔  
آنے والی نسلیں اس واقعہ کو تاریخ میں پڑھیں گی اور غرق حیرت ہو کر  
رہ جائیں گی کہ یہ بات آخر ظہور میں کس طرح آئی اور وہ کس قسم کے مسلمان تھے  
جن پر دستور اسلامی کی اہمیت واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی (حالانکہ)  
..... وہ جن کے ہاتھوں میں زمام کار تھی اور اللہ تعالیٰ نے جن کو حکمرانی  
اور دستور سازی کا موقع دیا تھا ان کے کرنے کا کام ہی یہ تھا (فاران جنوری ۱۹۵۳ء)

مغربی تعلیم و تسلط کی لائی ہوئی مغرب زدگی و مغرب پرستی کا طلسم انٹارنیشنل ٹیٹن کے  
بعد اس سے ناواقف آنے والی نسلیں ”بلاشبہ اس“ اعجوبہ پر حینا بھی ”غرق حیرت“  
ہوں موجب حیرت نہ ہوگا۔ لیکن آج ”جن ہاتھوں میں زمام کار ہے ان کی ذہنیت  
خود ان کے مسلمان والدین کے ہاتھوں جاہ مال اور دنیا کے عشق و محبت میں، جس



دین بیزار اور خدا ناشناس (GOD LESS) تعلیم و تربیت کے جس سانچے میں ڈھلی ہوئی اس کو جان پہچان کر کسی بڑے ہی سادہ لوح کے لئے یہ باتیں "اعجوبہ" یا "غرق حیرت" ہونے کی ہوں تو ہوں! اور نہ "غرق حیرت" ہونے کا سب سے بڑا "اعجوبہ" دراصل یہ ہوگا اگر ان کے ہاتھوں سے کبھی بھی حقیقی معنی میں "دستورِ اسلامی" پر دستخط ہو گئے اور اس سے بھی بدرجہا بڑا "اعجوبہ" ہوگا اگر ان ہاتھوں سے عملاً کبھی یہ دستور نافذ ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ سورج مغرب سے نکل آیا۔ لے

منکرات کا سرچشمہ | غرض دنیا کی تاریخ میں کفر والی بے دینی و بددینی کے منکرات کا آج جدید تعلیم ہی ہے | سب سے بڑا سرچشمہ ہی جدید تعلیم اور اس کی تعلیم گاہیں ہیں، مسلمانوں کا جہاں کہیں اور جتنا بھی انفرادی و اجتماعی زور اس سراپاد شمنِ ایمان و دین کش سرچشمہ منکراتِ تعلیم کو بند کرنے اور آئندہ نسلوں کو اس سے بچانے میں لگ سکے لگانا تھا، اگر وہ بڑے علوم و فنون کی کسی درجہ میں تعلیم ضروری ہو بھی — اور بعض علوم خصوصاً سائنس کی حد تک ہے بھی — تو اس کا انتظام بالکل دینی علوم و تعلیم کے اس طرح زیر نگرانی وزیر تربیت ہو کہ ایمان و عمل صالح پر اس کے زہریلے اثرات کا قطعاً کوئی احتمال نہ

لے مضمون پریس میں ہے کہ انجمنِ شہداء کی حد تک تو پاکستان کی حکومت جمہوریہ اسلامیہ بن گئی دل سے بابے دلی سے کسی طرح سے بھی سہی، کاش توفیق و ہمت اس کی بھی ہو جائے کہ یہ نام بدنام نہ ہو۔  
کاش! کہ یہ ٹوٹی پھوٹی اس پانچ سال پہلے کی تھی۔ اب مارچ ۱۹۷۱ء میں "مسلم عائلہ قوانین" کے نام فوجی صدر پاکستان کا یہ فرمان واجب الازعان "آرڈیننس" شرف صدور لایا ہے اس کے بعد انانہ پڑھنے یا اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ "قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

اندیشہ نہ رہے اور جب تک ایسا انتظام نہ ہو اس تعلیم کا دینی و اخروی ضرر و فساد اس کی وقتی و عارضی ضرورت پر اس طرح غالب آ گیا ہے کہ جن والدین کے اندر دین و آخرت کی حقیقت و اہمیت کا ایمان و احساس کچھ بھی زندہ ہے بخدا اس تاریک و قیانوسی کی سمجھ میں قطعاً نہیں آتا کہ کیسے اس آگ میں اپنی اولاد کو دیدہ و دانستہ جھونک دیتے ہیں۔

لیکن کیا عرض کیا جائے کہ ایک تو ہمارے کچھ اگلوں کی ایمانی حس و فراست یہ تھی کہ درخت ہی سے انھوں نے پھل کو تاڑ لیا تھا اور ایک ہم ہیں کہ ایمان اور عمل صالح دونوں کے حق میں پھلوں کے زہریلے اثرات کا گھر باہر دن رات مشاہدہ و تجربہ کر رہے ہیں اور پھر بھی شجرِ خبیث کے پہچاننے سے جان بوجھ کر اندھے بن رہے ہیں بلکہ اُلٹے اس کو انفرادی و اجتماعی کوششوں سے پروان چڑھاتے رہتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا ریلو بھی اب انہیں تعلیم گاہوں کی طرف ہے۔ صدق ہفتہ وار (۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء) میں مشرقی پاکستان کی کسی کالجی صاحبزادی کا ایک مراسلہ نظر پڑا تھا جس میں شکایت تھی کہ ایڈن کالج میں سائنس کا انتظام نہیں جس کی وجہ سے ان کو ڈھا کہ کالج جانا پڑتا ہے جہاں لڑکوں سے الگ لڑکیوں کے لئے سائنس کا انتظام ہے جس کا وقت صبح سات بجے سے سوا دس بجے تک ہے اور صاحبزادی کو صبح ۶ بجے ہی وہ بھی سردی میں جانے کا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کی خود صاحبزادہ صاحبہ کے نزدیک دو ہی صورتیں تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ مخلوط تعلیم جاری کر دی جائے اور لڑکیاں بھی ڈھاکہ کالج میں ہی پڑھنے لگیں (۲) دوسرے یہ کہ لڑکیوں کیلئے علیحدہ سائنس کلاس کھولے جائیں“  
پھر خود ہی سارے نسوانی احساسات و خطرات کو بالائے طاق رکھ کر روشن خیالی کی مردانہ ہمت کے ساتھ تھریر کیا تھا کہ

”یہ دو اذہلاج بہت خردچیلہ اور بہت دقت طلب بھی۔ تجربہ گاہیں وغیرہ بھی سب الگ بنانا پڑیں گی۔ آسان علاج پہلا ہی ہے یعنی مخلوط تعلیم عام کر دیا جائے جیسا کہ مغربی پاکستان میں ہے۔“

اناللہ! یہ تاریک خیال تو پاکستان میں پھر طالب علم نہیں، روشن خیال طالبہ کی طرف سے مخلوط تعلیم کا یہ مطالبہ پڑھ دم بخود رہ گیا تھا اور یہ تو بالکل پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ پاکستان نے آزادی کے پانچ سالوں ہی میں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی اور خدمت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن مطالبہ اسلامی پر مبنی پاکستان کو اسلامستان ثابت کر دکھانے کا تہا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ مغربی پاکستان میں مخلوط تعلیم جاری کر دی اور مشرقی پاکستان کی ”مومنات غافلات“ تک میں اس کا علی الاعلان مطالبہ پیدا کر دیا۔

مخلوط تعلیم خود دنیوی | حالانکہ دین تو دین خود دنیوی کے حق میں بھی اس تعلیم کے گونا گوں نقائص نظر سے بھی تباہ کن ہی | و مفاسد کا ہر سال ہی مختلف یونیورسٹیوں کے عطائے سند کے خطبوں میں رونا رویا جاتا ہے اور ان کی اصلاح و ازالہ کے لئے چھوٹی بڑی کمیٹیوں کمیشنوں کا سلسلہ لگا ہی رہتا ہے، اور تو اور ہماری نئی تعلیم کے ائمہ و مقتدر العینی خود

یورپ کے اہل فکر و نظر بھی بے دینی کی اس تعلیم کو دنیا ہی کے حق میں وبال جاننے لگے ہیں، فرانس کے کسی بڑے نامی گرامی تو بل پرائز پائے ہوئے ڈاکٹر کاریل نے ایک کتاب نامعلوم انسان کے نام سے لکھی ہے مطلب خود قراموش انسان معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر علوم و فنون اور ان کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی اتنی ترقی کے باوصف انسان خود اپنی انسانیت سے جاہل ہی رہا۔ کراچی کے ایک اچھے صحیح و سلیم فکر و ایمان والے پندرہ روزہ یقین (۱۷ نومبر ۱۹۵۲ء) میں اس کے کچھ اقتباسات نظر سے گزرے تھے، لکھا ہے کہ

”گوہارے پاس دنیا بھر کے علمائے سائنس فلاسفہ اور سر یہ (MISTICS)

کے فراہم کردہ مشاہدات کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے تاہم خود اپنی (انسانی) ذات و حقیقت کے صرف چند پہلو ہی کچھ گرفت میں آسکے ہیں پوری طرح انسان کو ہم نے نہیں جانا ہے بس کچھ پراگندہ یا الگ الگ اجزا کا اس کو ایک معجون مرکب سمجھ رکھا ہے اور یہ اجزا بھی خود ساختہ ہی ہیں۔“

علم کا مقصد اولین خود | ورنہ درحقیقت خود اپنے متعلق انسان کا علم اب تک بہت ہی  
اپنی ذات کی معرفت ہی | ادنیٰ و ابتدائی درجہ کا ہے۔ معلوم یہی ہوا کہ انسان کے لئے علم و  
تعلیم کی راہ سے جس بات کا جانتا سب سے مقدم و ضروری ہے کہ خود اپنی انسانی حقیقت  
اور غرض و غایت کو جاننے پہچاننے اسی سے سب سے زیادہ انجان اور جاہل و غافل ہے!

Man the unknown at

عیاں نہ شد کہ چرا آدم کجا بودم درینج و در د کہ غافل ز کار خویشتم  
 نئی تعلیم کا حشر | نئی دنیا (امریکہ) جس پر آج ساری دنیا کی نگاہیں سب سے زیادہ  
 نئی دنیا والوں کی زبانی | رشک و حسد کی پڑ رہی ہیں ڈاکٹر موصوف ہی کے الفاظ میں وہاں  
 کی اس نئی تعلیم کا حشر بلا حظہ ہو کہ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کے

”بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم پر جو بے حساب دولت خرچ کی جا رہی ہے اس کے  
 باوجود عقل و فہم کی سطح میں کوئی خاص اضافہ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

بلکہ ان جدید تعلیم یافتوں میں

”تہایت ادنیٰ قسم کے لٹریچر اور نقلی علم و فن کی طرف میلان خصوصیت سے  
 زیادہ پایا جاتا ہے، بچوں کو بہتر سے بہتر صحت بخش حالات میں رکھ کر پرورش کیا  
 جاتا ہے، اسکولوں میں ان پر انتہائی توجہ صرف کی جاتی ہے پھر بھی ان کے  
 ذہنی و اخلاقی معیار میں کوئی بلندی نہیں پیدا ہوتی۔“

اس مشینی دور کے تمدن و تعلیم کا سب سے پرفخر کارنامہ نئی مشینوں کی ایجادات اور  
 آئے دن سائنسی اکتشافات ہیں لیکن ڈاکٹر موصوف کی رائے میں اس طرح  
 ”روز روز نئی نئی مشینوں کی ایجادات کو بڑھاتے چلے جانے سے کوئی فائدہ  
 حاصل نہ ہوگا۔ اسی طرح طبیعیات و کیمیا و فلکیات (وغیرہ کے سائنسی) اکتشافات  
 پر زیادہ زور دینا بھی بیکار ہے۔“

اس کے بجائے اصل ضرورت اب انسان کو

”خود اپنی اور اپنے ذہنی اور اخلاقی نکتے پن کی طرف توجہ کرنے کی ہے۔۔۔۔۔“  
 ایک طرف ایسے طرز زندگی کو ترقی دیتے چلے جانا جو درحقیقت عظیم الشان انسانی  
 نسلوں کو اخلاقی زوال و انحطاط میں دھکیلتا چلا جا رہا ہے اور ان کے اعلیٰ و  
 اشرف جوہروں کو تباہ کر رہا ہو کوئی دانشمندی کا کام نہیں خود اپنی طرف توجہ کرنا  
 اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ زیادہ تیز رفتار سلیمز زیادہ آرام دہ موٹر زیادہ سستے ریڈیو  
 دور دراز سحابوں (ستاروں) کی شکل و ساخت کی تحقیق کے لئے دور بینیں بناتے  
 رہیں۔۔۔۔۔ اس سے کون سی حقیقی ترقی (ہماری انسانیت میں) ہو جائیگی  
 اگر ہوائی جہاز نے ہم کو یورپ سے چند گھنٹوں میں چین پہنچا دیا۔ یہ کیا ضروری ہے  
 کہ ہر طرح کی پیداواروں کو برابر بڑھاتے چلے جائیں جن کی بدولت انسان غیر ضروری  
 چیزوں کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ بھٹتا رہے“

جن علوم و فنون کو ہم ترقی ترقی جانتے اور پکارتے رہتے ہیں، ڈاکٹر موصوف کے نزدیک  
 اس میں شک کیا ”شائبہ شک“ کی گنجائش نہیں کہ یہ

”میکانکی طبیعیاتی اور کیمیائی علوم ہم کو عقل و فہم، اخلاقی نظم و ضبط، جسمانی صحت  
 تندرستی، علمی توازن و اعتدال اور سیاسی و سماجی امن و امان عطا کرنے سے  
 قطعاً عاجز و قاصر ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ اُلٹے آدمی میں (ان ترقیوں کی بدولت)  
 خطرناک بیماریاں پیدا ہونے کی استعداد بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔  
 اعصاب اور دماغ کو (اس ترقی بازی کی زندگی میں دن رات) مسلسل جھٹکے

لگتے رہتے ہیں عضوی فساد و احتمال سے غذاؤں میں زہریلے مادے پیدا ہوتے

رہتے ہیں جن سے برابر ہم کو متاثر ہوتے رہنا پڑتا ہے۔“

اور تو اور آج ہر جگہ نئے نئے سائنسی طریقوں سے غذائی پیداوار بڑھانے کا جو زور و شور ہے ان ہی ماہر سائنس ڈاکٹر کی زبان سے اس کی برکتوں کا حال بھی سن لیں۔

”غلہ وغیرہ خام غذاؤں میں اب پہلے کے سے قوت بخش اجزا نہیں رہ گئے

ہیں، گیہوں، انڈے، دودھ، پھل، مکھن وغیرہ کی ظاہری شکل و صورت گو

وہی ہو لیکن کثرت پیداوار کی وجہ سے ان کی اندرونی ترکیب بدل گئی ہے

کیمیائی کھادوں نے انہوں کی پیداوار تو بڑھادی ہے مگر زمین کے اجزا میں جو

کمی و کمزوری آگئی ہے اس کی تلافی نہ ہونے سے بالواسطہ غلوں اور ترکاریوں

کی غذائی قوت ہی میں فرق آگیا ہے۔۔۔۔۔“

یہ توجہ دینا تعلیم گاہوں میں پڑھے پڑھائے جانے والے علوم میں سائنس نام جس علم پر

عہد جدید کو سب سے زیادہ غرہ ہے اس کی برکتوں کا ایک مخفی گوشہ تھا، باقی میدان

جنگ میں اس کے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور جراثیمی ہلاکت آفرینیوں کا پوچھنا ہی کیا

خود اس تعلیم و تہذیب کے اہل فکر و دستوں کے سامنے بھی اس کا مستقبل یہی ہے

کہ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی۔“

باقی عام نتیجہ اس نام نہاد تعلیم کا اسی ”خود فراموش“ یا نامعلوم انسان

نام والی کتاب ہی میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس کے سارے طبقات ہی کو اس کے

انجباروں، سستی کتابوں، ریڈیو اور سنیچا کی کثرتوں نے بالکل ذلیل و کمینہ بنا ڈالا ہے، احمدیہ کہ عقل و فہم تک بڑھنے کی جگہ اس تعلیم کی راہ اٹھے۔  
 ”اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ نصابوں کے باوجود روز

بروز بے عقلی و نا فہمی ہی عام ہوتی چلی جا رہی ہے۔“

پھر اس عقل و فہم کی دشمن تعلیم کے پیدا کئے ہوئے تمدن و تہذیب کا انجام اس کے  
 سوا سوچا کیا جاسکتا تھا کہ بنی نوع انسان کو

”تمام اخلاقی بندشوں قیدوں اور مذہبی ضابطوں سے آزاد کر دیا ہے۔“ اور

”ہر بری بھلی جائز و ناجائز راہ سے زر طلبی و زرا اندوزی کی آگ ان کے اندر بھڑکادی

ہے بس اتنی شرط ہے کہ جیل نہ جانا پڑے۔“

آزادی کے بعد سے ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ ہی آزادی سب سے زیادہ  
 بڑھ گئی ہے، دونوں جگہ ہر دفتر و محکمہ میں نیچے سے لیکر اوپر تک اسی تعلیم کے فرزندوں کی  
 اسی زر طلبی یا مالی حرص و ہوس نے طرح طرح کی بد عنوانیوں کا بازار اتنا گرم کر رکھا ہے کہ  
 خود حکومت ہر طرح کی طاقتوں تدبیروں کے باوجود ان کی روک تھام سے بے بس ہو رہی ہے۔  
 آگے خود صاحب یقین کی زبان ایمان و یقین سے ان سارے معائب و  
 مفاسد کا علاج بھی سنتے چلیں کہ صرف مذہب کی طرف پلٹنا ہی اس کا  
 واحد علاج ہے۔

”کیونکہ مذہب ہی انسان کی توجہ کو آخرت کی طرف موڑ کر اس کو نادی ماحول



(اور اس کی ترغیبات) سے بلند کر دیتا ہے لاندہیب آدمی تو مال و متاع کی فراوانی میں بھی اپنے کو غریب ہی محسوس کرتا ہے۔ بخلاف ایک سچے مذہبی آدمی کے کہ وہ مصیبت میں بھی مسرور رہ سکتا ہے، بڑی سے بڑی دولت و ثروت کا مالک ہونا بھی آدمی کو جب دل کا سکھ چین نہیں دے پاتا تو (ایمان والی) صالح زندگی اس کو قناعت و صحت اور مسرت سب کچھ عطا کرتی ہے۔

علاج صد فی صد تیر بہد فہی لیکن اس کا کیا علاج کہ اس تعلیم ہی نے انسان کی عقل و فہم کو اتنا دیوالیہ کر دیا ہے کہ جو علاج تھا اس کو مرض اور مرض کو عین علاج جاننے اور بتلانے لگی اور اتنی موٹی بات تک سمجھنے سے عاری ہے کہ انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی کم و بیش ہر شر و فساد کی بڑی بڑی جڑ ملک و مال، جاہ و اقتدار کی حرص و ہوس ہوتی ہے اور مذہب کی حقیقت انسان کی نظر کو خدا و آخرت کی طرف موڑ کر حب الدنیا اس کل خطیبت کی اس جڑ ہی کو سرے سے کاٹ ڈالتا ہے، رہا مذہب کا خالی نام لے کر اس کو بدنام کرنے والوں نے وہ بھی مذہب کی ہزاروں سال کی تاریخ میں جو کچھ تھوڑا بہت ادھر ادھر کہیں کہیں فساد برپا بھی کیا اس کا نام بھی ان فسادات کے مقابل میں کیا لیا جاسکتا ہے جو لاندہیب کی صرف دو صد سالہ جدید تعلیم اور اس تعلیم کی بھی موجودہ صدی کی صرف آٹھ سال کی دو عظیم اور جہانگیر جنگوں نے دنیا بھر میں مچا رکھے ہیں اور جن سے پیدا ہونے والی تیسری جہاں سوز جنگ کے تصور سے جنگ و امن والے سب ہی لرزہ بر اندام ہیں کہ وہ ساری دنیا و انسانیت اور اس سارے تمدن

ثقافت سب ہی کو بھسم کر کے رکھ دینے والی ہوگی۔

امریکہ کے مشہور روزنامہ نیویارک ٹائمز میں اس موجودہ بیسویں صدی کی برکتوں پر بے خانماں انسان کی بھیمانک صدی کے عنوان سے ایک مضمون نکلا ہے اس میں اس صدی کی جو برکتیں گنائی گئی ہیں ان ہی میں یہ ہے کہ ”یہ لڑائی جھگڑوں کی صدی ہے کیونکہ یہ جان و مال دونوں کی بربادی تباہی کی ایسی وسیع پیمانوں پر عالمگیر جنگوں کا زمانہ ہے جس کی خوں ریزی کی سابق داستانوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔“

آگے اسی مضمون میں ڈاکٹر ایلفی ریس نامی کسی بڑے مستند و ماہر کے حوالہ سے اس بابرکات صدی کو خانماں برباد انسان کی صدی کہا گیا ہے کہ ”دنیا کی معلوم تاریخ میں نہ کبھی اتنے انسانوں کو ان کے ملکوں سے نکالا گیا اور نہ اس طرح کبھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگنے پر لوگ مجبور کئے گئے، اس صدی کی سب سے نمایاں برکت و خصوصیت یہی تو بتائی گئی ہے کہ ”خانہ بدریا اپنے گھر سے نکالا ہوا انسان اس صدی کا ویسا ہی خاص نشان ہے جیسا کہ ایٹم کا توڑا جانا جس کی بدولت ایٹم بم بنا۔“ دیکھا آپ نے اس جدید تعلیم و تہذیب کی ترقی، اس کے خود گھر کے بھیدی جو ذرا بھی صاحب فکر و نظر ہیں خود ان کی نظریں اور خود دنیا ہی کے لئے خیر و صلاح سے کہیں بڑھ چڑھ کر شر و فساد کا کیسا مجموعہ و شیع ظاہر و ثابت ہو رہی ہے لیکن دنیا کے

۱۶ اگست ۱۹۵۳ء منقولہ یقین ۲۲ ستمبر ۱۹۵۳ء

حق میں بفرض یہ سراپا خیر ہی خیر ہوتی تو بھی دین کے حق میں جب اس کے مقاصد طرح طرح کی علانیہ بد اعمالیوں اور بد اخلاقیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ عقائد و ایمانیات تک ان کی زد سے محفوظ نہیں تو اسلام اور مسلمان کی نظر میں اس سے بڑھ کر کون سا منکر ہو گا جس کی اصلاح و انسداد پر سب سے زیادہ زور لگانے کی ضرورت ہو؟ جب تک اس تعلیم اور اس کی آوردہ تہذیب و تمدن والوں کا حکومتوں پر غلبہ و تسلط ہے اس وقت تک اس کا کامل و کلی انسداد و استیصال دشوار یقیناً بہت ہے تاہم ناممکن بہر حال نہیں اور ممکن ہو یا ناممکن مسلمان کا کام تو تو اسی بالحق کے نظام کے مطابق معروف و منکر کے امر و نہی کی اپنی والی انفرادی و اجتماعی ممکنہ جدوجہد تو کرتے ہی رہنا ہے باز پرس کامیابی و ناکامی کی نہیں امکانی سعی و تدبیر کی ہوگی اور گورننگی طرز کے نام تہاد آئینی احتجاجات بھی طرح طرح کے جانی و مالی ایہانی و اخلاقی فسادات کا نام اور اسلامی مزاج کے ناموافق ہی ہیں تاہم جب بہت سے دنیوی سیاسی و معاشی معاملات میں ان آئینی احتجاجات کے رائج الوقت ذرائع سے کام لے کر حکومتی اور غیر حکومتی ادارات سے اپنے واجب ہی نہیں بارہا ناواجب مطالبات تک متوائے جاتے ہیں تو ان کے بجائے ان ہی جائز و قانونی تدبیروں سے پرمفاسد تعلیم جدید کے دینی و اخلاقی منکرات و مفاسد کی اصلاح و انسداد میں ہی کیوں کام نہیں لیا جاسکتا خصوصاً مسلمان حکومتوں میں عوام کو ساتھ لیکر جائز و مناسب احتجاجی تحریکات کے ذریعہ حکومتوں اور یونیورسٹیوں کے ارباب بست و کشاد کو

کیوں نہیں مجبور کیا جاسکتا کہ وہ اس تعلیم کو عملاً و عملاً اسلامی تعلیمات کے موافق بنائیں اور چلائیں، یا کم از کم ایمان و عمل صالح کی زندگی پر اس کے ناموافق اثرات ہی کی روک تھام کا پورا پورا بندوبست کریں، اس کا انتظار کیوں کیا جائے کہ جب تک پوری حکومت ہی کا ڈھانچہ بدل کر نیچے سے اوپر تک اسلامی نہ ہو جائے، اس وقت تک اس سب سے بڑے منکر نام نہاد تعلیم کے ایمانی و عملی منکرات کو آزادی سے پھلنے پھولنے دیا جائے، دریاں حالیکہ ایسی تعلیم کے فرزند مسلمان حکومتوں تک پر مسلط ہو کر مصر و پاکستان اور انڈونیشیا ہر جگہ ان کو اسلامی بنانے میں سب سے زیادہ سنگ راہ بلکہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر اسلام دشمنی میں ان سے آگے نکل جاتے ہیں۔ مصر میں جو اخوان کے ساتھ اور پاکستان میں مخالف قادیانیت تحریک کے ساتھ جو کچھ اس تعلیم جدید کے نام تہاد فرزندان اسلام کے ہاتھوں ہوا کیا کوئی غیر مسلم دین دشمن حکومت بھی اس سے آگے جاسکتی تھی! پھر قادیانیت کے فتنہ ارتداد کو روکنے کے لئے تو راست اقدام (ڈائریکٹ ایکشن) کے فاروست حربہ تک سے کام لینے کا جواز سمجھیں آگیا لیکن جن کابجوں اور یونیورسٹیوں کی راہ سے کم و بیش پوری کی پوری مسلمان نسلیں عملاً اسلام سے پھرتی اور حریفوں کے کیمپ میں شریک ہوتی چلی جا رہی ہیں ان کو درست کرنے یا ان سے بچانے کی کسی اجتماعی و احتجاجی تحریک کا کیا ذکر، شاذ ہی کسی دیندار سے دیندار مسلمان کو انفرادی طور پر بھی خود اپنی اولاد تک کو ان دین لہوا اور آخرت کش جدید تعلیم کا ہوں میں جھونک دینے میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ جھجک

بھی محسوس ہوئی ہو۔ عوام کیا اچھے سے اچھے علما و مشائخ نے اب یہاں تک ترقی کر لی  
ہے کہ لڑکیوں تک کو بی اے۔ ایم اے کرنا ضروری جانتے ہیں خواہ وہ کالج سے نکلتے نکلتے  
کمونسٹ ہی ہو کر کیوں نہ کسی خاندان "علم و عمل" کا نام روشن کریں اور یہ ضرورت ہے کیا؟  
وہ بھی سن لیں کہ صاحبزادی کو بی اے، ایم اے بنائے بغیر بی اے، ایم اے داماد نہیں ملتا!  
جدید تعلیم کا دھارا ایسا ہے | وہ تو خدا بھلا کرے حکومت و سیاست کے ذوق و شوق ہی کا کہ  
وقومی اسلام کی طرف اس کی بدولت پھر بھی دین اسلام کی طرف نہ سہی دنیوی یا  
سیاسی و قومی اسلام کی طرف اس جدید تعلیم کا دھارا کچھ نہ کچھ مڑ گیا ہے آخرت  
کی فکر نہ ہو، روزہ نماز کی پرواہ نہ ہو، بلکہ ایمان تک کی خیر نہ ہو لیکن قومی مسلمان بنے  
رہنے پر اصرار پیدا ہو گیا ہے اس سے ان کو دینی مسلمان بنانے کا بھی بھرا اللہ ایک  
راستہ نکل آیا ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی تو خیر براہ راست  
ہی سیاسی جذبہ کو اپیل کرتی ہے، جماعت الیاسی جیسی خالص تبلیغی جماعت کو بھی جہانگ  
جدید طبقات میں کامیابی کا تعلق ہے بڑی حد تک دھارے کا یہی موڑ کام دے رہا ہے  
لوہا گرم ہے، ایسی جماعتوں کی بڑی دینی خدمت و سعادت ہے کہ اس کو توڑ موڑ کر  
رُخ دین کی طرف پھیر رہی ہیں۔

قدیم مدرسے نصاب میں مناسب جدید تبدیلی | ایک بڑی تعمیری تدبیر خود ہمارے پرانے دینی بڑے  
کے ساتھ مثالی درس گاہ کے قیام کی ضرورت | دارالعلوموں اور ان کے علما کے ہاتھ میں ہے۔  
ان مدرسوں میں ابتدا سے انتہا تک دس بارہ سال تک کا نصاب ہوتا ہے جس میں سب

اصلاح و رد و بدل سے بہت آسانی کے ساتھ انگریزی زبان اور بعض جدید علوم مثلاً سیاسیات  
 و معاشیات اور فلسفہ خصوصاً سائنس کو شریک کر لینا چاہئے۔ آخر جو قوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
 بنا سکتی ہے اور سیکڑوں ہائی اسکول و کالج چلا سکتی ہے وہ دو ایک دینی مدرسے ایسے  
 نہیں بنا سکتی جن میں سائنس کے تجربہ قانون وغیرہ کے لوازم کے ساتھ کم از کم اتنا ہی  
 انتظام ہو جتنا بی اس سی، ام اس سی تک کے معمولی کالجوں میں ہوتا ہے، البتہ شرط یہ  
 ہے کہ ان جدید علوم و فنون کی حیثیت ضمنی و ثانوی رہے اور غلبہ ہر طرح علوم دین  
 کا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر مقدم و ضروری شرط یہ ہے کہ تربیت کا انتظام و اہتمام  
 تمام تر دینی اور بالکل اہل دین یا صلح و متقی علماء کے ہاتھوں میں ہو اور ارکان و  
 اساتذہ سے لیکر شاگرد پیشہ تک اس کا شدت سے التزام رہے کہ ان تعلیم گاہوں سے  
 کوئی تعلیمی و انتظامی تعلق رکھنے والا ایمان و عمل صالح کی ظاہری و باطنی اقل  
 قلیل مطلوب معیار سے گرا ہوا ہرگز ہرگز نہ ہو۔ ورنہ خالی جدید علوم و فنون کا پیوند  
 لگا دینے سے قوی اندیشہ ان ہی اثرات کے غالب آجانے کا ہے جس کا سب سے  
 بڑھ کر تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی خصوصاً اس کے شعبہ دینیات میں کیا جا چکا۔ اسی کو  
 دھرنے سے بہتر تو پرانے دینی دارالعلوموں کو اپنے پرانے حال میں پڑا رہنے دینا ہوگا۔  
 لیکن اگر دینی تعلیم و تربیت اور ایمان و عمل صالح کی پوری نگرانی و حفاظت کے  
 ساتھ جدید علوم و فنون کی بھی واقفیت و مہارت کو پیدا کر دیا جاسکا، تو ایسی دینی  
 درسگاہوں کو کوئی حکومت سرکاری طور پر تسلیم نہ بھی کرے تب بھی انشاء اللہ ان کے

تعلیم یافتہ اپنی دینی تربیت و اخلاقی سیرت کے ساتھ ان جدید علوم میں بھی جدید کالجوں سے اتنے ممتاز ہوں گے کہ علم و فن یا سائنس و آرٹ کے جس میدان میں بھی وہ اپنے نمایاں جوہر لے کر سامنے آئیں گے، سرکاری اور غیر سرکاری سب ہی ادارات کو جھک مار کر ان کا لوہا ماننا اور سیرت و کردار سے معزاز و تہاد تعلیم یافتوں کے مقابلہ میں ترجیح دینا پڑے گا جن کے چھوٹوں بڑوں کم و بیش سب ہی کی مفاد پرستیوں، خود غرضیوں، رشوت ستانیوں، اقربا پروریوں اور طرح طرح کی بدعنوانیوں نے ہر حکومت کے ہر چھوٹے بڑے محکمہ کو گزندہ اور سارے عوام کو آشفتنہ و پرانگندہ کر رکھا ہے۔ صحیح دینی تربیت و تعلیم کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ دل و دماغ اعمال و اخلاق سب کو سنوار دیتی ہے۔

ساتھ ہی عمومی | یہ تو عہد جدید کے ایمانی و عملی منکرات کی منکر ترین جزو تعلیم جدید کے اثر نہی کی اہمیت | متعلق کچھ معروضات تھے اب اس جز کے تناور درخت کی صورت و قوت حاصل کر لینے کے بعد گھر باہر، عورتوں مردوں میں، دفتروں بازاروں میں، کھیل تماشوں میں، فلموں سڑکوں میں، قمار خانوں گھوڑ دوڑوں میں، کلبوں تفریحوں میں، حدیہ کہ اخباروں رسالوں اور کتابوں تک کی راہوں سے فحشا و منکر کے جو گونا گوں برگ و بار پھیل گئے اور روز بروز پھیلتے ہی جا رہے ہیں، ان کو براہ راست فوری طور پر روکنے اور سپا کرنے کی کوئی کارگر صورت بجز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مذکورہ صدر اسلامی و قرآنی نظام و اہتمام کے نہیں رہ گئی ہے جس چھوٹے بڑے ملک و معاشرہ میں اس نظم و نظام کے تحت منکرات پر انکار کا حق ادا کیا جائے گا ناممکن ہے کہ اس میں اس

شجر خبیث کے برگ و بار سبز و شاداب رہ سکیں اور بالآخر آبیاری سے محروم رہ کر اس کی  
 جڑیں بھی خشک نہ ہو جائیں۔

غیر تعلیم یافتہ نسلی مسلمانوں میں | رہے عام پرانے غیر تعلیم یافتہ نسلی مسلمان ان کا معاملہ تو  
 دعوت خیر کی ضرورت | تعلیم یافتہ قومی مسلمانوں سے بالکل الگ ہے وہ اس معنی

میں تو یقیناً "نسلی" ہیں کہ باپ دادا نے جس دین کو قبول کیا تھا اسی کو وہ بھی تقلیدی و اجمالی  
 طور پر پانتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم ان کا یہ ماننا کسی قومی سیاسی و معاشی مفاد و منفعت کی

بنیاد پر ہے نہ حکومت کے عہدوں منصبوں ممبروں اور وزارتوں وغیرہ میں کوئی حصہ لگانے  
 کے لئے، نہ اور کسی طرح کے خود اپنے یا اپنے خاندان والوں کے لئے جاہی و مالی فائدوں کی

خاطر۔ البتہ ان میں اجمالی ایمان کے ساتھ نسلیانہ نسل سے تفصیلی ایمان و عمل صالح کی خرابیاں  
 اور کوتاہیاں، بدعات و خرافات ضرور جاگزیں چلی آرہی ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس کا

بھی سب سے بڑا بلکہ واحد سبب معروف و منکر کے اسلامی نظام کی ذمہ دار اولین جماعت  
 ولتکن منکر امت کی اپنی ذمہ داریوں سے مسلسل غفلت و کوتاہی ہے۔ ایسی جماعت

کافرینہ ایک طرف دعوت خیر (یدعون الی الخیر) یعنی خیر یا معروف کے  
 تمام ایمانی و عملی شعبوں کے تفصیلی احکام کی دعوت و تبلیغ یا ان سے ان عوام کو واقف

رکھنا تھا اور دوسری طرف یا مہرین بالمعروف و ینہون عن المنکر کے تحت ان  
 احکام پر عمل کا حکم دیتے اور ان میں کوتاہیوں سے روکتے رہتا تھا۔ ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات۔

لیکن بات بہر حال وہی ہے کہ دینی تعلیم کے درسوں پر درسے تو قائم ہوتے اور ان سے



دینی علوم و احکام کے علما ہزار ہا ہزار کی تعداد میں نکلتے رہے۔ لیکن عوام و جہلا میں پھیل کر ان علوم و احکام کو پہچاننے اور ان پر عمل کی نگرانی کا کوئی داعیہ جب ان میں درسوں کے اندر پیدا ہی نہیں کیا گیا تو درسوں سے باہر آکر وہ اس کو اپنا فرض کیسے جانتے اور بتاتے۔ سارے مسلمان مرد و عورت درسوں میں داخل ہو کر عالم نہیں بنائے جاسکتے تھے اور جو بنے یا بنائے گئے تھے انھوں نے غیر عالموں یعنی عوام و جہلا تک اپنے علم یا احکام دین کو پہنچایا نہیں۔ نتیجہ اس کا جو ہونا تھا وہی ہوا کہ نسلی نسل سے جہل و جہالت کی تہیں پر تہیں جمتی چلی گئیں اور اب وہ نسلی مسلمانوں کا سواد اعظم ہر جگہ نام و نسل ہی کا مسلمان ہو کر رہ گیا ہے، مرض مزمن ہو کر رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے علاج بہت دشوار ہو گیا ہے پھر بھی لا علاج نہیں۔ مگر علاج ہے وہی ایک ہی کہ منکم امۃ واسلے علمائے دین جن دینی درسگاہوں میں تیار ہوتے ہیں وہاں کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور ان کا امتحان دینے لینے سے زیادہ بہت زیادہ **يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** جو اس تعلیم و تعلم کا اصل مقصد و مدعا ہے اس کی لگن پیدا کرتے کرتے رہنا ہے، تاکہ اس کتابی و امتحانی سلسلہ سے فارغ ہو کر جس کی حیثیت محض وسیلہ کی ہے مقصد کی نہیں دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اپنے اصلی مقصد و منصبی فرض میں لگ لگا سکیں۔

اصلاح کی | دینی درسوں میں یہ بنیادی اصلاح تو ہر صورت میں اہم و اقدم ہے ہی۔ پھر بھی فوری تدبیر | یہ "تربیۃ از عراق" کا معاملہ ہے۔ فوری تدبیر یہ ہے کہ اس وقت بھی

ماشاء اللہ ہر ملک خصوصاً ہندوستان و پاکستان میں جو ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے  
 علما اور ذی علم مشائخ موجود ہیں ان میں تھوڑے بہت اہل اخلاص کی سمجھیں بھی اگر اپنے  
 عالم دین ہونے کا یہ فرض منصبی اور مقصد و مقام آجائے تو خود اپنی اپنی جگہ یا جو جمع  
 ہو سکیں ایک جگہ جمع ہو کر موجودہ حالات کے مناسب اپنے محدود دائرہ ہی کی حد تک سہی  
 (جو بہتوں کا خاصا وسیع ہے) ایسا عملی نظام اختیار کر لیں جس میں اسی دائرہ کے محلہ محلہ  
 قریہ قریہ اور گھر گھر تک ایمان و عمل کے تفصیلی احکام پہنچانے (دعوت الی الخیر) اور  
 ان پر عمل کی نگرانی (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کا اہتمام و انتظام ہو تو انشاء اللہ  
 کام چلی پڑے گا اور دوسروں کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

راقم نالائق و ناکارہ کو تو یقین و اثق ہے کہ کسی معتدبہ آبادی میں ایمان و عمل  
 صالح کی اسلامی زندگی کو صد فی صد نہیں کسی معتدبہ درجہ ہی تک — مگر خالی  
 نماز روزہ ہی میں نہیں — ظاہر و باطن اخلاق و معاملات اور معاشرت سب  
 میں اتنے نمایاں طور پر برپا و مشاہدہ کر دیا جائے کہ لوگوں کو وہاں کے مسلمانوں کے ہر  
 طبقہ میں — امیروں میں غریبوں میں، دوکانداروں میں دست کاروں میں، کاشتکاروں  
 میں زمینداروں میں، مزدوروں میں، کارخانہ داروں میں، نوکروں میں، آقاؤں میں، شوہروں  
 میں بیویوں میں، اولاد میں والدین میں، شاگردوں میں استادوں میں، گھر باہر جگہ —  
 اسلامی زندگی چلتی پھرتی جیتی جاگتی نظر آئے تو پھر خدا نے چاہا ہی آبادی خواہ وہ قصبہ  
 ہی کی ہو مدینۃ النبی (فداہ بابی وامی) کا نمونہ پر تو بن کر اپنے اثرات کو آہستہ آہستہ

سہی مگر مضبوط قدموں کے ساتھ بڑھا سکتی ہے بلکہ انشاء اللہ یہی مدنی داغ بیل صحیح اسلامی حکومت کے قیام و کوشش کی بنیاد بن جا سکتی ہے۔

اسلام کی تعلیم پر عمل میں بالخصوص مقتناطیس کی کوشش و جاذبیت ہے۔ شرط بس عمل ہی ہے۔ مقتناطیس کی جاذبیت بھی جب تک مقتناطیس رو برو نہ ہو، خالی جاذبیت پر تقریر و تحریر کی سرگرمیاں یا رسائل و تصانیف کے انباروں سے جاذبیت ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسلامی ایمان و عمل صالح کی ایسی جامع زندگی والی آبادی و معاشرہ کسی غیر اسلامی ملک میں محکوم رہ کر بھی، مثلاً آج ہندوستان ہی میں آنکھوں کے سامنے آجائے تو اس کے افراد کو حاکموں سے اپنے حصے کی انشاء اللہ نوکریوں کی بھیجک ہرگز نہ مانگنا پڑے گی۔

الصادق الایمن (علیہ التمجید والتسلیم) کے اسوہ کی قدیم عملی شہادت صاحب صدق جدید کو ہر دوسرے تیسرے پینے اکائیوں و دہائیوں بلکہ کبھی کبھی سیکڑوں کے مقابلے میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مقام صفر پر چھاپنا پڑے گا۔ ایسے معاشرہ یا سوسائٹی کے افراد کو حکومت و حاکم نوکریاں دینے کے لئے خود ہی ڈھونڈنا پڑیں گے اور اگر کسی چھوٹے بڑے خطہ میں ایسے معاشرہ کی حکومت — کہ یہی واقعی اسلامی حکومت ہوگی — قائم ہو جائے تو اس کو دیکھنے والے دوسرے ملکوں کے عوام یا شہری خود ہی نام کی جمہوریت و اشتراکیت سب کا نام لینا چھوڑ دیں گے اور اسلام کے دامن ہی میں نجات کو یقین کرنے پر مضطر ہوں گے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں مسلمان جب مسلمان تھے تو ان کی تاریخ حکمرانی کے یہ واقعات و تجربات ہیں کہ غیر بھی

اپنوں کے مقابلہ میں ان کی حکومت ہی کو ترجیح دیتے تھے اور محکومانہ اقلیت میں ہو کر بھی وہ حاکمانہ اکثریت والوں کی آنکھ کا تارہ بن کر رہتے تھے۔ جس کی بعض شہادتیں خود اسی ہندوستان میں مولانا گیلانی سلمہ کی کتاب ہزار سال پہلے سے اور کہیں درج ہو چکی ہیں۔

بات میں بات نکلتی چلی آرہی ہے۔ کہنا ہر پھر کر ایک ہی بات ہے کہ دین ہی نہیں مسلمانوں کی دنیا کے بھی تمام انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی مسائل و مشکلات کا حل و علاج ہے ایک ہی۔ ایمان و عمل صالح کی اسلامی تعلیمات و مطالبات کے مطابق مسلمان بننا پانا اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ میں بننا پانا۔ تدبیر بھی اس کی وہی ایک اور صرف ایک ہی ہے تو اسی بالحق یا معروف و منکر کے امر و نہی کے نظم و نظام کا از سر نو اجیا و اجرا جو کم و بیش ہر معاشرہ اور ہر طبقہ کے مسلمانوں میں ہر جگہ ہی بالکلہ نسبتاً اور معدوم و معطل ہو چکا ہے۔

## کچھ مزید دیکھو

اس از سر نو اجیا و اجرا کی اہمیت کے مد نظر پھر کچھ مزید دیکھ کر خاص طور پر عملی نقطہ نظر سے عرض کیا جاتا ہے۔

انبیائی کام کی ذمہ داری | جس طرح دعوت خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی ابتدا حضرات  
اب علمائے امت پر ہے | انبیا اور آخر میں حضرت خاتم الانبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت

ظہور سے ہوئی۔ اسی طرح اس کا بقا و قیام اجیا و تجدید ہر لحاظ سے "وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ اُمَّةٌ"۔

کے امر کے مطابق ابتدائی و اولین ذمہ داری تمام تریزنی اسرائیل کے انبیاء ہی کا سادرجہ و مقام رکھنے والے امت محمدیہ (علیہ السلام و التحیہ) کے حضرات علما کی ہے اور کتاب و سنت ہی کے مطابق عقلاً و نقلاً ہر اعتبار سے اس کا عملی پروگرام یہ ہے کہ

جو علما گذراوقات کے بقدر فارغ البال ہیں یا ہو سکتے ہیں یا توکل کی ہمت و زندگی رکھتے ہیں ان کا تو دن رات کا کام بالکلیہ ایک طرف دعوتِ خیر یعنی ترغیب و ترہیب کے ساتھ گھر باہر اپنوں پر ایوں کو جہانگ جتنی زیادہ سے زیادہ پہنچا ہو سکے پہنچانا ہے اور دوسری طرف ان احکام پر عمل کی نگرانی جس کا نام معروف و منکر کا امر و نہی ہے۔

دعوتِ خیر کا خصوصی	دعوتِ خیر کے یہ احکام خصوصیت کے ساتھ وہ ہوں گے جن کا روزمرہ کی
دائرہ	زندگی میں کم و بیش ہر مسلمان سے اسلام کا مطالبہ ہے اور ان میں عقائد و

عبادات، معاملات و اخلاق اور معاشرت کے احکام پر زیادہ زور ہو کہ ان سے عام طور پر زیادہ جہل و غفلت ہے۔ اور ان کے بغیر عقائد و عبادات بھی کمزور و بے جان ہی رہتے ہیں۔ نیز مسلمانوں غیر مسلمانوں سب کے دل میں دین اسلام کی برتری و فضیلت، اس کی طرف کشش و رغبت کے لئے تعالیٰ دعوتی و اصلاحی تقریر و تحریر بجائے خود کافی ہرگز نہیں، البتہ معاملات اور معاشرت کی اسلامی تعلیمات پر عمل کے ایسے ٹھوس تجربات

۱۰ ایک غلطی خدا جانے بعض اکابر حضرات اور سلف تک کو یہ کیسے لگی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف حکومت یا حاکمانہ اقتدار رکھنے والوں کا کام ہے حالانکہ اس تخصیص کی دلیل ہی سے کتاب و سنت و اولیٰ خالی نہیں بلکہ تعمیم کے دلائل سے پُر ہیں البتہ ہر حکم کی طرح کچھ قیود و شرائط اس کے بھی ہیں۔

جو لوگوں کو دنیا والوں کی عام انفرادی و اجتماعی قومی و وطنی خود غرضیوں اور مفاد پرستیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی علانیہ خدا پرستی و آخرت پسندی پر گواہی دینے والے ہوں وہ زبانی و کاغذی دعووں اور دعوت کے بغیر بھی دشمنوں سے اسلام اور مسلمانوں کا اخلاقی لوہا منوا سکتے ہیں۔

معروف و منکر کے امر و نہی کا چرچا بھی ہو اور ادینی تعلیمات کی یہ عملی زندگی کسی معاشرہ یا امت  
معروف کی قدر اور منکر کی تحقیر بھی پیدا کی جائے جماعت میں جماعتی حیثیت سے تب ہی رومنا

ہو سکتی ہے جبکہ ایک طرف اس میں معروف و منکر کے امر و نہی کا چرچا ہو اور دوسری طرف معروف کی پسندیدگی اس کی عزت و عظمت و برتری اور منکر سے بیزاری و ناراضی اس کی کمتری و حقارت کو برابر محسوس کیا جاتا ہو۔ صحاح کی مشہور حدیث بلکہ خود قرآن ہی کی تفسیری روایت ہے کہ

”بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فساد یہی پیدا ہوا کہ ایک دوسرے سے ملتا اور دیکھتا کہ وہ کسی برائی یا منکر میں مبتلا ہے تو کہتا کہ خدا سے ڈرو اور یہ حرکت چھوڑ دو، یہ جائز نہیں۔ پھر دوسرے دن ملتا اور بدستور اس برائی میں مبتلا پاتا، تو بھی نہ اس کے ساتھ کھانے پینے سے باز رہتا، نہ اٹھنے بیٹھنے سے، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب ہی کے دل ایک طرح کے کر ڈالے۔“

یعنی جو پہلے دوسروں کو منع کرتے تھے خود ہی اس برائی میں مبتلا ہونے لگے بالکل نفسیاتی بات ہے کہ جیسے لوگوں سے ہم خلا ملا میل بلاپ رکھیں گے خود بھی آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر ان ہی کے رنگ میں رنگتے جائیں گے۔ بہر حال ارشادِ بالا کے ساتھ ہی حضور نے قرآن مجید کی

یہ آیات تلاوت فرمائیں کہ

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ  
مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا إِذْ أَخَذْنَا هُونًا مِنْكَ  
فَعَلَوْهُ لِبَيْسٍ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ  
كَفَرُوا وَالْبَيْسَ مَا قَدَّمَتْ أَنْفُسُهُمْ . . . . . فَاسِقُونَ ۝ (۸۱ تا ۸۵) -

”بنی اسرائیل میں کفر کرنے والے داؤد و عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے اس  
بنا پر لعنت زدہ ٹھہرائے گئے کہ وہ گناہ کرتے (شریعت کے حدود سے) تجاوز کرتے (پھر  
بھی) ایک دوسرے کو برے کاموں سے منع نہ کرتے۔ یقیناً ان کا یہ (خاموشی و رواداری)  
کا طرز عمل بہت ہی برا تھا (بلکہ) بہتوں کو تم ان میں سے دیکھو گے کہ کفر یا نافرمانی  
کی باتیں کرنے والوں سے دوستی کا معاملہ رکھتے ہیں۔ سو یہ اور بھی بہت ہی برا ہے جو  
انہوں نے اپنی عاقبت و انجام کے حق میں کر رکھا ہے۔“

بنی اسرائیل کے اس طرز عمل کی بدولت ملعون و مردود ٹھہرائے جانے پر خود قرآن مجید سے  
استشہاد قرا کر اصل بدعا حضور کا ظاہر ہے کہ خود اپنی امت کو اس انجام سے ڈرانا اور متنبہ  
فرمانا تھا۔ چنانچہ آگے ہی ارشاد ہوا اور کس قوت و شدت کے ساتھ کہ

”خوب آگاہ رہو! خدا کی قسم تم معروف کا حکم اور منکر سے منع ضرور کرتے رہنا اور ظالم  
کا ہاتھ (جہاں تک ہو سکے) ظلم سے روک لینا اور اس کو حق کی طرف پھیر دینا اور اس کو  
حق ہی پر اچھی طرح جمائے رکھنا اور نہ یاد رکھو کہ (بنی اسرائیل ہی کی طرح) تم سب کے دل

بھی ضرور اللہ تعالیٰ (ناقر بانی پردلیری میں) ایک ہی طرح کے کر ڈالے گا اور ضرور تم کو بھی

اسی طرح لعنت زدہ کر دے گا جس طرح ان کو کر دیا۔“

تریزی شریف کی اسی روایت میں خصوصیت کے ساتھ علمائے بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ

”وہ بنی اسرائیل کو گناہوں سے روکتے پھر اگر وہ نہ روکتے تو یہ ان کے ساتھ میل جول سے احتیاط

نہ کرتے بلکہ ان کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے، کھاتے پیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدائے سب ہی کے دل

ایک طرح کے کر ڈالے (یعنی سب ہی گناہوں پر دلیر ہو گئے) اور آخر اسی شخصیان اور

سکرشی کی وجہ سے ان کے انبیاء اور رؤسای (علیہم السلام) ہی کی زبان سے ان کو لعنت زدہ

فرما چھوڑا۔ آگے اسی روایت میں تریزی ہی میں یہ بھی ہے کہ آپ نکیہ لگائے تشریف فرما

تھے اس سے اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

کہ تمہارے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہو کر رہے گا حتیٰ کہ تم ظالموں اور نافرمانوں

کو حق کی طرف پھیرتے اور اس پر جانتے رہو۔ ظاہر ہے کہ علماء پر اور بھی خصوصیت سے

نہ صرف معروف و منکر کے امر و نہی کا فرض عائد ہوتا بلکہ علانیہ منکرات و معاصی والوں

کے ساتھ نشست و برخاست میل جول کے تعلقات سے بھی احتیاط زیادہ ضروری ہے

کہ اس بدابنت و مسامحت سے نہ صرف ان منکرات والوں کی منکرات پر جرات برپا ہوتی

ہے بلکہ عوام اپنے مقتداؤں کی ان بے احتیاطیوں کو دیکھ کر فاسقوں و فاجروں کے

ساتھ خلا بلا، میل بلاپ بلکہ ان کے معاصی و منکرات میں ہر طرح شرکت و اعانت

(تعاون علی الاثم والعدوان) تک جا پہنچتے ہیں۔



انسان کی انسانی فطرت و بشریت کی یہ کوئی بڑی باریک بات نہیں کہ وہ صحبت خصوصاً نفس پرستی اور ہوا و ہوس کی صحبت و قرب سے زیادہ اور جلد اثر پذیر ہوتا ہے۔ بارہا اچھے خاصے نیک سرشت لوگوں کے دلوں میں بھی اس راہ سے بڑی بڑی برائیاں دیے پاؤں اس طرح راہ پا جاتی ہیں کہ غریبوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ زہر پیتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرے یہ بھی انسان کی جانی پہچانی معمولی نفسیات ہی ہے کہ سوسائٹی یا سماج یا ہم جنسوں اور ہم چشموں میں جن باتوں کو ذلت و حقارت یا بری نگاہ سے دیکھا جائے آدمی ان کے ارتکاب میں بہت ہچکچاتا ہے۔ پولیس و عدالت خدا و آخرت سے بھی ہر کس و ناکس اتنا نہیں ڈرتا جتنا معاشرہ یا بھائی بندوں میں بدنامی یا ذلت سے۔ تو پھر دین اسلام جس کی تعلیمات قدم قدم پر انسانی فطرت و نفسیات کی دقیق دقیق رعایتوں پر مبنی ہیں، وہ خیر و شر صلاح و فساد یا معروف و منکر کے معاملہ میں ان سماجی عوامل و موثرات سے چشم پوشی کیسے گوارا کر سکتا اور افراد کو اس کی کھلی چھوٹ دے سکتا ہے کہ جس کا جوچی چاہے من مانی کرتا رہے اور علانیہ فسق و فجور، فواحش و منکرات تک پر دوسروں کی طرف سے نہ کوئی روک ٹوک ہو نہ دوستی و رشتہ داری کے تعلقات اور سماجی عزت و ذلت نیک نامی و بدنامی میں کوئی فرق آئے۔ قانون و عدالت کی گرفت میں اندھیرے اُجالے ہر وقت ہر جگہ ہر شخص آسانی سے نہیں آسکتا نہ خدا و آخرت ہی کا خیال و خوف عوام الناس میں اس درجہ کا پیدا کرنا آسان ہے کہ وہ ہر برائی کا ہر موقع پر ہاتھ پکڑ لے۔ یہ تو جن میں ہم ہر وقت رہتے رہتے، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہیں اور جن کی نظروں میں عزت و ذلت، نیک نامی و

بدنامی کا احساس قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے، انھیں کے اندر نیکی و بدی، معروف و منکر کے احساس کو اتنا بیدار و جاندار رکھنا چاہئے کہ مجموعی حیثیت سے سوسائٹی علانیہ فواحش و منکرات کو برداشت ہی نہ کر سکے اور حال و قال زبان و عمل ہر طرح ہر طرف سے ان پر بیزاری و ناراضی کا رد عمل ان کے ارتکاب کرنے والوں کو محسوس کرنا پڑے۔ ورنہ جس معاشرہ میں معروف و منکر دونوں کو بے حسی نے کم و بیش ایک سطح پر رکھ دیا ہو کہ نہ معروف پر تحسین و احترام کے جذبات کا کوئی خاص رد عمل نمایاں ہوتا ہو اور نہ منکر پر ناراضی و ناپسندیدگی کا، تو یہی نہیں کہ ایسے ملک و معاشرہ میں روز بروز معروف کمزور ہوتا اور منکر زور پکڑتا جائے گا، بلکہ عملاً لوگ معروف کا معروف اور منکر کا منکر ہونا ہی بھول جائیں گے اور بالآخر معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھا جانے لگے گا۔ جب معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھا جانے لگے تو ہوتے ہوتے (اعاذنا اللہ) اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ معروف سے روکا جائے اور منکر کا حکم دیا جانے لگے! کیا اس روزِ بد کے قریب ہم نہیں آگئے ہیں؟ بلکہ کیا آج بھی بہت سے منکر معروف اور معروف منکر نہیں بن چکے ہیں؟ اور کتنے کھلے کھلے شرکیات و بدعات و فواحش و منکرات ہیں، جن کی بے دھڑک عین دینداری یا تہذیب و ثقافت آرٹ اور کلچر کے خوشناموں سے تعلیم و دعوت دی جانے لگی ہے! قرآن نے جن اعمال و حرکات کی بدولت سب سے زیادہ گھائے ٹوٹے زبان و خسران میں پڑنے کی خبر دی ہے (هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا) وہ ایسے ہی لوگوں کی تو ہے جو دنیا پرستی کی ساری برائیوں میں لت پت ہو کر بھی (الَّذِينَ ضَلَّ

سَعِيْرُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا) اپنی اوندھی عقلوں اور خوش فہمیوں سے سمجھے ہی جا رہے ہیں کہ بڑے کار نمایاں انجام دے رہے ہیں (يَجْسَبُونَ أَهْمَهُمْ يَجْسَبُونَ صُنْعًا) کیا اصل ورجالیت کا یہی انتہائی دور دورہ اب دن دوپہر آنکھوں کے سامنے نہیں ہے! امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلہ میں حدیث کی جو پیشینگوئی نقل فرمائی ہے اور جس کی تفصیل اوپر کہیں گزر چکی، اس میں معروف و منکر کے امر و نہی کے ترک کا آخری و انتہائی انجام یہی تو فرمایا گیا ہے کہ ”تم معروف کو منکر اور منکر کو معروف جاننے لگو گے“ جس کا ناگزیر نتیجہ جو ہونا چاہئے وہی ہو کر رہے گا کہ بالآخر ”منکر کا حکم دینے اور معروف سے منع کرنے لگو گے“۔

غرض جو حضرات علما معروف و منکر کے امر و نہی کی اہمیت اور اس کے ترک و غفلت کے ان نتائج بد کو محسوس فرمائیں ان کا اولین فرض خود اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی حد تک بلا کسی جماعت سازی کے احکام دین کو پہنچانا اور امر و نہی کی ترغیبی و ترہیبی راہوں سے ان پر عمل کی نگرانی کرنا ہے۔

”تغییر منکر“ والی سنت | نیز دین کے دوسرے اوامر و نواہی یا احکام کے ساتھ ساتھ معروف و کی تلقین و تاکید | منکر کے امر و نہی کی اہمیت کو ”تغییر منکر“ والی تعلیم و سنت کے مطابق لوگوں کے ذہن نشین کرنا تاکہ وہ اس کے حدود و آداب کے مطابق اپنے اپنے محل و مقام کے اعتبار سے منکر کی تغیر یا مٹانے اور معروف کے پھیلانے کو بھی نماز روزہ وغیرہ ہی کی طرح اپنی ایک اسلامی و دینی ذمہ داری جانیں۔ لوگ غور نہیں کرتے ورنہ حدیث کی اس

تعلیم نے تو اس طرح معاصی و منکرات کے مٹانے کو ہر فرد مسلمان کا اپنی اپنی حیثیت و استطاعت کے بقدر زندگی بھر کا ایسا انفرادی فریضہ قرار دیدیا ہے جس سے کوئی فرد کسی حال اور کسی مقام میں اپنے لئے استثنائی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ کون ایسا موقع ہوگا کہ جس میں آدمی منکر کے مٹانے کے لئے ہاتھ یا قوت سے اگر کام نہ لے سکے، تو کم از کم زبان ہی ہلا دے اور اگر اتنی بھی ہمت یا مصلحت نہیں تو دل ہی سے بُرا جان کر، کم از کم اپنے کو اس سے دور رکھ کر اپنی دلی ناراضی و ناپسندیدگی کا اظہار کر کے، اپنے ایمان کے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو تو بچالے سکتا ہے۔

اس تعلیم کے معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنی سنت سے تینوں صورتوں پر ہاتھ، زبان اور دل تینوں سے منکر کی تغیر یا اس کو مٹانے کی کیسی صاف و واضح رہنمائی و نشان دہی فرمائی ہے۔ ہاتھ یا قوت سے مٹانے کی مثال تو حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھ کر اتنا غضبناک ہوئے کہ خود ہی اس کے ہاتھ سے نکال کر اور چھین کر پھینک دیا اور فرمایا کہ (یہ کیا حرکت ہے) تم میں سے بعض قصداً اپنے ہاتھ میں آگ کی چنگاری رکھ لیتے ہیں! سبحان اللہ! حضرات صحابہؓ کی بھی کیا شانِ اطاعت و محبت تھی کہ جب حضورؐ ہٹ گئے تو کسی نے کہا کہ اب اپنی انگوٹھی اٹھا کر رکھ لو پہننے کے بجائے کچھ اور ہی نفع اس سے حاصل کر لینا۔ بیساختہ جواب دیا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے پھینک دیا ہو میں اس کو خدا کی قسم کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

(ملہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔ ۱۳-)

اسی طرح زبان سے روکنے کی مثال تو اس انتہائی درجہ تک کی مل جاتی ہے کہ بظاہر کسی کے پاس سلام کے بغیر چلا آنا زیادہ سے زیادہ ایک معمولی معاشرتی کوتاہی کے سوا کوئی بڑا منکر امر نہیں معلوم ہوتا، پھر بھی اوپر ہی کہیں گزر چکا کہ اس کو بھی کس بلوغِ اہتمام سے روکا گیا کہ ایک صحابی بلا سلام کے حاضر خدمت ہو گئے تو حکم دیا کہ واپس جاؤ اور السلام علیکم

(سہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالید یا ہاتھ کی قوت کا سب سے موثر و وسیع عام و تمام مظہر حکومت یا تلوار کی طاقت ہے، اسلامی حکومت و خلافت کی حقیقت یا اصل غرض و غایت اس قوت و طاقت سے معروف و منکر کے امر و نہی کی خدمت ہی بجالانا ہے۔ ان مکتاہمہ فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نہوا عن المنکر۔

اسی طرح اسلامی جنگ و جہاد نہ بالذات ملک گیری و اقتدار کے لئے ہے نہ تجارتی و استعماری مقاصد و اغراض کے لئے نہ کسی تہذیب و ثقافت یا سیاسی و معاشی دعوت و دعوات کو زیر دستی دوسروں پر مسلط کرنے کیلئے، نہ اس فرضی نام نہاد آزادی کے لئے کہ کسی دوسرے جبراً قیامی ملک و خطہ یا رنگ و نسل والے اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے نکل کر خود اپنے ہی ملک و خطہ والوں کی غلامی میں آجائے جو دراصل نام ہے زمین پر گلی کوچے مشر و فساد پھیلانے کا۔ اسی آزادی کا مظاہرہ آج کل کانگولائوس اور کیوبا میں کیسی طوائف الملوکی و خونریزی سے ہو رہا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام کے جنگ و جہاد کا مدعا بالکلیہ شر و فساد کی طاقتوں کو مغلوب و خیر و صلاح کی طاقتوں کو غالب کرنا ہے۔ قرآن مجید کی جامع اصطلاح میں اس شر و فساد کی راہ شیطان کی راہ (سبیل الطاغوت) جس کیلئے ہمیشہ سے زیادہ آج کے شیطان روستوں (اولیاء الشیطان) نے پورے سیارہ ارض کو میدانِ جنگ بنا رکھا ہے اور خیر و صلاح کی راہ کی قرآنی تعبیر "سبیل اللہ" ہے۔ مسلمانوں کو صرف اس راہ کیلئے اور صرف اولیاء الشیطان ہی سے حدود و شرائط کے تابع رہ کر جہاد کی اجازت یا حکم ہے۔

الذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت  
فقاتلوا اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا۔

کہہ کر (پہلے اجازت لو کہ) کیا میں آجاؤں؟۔ ایک اور موقعہ پر کسی صاحب نے اجازت کی درخواست تو کی کہ کیا آجاؤں؟ مگر "السلام علیکم" نہیں کہا اس پر آپ نے خادم کو حکم دیا کہ جاؤ اور ان کو اجازت لینے کا پورا ادب سکھلا دو کہ پہلے "السلام علیکم" کہیں پھر اجازت مانگیں کہ کیا آجاؤں۔ ان صاحب نے یہ سن لیا اور خادم کی ہدایت کے بغیر ہی پہلے "السلام علیکم" عرض کیا پھر اجازت چاہی کہ کیا آجاؤں؟

اللہ اکبر جس معاشرہ میں ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے آداب معاشرت تک پر ایسی روک ٹوک اور ان کی اتنی کڑی نگرانی کا عملی اہتمام ہو تو تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس میں بڑے سے بڑے فسق و فجور معاصی و منکرات کا علانیہ ارتکاب کرنے والوں کو ایسی کھلی چھوٹ مل سکے، بس دیکھتے رہیں اور زبان تک نہ ہلائیں۔ خصوصاً خطاب خاص سے تو اچھے اچھے علما و صلحا بلکہ ایسے مصلحین و مبلغین تک جنہوں نے اصلاح و تبلیغ کو ماشار اللہ اپنی پوری پوری زندگیوں کا مشن بنا لیا ہے، اپنی خاص مجلس میں بلکہ اپنے خاص زیر نگرانوں کو روک ٹوک گویا ناجائز ہی جانتے ہیں۔ حالانکہ دوسروں کے سامنے روک ٹوک سے دوسروں کو بھی سبق ملتا اور ان کی بھی جہالت و غفلت دور ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ طرز اصلاح و تعلیم ہی کا اختیار کیا جائے، اہانت و تذلیل کا ہرگز سہرگز نہ ہو۔ گو اپنے توابع یا زیر نگرانوں مثلاً اہل و عیال شاگردوں مریدوں وغیرہ کے حق میں حسب ضرورت ناراضی و تنبیہ کا طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر ضروری و مؤثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی ناپسندیدگی کا مناسب سختی سے اظہار کیا جائے۔

تیسری صورت یعنی دل سے معاصی و منکرات کی تغیر یا ان سے بیزاری کے اظہار کی بھی ایک مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی سنت سے لیجئے مشکوٰۃ شریف (کتاب الرقاق) کی ایک حدیث میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے جا رہے تھے اور ہم لوگ (کچھ صحابہ) ساتھ تھے کہ نظر مبارک ایک قبہ نما بلند مکان پر پڑی تو (بطور نکیر) فرمایا یہ کیا! (یعنی ایسا منکر مکان کس کا ہے) لوگوں نے عرض کیا کفلاں انصاری کا ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے تو خاموشی اختیار فرمائی لیکن دل میں (غصہ و ناراضی کے ساتھ اس کو) لئے رہے یہاں تک کہ جب اس مکان کے مالک انصاری کسی وقت حاضر خدمت ہوئے اور لوگوں کے مجمع میں سلام عرض کیا، تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور ایسا ایک مرتبہ نہیں بار بار فرمایا کہ جب وہ سلام کرتے آپ منہ پھیر لیتے۔ آخر ان انصاری نے دوسرے صحابہ سے جو زیادہ حاضر باش تھے شکایت کی کہ کیا بات ہے؟ میں حضورؐ کے اس طرز عمل میں بخدا اپنے متعلق غصہ اور ناراضی کا اثر محسوس کر رہا ہوں؟ لوگوں نے جو بات تھی بیان کر دی کہ حضورؐ ایک دن باہر تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں تمہارے اس بلند قبہ نما مکان پر نظر پڑی تو اس کو ناپسند فرمایا۔ بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انصاری سیدھے اپنے گھرائے اور مکان کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ پھر جب ایک دن دوبارہ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا تو دریافت فرمایا کہ وہ قبہ کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کی کہ مالک مکان نے حضورؐ کی ناراضی محسوس کر کے ہم سے شکایت کی کہ کیا بات ہے؟

توجہ حقیقت ہم کو معلوم تھی کہہ سنائی، جس کے بعد انھوں نے اس کو مسما کر ڈالا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے بھی اپنی ناگواری اور غصہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ ”ہر وہ عمارت جو تعمیر ضروری ہو اس کے مالک کے حق میں وبال ہے۔“

ترجمہ میں جو قوسیلیتی تشریحات درج کر دی گئی ہیں معلوم رہے کہ وہ راقم ہذا کی نہیں بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مشہور و مسلم فارسی ترجمہ مشکوٰۃ اشعۃ اللمعات کی ہیں ان تشریحات سے قطع نظر نفس روایت کے الفاظ سے بھی اتنا بہر حال واضح ہو جاتا ہے کہ ہاتھ بیا زبان سے قدرت نہ رکھنے کی صورت میں دل سے بُرا جانے (یا تغیر بالقلب) کے عمل سے ضرور اس منکر کے بتلا کو محسوس کرانا چاہئے، خصوصاً جب معلوم ہو کہ اس محسوس کرانے کا اس پر کچھ نہ کچھ اثر بھی پڑے گا۔ ہاں اگر ایک طرف اس پر کوئی اثر پڑنے کی توقع نہ ہو اور دوسری طرف اپنے کو کوئی ایسا ضرر پہنچ جانے کا قوی اندیشہ ہو جو ناقابل تحمل ہو تو محض انفعالی طور پر صرف دل سے کسی منکر کو بُرا جان لینا بھی انشاء اللہ ایمان کے ادنیٰ و آخری درجہ کو بچانے کے لئے کافی ہوگا۔

منکر کو ہاتھ اور زبان سے روکنے اور بدرجہ مجبوری یا کسی مصلحت و حکمت سے کم از کم دل سے بُرا جاننے اور مناسب طرزِ عمل سے اس پر اظہارِ بیزاری کے ذریعہ معمولی سے معمولی منکرات تک کو مٹانے اور روکنے کی یہ تینوں نبوی سنت کی عملی رہنمائیاں ہیں



ان میں ایک بات یہ بھی خیال کرنے کی ہے کہ ان کا تعلق خصوصیت والے یا اکابر صیابہ سے نہیں بلکہ بستی (مدینہ طیبہ) کے عام باشندوں یا امت کے عام افراد ہی سے معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ ایک تو وہی ہے کہ بلا کسی خاص تعلق کے صرف عام اسلامی و ایمانی ہمدردی و خیر خواہی کا فریضہ بھی آپس میں ایک دوسرے کو معروف و منکر کا امر و نہی کرتے رہتا ہے اس کے علاوہ حضرات انبیا کا اپنی امت کے تمام افراد سے راعی و رعیت یا نگران اور زیر نگرانوں کا جو خصوصی تعلق ہوتا ہے وہی ذمہ داری و مسئولیت ان کے وارث جانشین حضرات علما پر کم سے کم اپنی بستی اور پاس پڑوس والے عام مسلمانوں کے معاملہ میں عائد ہوتی ہے کہ اپنے پاس آنے جانے ملنے جلنے والے یا چلتے پھرتے راستہ گلی میں بھی کسی مسلمان کو کسی چھوٹے سے چھوٹے منکر میں بھی مبتلا دیکھ لیں تو ہاتھ زبان یا دل سے جس طرح اور جتنا بھی اس کو باز رکھ سکیں رکھیں۔

علماء و مشائخ کی ذمہ داری | غرض اتنا تو ہر معمولی سے معمولی عالم دین کا عالمانہ و دینی فرض منصبی ہی ہے کہ اس نے دین کے اوامر و نواہی کا جو علم حاصل کیا ہے اس کے امر و نہی کو صرف عملاً ہی لوگوں تک نہ پہنچاتا رہے بلکہ جہاں تک ہاتھ زبان کی یاری یا کم از کم دل کی ناراضی و بیزاری کے اظہار کے ذریعہ ان پر عمل کرا سکتا ہے کرائے۔ باقی بہت سے علماء و مشائخ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے ہیں جو سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اچھے خاصے اپنے عقیدتمندوں اور ارادتمندوں کے چھوٹے بڑے حلقے رکھتے ہیں جن پر وہ اسی نوعیت کا اثر رکھتے ہیں جو حضرات انبیا کا خاص اصحاب یا حواریوں پر ہوتا تھا

لہذا ان کی تو خاص طور ہی پر چھوٹے بڑے امر وہی کے باب میں پوری اور کڑی نگرانی اسی طرح  
 پر واجب ہے جس طرح خود اپنے اہل و عیال کی بلکہ حضرت حکیم الامت مجدد تھا تو علیہ السلام  
 نے تو مشائخ کی ذمہ داری اور مسئولیت کو والدین و اولیا کی ذمہ داری سے بڑھ کر قرار  
 دیا ہے کیونکہ بچوں پر "گو شرعاً ہماری اطاعت واجب ہے مگر انھوں نے صراحتاً اس کا  
 کوئی التزام و معاہدہ نہیں کیا کہ تم ہم کو تعلیم و تبلیغ کرو اور ہم تمہاری تعلیم پر عمل کریں گے"  
 بخلاف شیخ و سالک یا پیر و مرید کے تعلق کے کہ وہ "نام ہی ہے مرید کی جانب سے  
 معاہدہ اطاعت کا اور پیر یا شیخ کی جانب سے معاہدہ تعلیم و اصلاح کا" اس لئے  
 مریدوں کو ان کے چھوٹے بڑے تمام منکرات پر روک ٹوک نہ کرنا صریح حیانت و  
 معصیت ہے۔ جس میں ترک تبلیغ کے (عام گناہ) کے ساتھ وعدہ خلافی کا (خاص)  
 گناہ بھی شامل ہے۔ اور اس عام و خاص حیانت و گناہ کے مرض میں صرف عام دوکاندار  
 یا درگاہی پیر ہی گرفتار نہیں بلکہ اچھے خاصے صاحب علم و صلاح مشائخ تک کو دیکھا  
 کہ مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں کچھ روک ٹوک نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے  
 کہ یہ شیوخ یا تو پیری و مریدی کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر پہلوتی کرتے  
 ہیں۔ ۱۷

مخلص مشائخین کی معروف و منکر کے	اصل میں مخلص اہل صلاح یا خواص مشائخ جان بوجھ کر
امروہی سے غفلت کا سبب	پہلوتی تو کیا کرتے لیکن یہ عام غلطی و غفلت خدا جانے

۱۷ یعنی والی و دارث (رغ-م) ۱۷ تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۲۲۰

کیسے پھیل گئی ہے کہ معمولی نماز روزہ کے سوا ایک طرف سلوک و تعلیم کو خواص و مخلصین بھی تمام تر ذکر و شغل وغیرہ کے معمولات میں محدود سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف معروف و منکر کے امر و نہی کی کتاب و سنت نے جو اہمیت دی ہے اس پر بڑے بڑے علما و صلحا میں بھی عمل و اہتمام اٹھ جانے سے اس کا نامور و منصوص فرض و واجب ہونا ہی ذہنوں سے نکل گیا ہے۔ ورنہ خیال کرنے کی بات ہے کہ یہ حضرات اگر اپنے زیر اثر سیکڑوں ہزاروں معتقدوں مریدوں کو تمام چھوٹے بڑے معروفات و منکرات کی امر و نہی کے ذریعہ نگرانی فرماتے رہیں تو ایک طرف کیسے یہ خود مرید و معتقد بنے اور پورے مسلمان بن جاتے اور دوسری طرف ہی مرید و معتقد دوسروں خصوصاً اپنے تابع یا اہل و عیال وغیرہ کے اعمال و اخلاق یا معروف و منکر حسب استطاعت و موقع ہاتھ زبان یا دل سے نگرانی کرتے۔ اس طرح بالکل فطری و طبعی راہ سے ان سیکڑوں ہزاروں پیروں مریدوں کا اثر نسلہا نسل اور لاکھوں لاکھ تک پھیلتا چلا جاسکتا۔ دین فطرت کی تعلیم جس طرح ہر باب میں بے تکلف فطری و طبعی اصول پر مبنی ہے اسی طرح اجتماعی و متعدد اصلاح و تبلیغ کیلئے بھی معروف و منکر کے امر و نہی کا جو جامع نظام خود کتاب و سنت نے عطا کیا ہے آج کل کی مصنوعی جماعت سازوں والے طرح طرح کے پر مفاسد طریقوں کے مقابلہ میں کیسا سیدھا سادہ بے تکلف و بے خرچ اور بے مفاسد نظام و انتظام ہے۔ ہا غیروں کی نقالی اور احساس کمتری کا شکار ہو کر ہم نے گھر کی کیسی کیسی دولتوں سے اپنے کو محروم کر لیا ہے!

اہل مدرسہ علماء پر طلباء کی تربیتی ذمہ داری کا فریضہ

ان عام و خاص علماء و صلحا کے بعد تیسرا طبقہ ان حضرات علماء کا ہے جن کی نگرانی میں چھوٹے بڑے سیکڑوں ایسے دینی مدارس

چل رہے ہیں جن میں ہزاروں طلباء علوم دین ہی کی تحصیل و تکمیل میں دس دس بارہ بارہ

سال تک اپنی پوری پوری طلب علم کی زندگیاں لگا دیتے ہیں اگر ان کی ایک طرف

ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہی دینی تربیت بھی ہوتی رہے بلکہ تربیت و عمل کا علم و تعلیم سے

زیادہ اہتمام و انتظام ہو کہ وہی علم و تعلیم کا اصل مقصد ہے اور دوسری طرف برابر ان کے

دلوں میں یہ بات بٹھائی جاتی رہے کہ علم دین حاصل کرنے ہی سے ان پر سب سے بڑی

ذمہ داری یہ عائد ہو جاتی ہے کہ اپنی اہلیت و استطاعت بھر گھر باہر اپنیوں پر اپنیوں

کو اپنے معلوم احکام دین پہنچاتے اور اپنے اثر و قوت زبان و دل حال و قال سب سے

حسب موقع و محل ان احکام پر عمل کی نگرانی کرتے رہیں یعنی وہی تو اسی یا کھتی یا معروفا

و منکر کے امر و نہی کے انبیائی علم کے انبیائی حقوق و فرائض ادا کرتے رہیں تو کیا ہمارے

موجودہ دینی مدارس اور ان سے نکلنے والے یہ ہزاروں علماء ہی اپنے لاکھوں مسلمان بھائیوں

کو اٹھتے بیٹھتے ملتے جلتے خطاب خاص و عام سے ہر طرح بے تکلف روزمرہ کے

دینی احکام سے واقف اور ساتھ ساتھ امر و نہی کے امر و نہی سے ان کی پابندی

پر آمادہ نہیں کرتے رہ سکتے ہیں؟

دین کی صاف سیدھی

کیا اور کس طرح عرض کیا جائے کہ راقم عاجز کی نظر میں تو دین تمام

اور روشن راہ

یسر ہی سیر اور آسانی ہی آسانی ہے۔ انفرادی ہی نہیں اجتماعی یا

ملی راہ بھی نہایت صاف سیدھی اور روشن رسمحاو بیضابا ہی ہے، جس پر چل کر افراد  
 ہی کی طرح پوری ملت بھی بے کھٹکے ملی یا قومی کمال و معراج کی منزل کو پاسکتی ہے  
 نہ دین کی ملی و اجتماعی خدایات کے لئے آج کل کی بیدینی کی راہوں اور بے دینیوں کی لائی  
 اور چلائی ہوئی بات بات پر جماعت ساز یوں یا کنونشن بازیوں بڑے بڑے جلسوں،  
 جلسوں، پنڈالوں، دھنواں دھار تقریروں سیکڑوں ہزاروں میل کے سفروں دوروں  
 اور ان کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر ہزاروں لاکھوں کے چندوں فنڈوں، ان میں  
 اسرافوں بے احتیاطیوں کی ضرورت اور نہ مصالح سے زیادہ ان راہوں کے دوسرے  
 طرح طرح کے مفاسد میں پڑنا ناگزیر ضرورت اس کی اور صرف اس کی ہے کہ عام و خاص  
 علما اور ان کے اعتماد و تعلق والے خصوصی قلعے (در سے) اپنے انبیائی وراثت و نیابت کے  
 مقام و منصب کو جان پہچان کر اس پر کھڑے ہو جائیں۔ اور مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ  
 أَتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا عَلَىٰ رِبِّ الْعَالَمِينَ کی مخلصانہ و بے غرضانہ شان سے محض رب العالمین کی ربوبیت  
 یا پروردگاری و دستگیری پر بھروسہ کر کے اپنی اپنی جگہ بلا کسی مصنوعی جماعت سازی و چندہ  
 بازی کی فکر میں پڑے وسعت و استطاعت بھر جہاں تک پہنچ سکے دعوت خیر یعنی  
 گھر باہر والوں کو احکام دین (کہ وہی خیر ہیں) پہنچانے اور ان پر اپنی بساط بھر قوت و  
 زبان دل و جان سے چلنے چلانے یا معروف و منکر کے امر و نہی پر آمادہ ہو جائیں تو بس  
 انشاء اللہ منکم امۃ“ والے علما کے یہی دو کام (یَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ“ اور يَا مَعْزُومَاتٍ  
 بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) جہاں تک اللہ تعالیٰ کی مشیت و مرضی ہے اس کی

نصرت و دستگیری سے امت کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی سب ہی کام بنتے جائیں گے جس طرح حضرات انبیا کے گرد چھوٹی بڑی "اصحاب و حواریین" کے مخلصین کی جماعت دفتر و رحبر حیزہ و فنڈ کے بغیر جمع ہو جاتی تھی اور پھر جب جتنا اس کو اللہ تعالیٰ کو بڑھانا پھیلاتا ہوتا تھا بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی اور اللہ ہی کو منظور یا مقدر ہوتا تھا، تو اس بے سوسامان اور بے یار و مددگار جماعت کو اپنی یاری و مددگاری سے اپنی حاکمانہ خلافت و نیابت بھی زمین کے کسی چھوٹے بڑے خطہ پر عطا فرمادیتا تھا۔

یہی صحاف سیدھا سبق تمام انبیا خصوصاً امام الانبیا خاتم النبیین (صلی اللہ علیہم و آلہم و سلم) کی سیرت و اسوہ سے ملتا ہے۔ اس کے سوا تمام دوسری راہیں دوسروں کی نقالی، احساس کمتری اور خود اپنے گھر کی دولت سے غفلت اس کی ناقدر شناسی اور احساس کمتری کا نتیجہ ہیں۔ جس میں عوام کا کیا ذکر اچھے اچھے خواص علماء و صلحا تک مبتلا ہیں اور جس سے عجیب عجیب خوش فہمیوں اور طرح طرح کے افسوسناک تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ایک اچھے فہیم و صالح تعلیم یافتہ، جنھوں نے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی کتابیں ہی خوب نہیں پڑھیں یا شار اللہ بڑی عقیدت بھی رکھتے ہیں کہنے لگے کہ حضرت نے انفرادی صلاح و اصلاح کی تو بڑی خدمات انجام دیں لیکن دین کا کوئی جماعتی و اجتماعی کام نہیں کیا۔ دل میں انا اللہ پڑھا اور خاموش ہو رہا خصوصاً اس لئے کہ یہ خیال غالباً ان غریب سے زیادہ ایک مشہور دینی جماعت کے مسلم اہل علم و قلم کے اکابر کی ترجمانی تھی۔ مطلب وہی تھا کہ آج کل کے رنگ میں جس کو اجتماعی کام کہا جاتا تھا وہ نہیں کیا۔

اجتماعیت کے جدید شکنجوں | اجتماعیت کے کاروباریہ رنگ ڈھنگ سچ پوچھئے تو بادیت میں  
کی ہلاکت سامانی | شرابور فرنگی بے دنیوں کا لایا اور چلایا ہوا ہے۔ مادہ پرستی کے

غلو و غلبہ میں مغربی ذہن مشینوں پر مشین بناتے بناتے خود اتنا میکائی (میکانکل) ہو کر رہ گیا ہے کہ انسان کو بھی زیادہ تر ایک جاندار مشین ہی تصور کرنے لگا ہے۔ بات بات پر جماعت سازپوں اور ادارت بازپوں کے ذریعہ سارے افراد کو مختلف چھوٹے بڑے اجتماعی شکنجوں میں کس کر اور مشین ہی کی طرح کا ایک پرزہ بنا کر اس کی ساری انفرادیت و شخصیت کا خون کرتا دیتا ہے۔ حالانکہ انسانی خلقت و فطرت اصلاً میکائی نہیں، اخلاقی و روحانی ہے جو انفرادی اختیار و ارادہ کی آزادی زیادہ سے زیادہ اور مصنوعی اجتماعی جگر بندپیوں کو کم سے کم چاہتی ہے۔ ان جگر بندپیوں کو بالکل ناگزیر صورتوں تک محدود رہنا چاہئے تاکہ انفرادیت و شخصیت کو اپنے پورے اٹھان اور ارتقا کے لئے فضا میسر آسکے۔ بخلاف آج کل کے خصوصاً حکمت پسندانہ بالکل مختارانہ رجحانات کی جگر بندپیوں میں روحانی و اخلاقی انفرادیت کا دم ہی گھٹا جا رہا ہے۔

اسلامی تعلیمات پر ادنیٰ و معمولی نظر و فکر سے بھی یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام خارجی یا میکائی بندشوں سے زیادہ اور بہت زیادہ قدم قدم پر انفرادی اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ باطنی و قلبی یا اخلاقی و روحانی تبدیلیوں کا داعی ہے۔ اس کے علاوہ دیکھا جائے تو ہر چھوٹے بڑے کام و مقصد کے لئے جماعتوں پر جماعتیں اور تنظیموں پر تنظیمیں بناتے چلے جانے والے اجتماع و اتحاد کے بجائے بہ حیثیت مجموعی پورے معاشرہ کے حق میں

انتشار و افتراق تخریب و تفرق ہی کا سرچشمہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ ہر جماعتی تعلق و تعصب نظر و فکر کے لئے کوئی نہ کوئی قدرۃً ایسا محدود دائرہ بنا دیتا ہے کہ آدمی حق و صداقت کو تمام اپنی ہی جماعت میں دائرہ و منحصر جاننے لگتا ہے اور دوسری جماعتوں سے کچھ نہ کچھ امتیاز و حریفانہ چشمک پیدا ہو جاتا نفسیاتی طور پر ناگزیر ہوتا ہے۔ مزید برآں جدید طرز کے رائج الوقت جماعتی کام اور ان کے لئے جماعتی نظام عین اپنی ساخت و نوعیت ہی کی رو سے جلسوں، جلوسوں، تقریروں، گشتوں وغیرہ طرح طرح مظاہروں و نمائشوں دکھاوے اور سناوے کے مواقع پر مشتمل ہوتے ہیں جن سے نا تربیت یافتہ عوام و خواص سب ہی کے نفس کو پیٹ بھر غذا ملتی رہتی ہے۔ ان مظاہراتی و نمائشی مفاسد کے غلبہ اور ان میں انہماک کا ایک اثر یہ پڑتا ہے کہ ان راہوں سے خالص دینی خدمات کرنے والوں کو خواص بلکہ اخص خواص تک کو دیکھا جاتا ہے کہ انفرادی حقوق و فرائض — معاملات و اخلاق اور معاشرت — کے بہترے موئے موئے قطعی و منصوص او امر و نواہی میں کچھ ایسی بے حسی کے ساتھ کوتاہیاں فرمانے لگتے ہیں، کہ گویا وہ دینی احکام ہی نہیں، تو پھر ان کے عوام کا پوچھنا ہی کیا! وہ غریب ان مظاہراتی جلسوں، تقریروں کیا، مظاہراتی شب بیداریوں تک سے فریب کھا کر انفرادی حقوق و فرائض کی کوتاہیوں میں گھربا ہر جگہ جتنی دور بھی نکل جائیں کم ہی ہوگا۔



اشتمالیت و اشتراکیت | سچ پوچھئے تو "آتاکھرون الناس بالیر و تنسون انفسکم" (مکمل)  
 کی فریب کاری کی خود فراموشی و خود فریبی ہی فرنگی و مغربی رنگ کے جماعتی و اجتماعی  
 سیاسی و معاشی کام کرنے والے لیڈروں کی خاص شان ہوتی ہے۔ عوامیت و جمہوریت  
 اشتراکیت و اشتمالیت (سوشلزم) ہی کا دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹے اور دنیا بھر سے  
 اونچے نیچے مٹانے والے بڑے سے بڑے مدعیوں کو دیکھئے کہ خود اپنا حق شاہوں شہنشاہوں  
 سے بڑھ کر قریبی شان و شوکت نمود و نمائش کی اونچائیوں اور بلندیوں ہی کو جانتے  
 ہیں۔ اور تو اور اپنے آئے دن کے مظاہراتی استقبالوں اور ان کے نمائشی و آرائشی انتظاموں  
 ہی پر بے دریغ انتہائی بیدردی کے ساتھ ہزاروں لاکھوں کے وارے پیارے کرتے  
 کرتے رہتے ہیں اور کسی پھوٹے منہ سے نہیں نکلتا کہ یہ ان ہی کا شکاروں، مزدوروں یا  
 عوام کی گاڑھی کمائیوں پر کیا ظلم ڈھایا جا رہا ہے جن کی پستی و مفلسی کا دن رات رونا  
 رویا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی اسی ہندوستان میں کیا شاہ حجاز و شاہ ایران کی بدنام قرون  
 وسطی والی بچی کچی شاہی یادگاروں کے استقبال سے کہیں بڑھ چڑھ کر ابھی شاہی و  
 شہنشاہی کے کٹر دشمن فرعونہ روس (بلگان و خروشیف) کے شاہانہ استقبالوں پر  
 ہندوستان بھر میں جو لاکھوں لاکھ آتش بازی کی طرح پھونک دیئے گئے وہ انھیں بچوں  
 کے اونچا کرنے میں نہیں لگا دیئے جاسکتے تھے جن کی خاطر "سوشلسٹک ڈھنگ" کی جنت  
 بنانے والے منصوبوں کے لئے قرض اور بھیک تک مانگنا پڑ رہی ہے۔



انبیائی دعوت ہی میں جماعت بندیوں | ایشیائی دعوتوں ان کے تبلیغی و اصلاحی طریقوں میں بھلا  
اور ان کے فساد کا علاج ہے | آج کل کی طرح بات بات پر جماعت سازیوں پارتی

پارٹیوں اور ان کے گونا گوں فتنوں فسادوں کا دور دور بھی کوئی نام و نشان ملتا ہے!  
وہاں تو لے دے کر مسیحی توحیدِ اللہ کی ایک ہی دعوتِ حق ہے اور اس کے ایمان  
و انکارِ رد و قبول سے بالکل قدرتی اور غیر مصنوعی طور پر مومن اور کافر دو  
جماعتیں یا حزبِ اللہ اور حزبِ الشیطان دو پارٹیاں اُبھر کر وجود میں  
آجاتی ہیں۔ باقی جو کچھ ظاہری و ختمی اختلافات و امتیازات ہیں یا ان ہی کے  
اندرونی مراتب و درجات و درجہ دراصل حق و باطل جنگ و صلح کی ساری جدوجہد  
اور کشمکش کے اصولی محاذ و میدان صرف دو ہی ہیں ایک طرف ہر اعتبار سے باطنی  
و داخلی وحدت ہی وحدت ہے اور کثرت محض ظاہری و خارجی۔ دوسرا میدان  
تمام شرک و کثرت کا میدان ہے جس کی عین شری فطرت کا لازمہ جماعت سازیوں  
گروہ بندیوں اور نہ ختم ہونے والی تقسیمات و تقسیمات کا جنگل اور پھر جنگل ہی کا قانون ہے۔  
اسلامیت یا اسلامی توحید کا تقاضا تو جماعتوں، طبقوں، فرقوں اور گروہوں  
کو مٹانا یا "جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا" کی محض تعارفی یا انتظامی  
تقسیمات کو کم سے کم ناگزیر وجود کے اندر محدود رکھنا، نہ کہ اٹھے دین و اسلام کے غلط  
استعمال ہی جتنی تقسیمات و اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان ہی میں اور اسلامیت  
ہی کے نام لگا لگا کر بے شمار نئے طرز کی جماعت سازیوں کا آئے دن اضافہ کرتے چل جانا۔

لیکن اس بد عقلی و بد فہمی کا کیا علاج کہ اللہ و رسول کتاب و قبلہ سب کچھ ایک رکھ کر بھی ایک نہیں رہ سکتے اور رفرنڈم تو قومی نہیں بین الاقوامی طور پر بھی آپس میں ایک دوسرے سے دور و فقور ہوتے جاتے ہیں مسلمان ممالک ہی ساری دنیا کے ملکوں اور قوموں سے باڑی لے کر جارہے ہیں۔ کتاب اور بیئہ سب کچھ اگلوں پھلوں سب سے بڑھ کر دیئے جائے اور رکھنے کے باوجود تفریق و تشتت انتشار و پراگندگی ہی میں سب سے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ — وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸) حالانکہ حکم ان کو بھی سب سے بڑا اپنی سب سے بڑی کتاب سے وہی ایک ملا تھا جو اگلے کتاب والوں کو کہ بس ہر طرف سے کٹ کر ہر طرح ایک اور خالصتہ ایک ہی کی بندگی میں لگ جاؤ۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (۹۸) اور فرقوں یا جماعتوں میں بیٹے اور پھٹنے کے بجائے سب کے سب اللہ ہی کی رسی کو پوری مضبوطی و قوت سے تھامے رہو۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا — (۳۱)

وقتی تدابیر اختیار کرنے کے لئے فرنگی طریقوں کی حیثیت سے  
کی گنجائش و صورت فی الجملہ وقتی تدابیر کی ضرورت ہے اور مناسب وقت نئی پرانی  
فرنگی غیر فرنگی ہر قسم کے وسائل و تدابیر اختیار کرنے کی تسرعت کی طرف سے اجازت

۱۔ پاکستان و افغانستان مسلمان اور دروزرا کے پڑوسی ہو کر بھی آپس کی دشمنی و دوری میں ترقی کرتے جا رہے ہیں اور ہندوستان و افغانستان ہزاروں میل دور ہو کر بھی نزدیک سے نزدیک ہوتے جاتے ہیں دیا للعجب!

ہی نہیں، بعض صورتوں میں واجب بھی ہے۔ البتہ وسائل چونکہ صرف وسائل ہی ہیں مقاصد بہر حال نہیں، اس لئے دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے، ایک تو یہ وسائل یا اثرا پیر نفس شریعت و اسلامیت کے اصولی مقصد اور ان کی روح و خراج کے منافی نہ ہوں دوسرے ان کے مفاسدان کے مصلح پر غالب نہ ہوں یعنی اِثْمًا اَكْبَرًا مِمَّنْ تَفْعَلُ مَا (۲۱۹) کی صورت ہو ورنہ دنیا میں کون ایسا شر و فساد ہے جس میں کوئی نہ کوئی خیر و خوبی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔

فرنگی ہر راہ میں شری | عجیب بات یہ ہے کہ جدید فرنگی راہوں کی ایک اجتماعیات ہی پر کیا پیش پیش ہے!

موقوف، اس کی سیاسیات و معاشیات تمدن و تہذیب کون سی ایسی چیز ہے جس میں انسانی زندگی کے لئے خیر و صلاح سے زیادہ شر و فساد کا سامان نہ ہو۔ اور تو اور سب سے زیادہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ان کی سائنس اور سائنسی ایجادات ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس راہ نے کہاں جا پہنچا یا ہے کہ جس زندگی اور تہذیب و تمدن کی آسائش و آرائش کے لئے ساری ایجادات تھیں ہائیڈروجن بم راکٹ میزائل وغیرہ کی ایجاد خود اس زندگی اور تہذیب و تمدن ہی کو پورے سیارہ ارض سے صفایا کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ یہ تو خیر ابھی صرف دھمکی ہے اور دھمکی کے خالی آرائشی تجربات جو وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں، ان کے مضر صحت اثرات سیکڑوں ہزاروں میل دور بننے والی انسانی بستیوں بلکہ ان کی آئندہ آنے والی نسلوں تک کی خبر لے لیتی ہیں لیکن موٹر، موٹر سائیکل بس وغیرہ سواریاں تو سمجھا جاتا ہے کہ نعمت ہی نعمت ہیں۔ تاہم ان کی خیر و برکت بھی خود انسانی زندگی ہی کے حق میں جہاں تک جا پہنچی ہے،

اس کا اندازہ صدق (۱۴ فروری ۱۹۵۶ء) میں ذرا ملاحظہ ہو۔ شکاگو سے چلی ہوئی رپورٹ کی (۵ فروری کی) اطلاع ہے کہ ۵۵۵ میں سڑکوں پر حادثات کا شمار ہو کر ملک میں ۳۸,۳۰۰ انسانوں کی جائیں ضائع ہوئیں۔ اور اس سے بڑی میزان تاریخ کے کسی سال میں نہیں ملتی۔ سڑک کے علاوہ اور مختلف حادثوں سے مرنے والوں کی میزان ۹۲ ہزار تک پہنچی اور زخمیوں کی ۹۲ لاکھ تک! خود صاحبِ صدق کی درخواست ہے کہ "سڑک اور موٹرز، موٹر سائیکل اور بس کی برکتوں کو گننانے والے کیا اچھا ہو کہ کبھی کبھی ان اعداد پر بھی نظر فرمایا کریں" آگے ارشاد ہے کہ "بہت بڑی جنگوں کا ذکر ہمیں باقی معمولی اور چھوٹی جنگوں کے کشتوں اور زخمیوں کی تعداد بھی اتنی ہوتی ہے جتنی اس متمدن ترین ملک میں حفاظت کے بہترین سامان و تدبیر کے باوجود زیادہ امن میں رہی؟ یعنی اس جدید ترقیوں کے "تمدن ترین ملک" کا زیادہ امن بھی غریب غیر متمدن ملکوں کے مقابلہ اور ہلاکت کے معاملہ میں مستقل میدانِ جنگ ہی ہے۔

درماندہ صلاح و فساد یکم الخذر زین رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند  
 میکانی تمدن کی ترقی جسم و جان کیلئے | خدا و آخرت سے چڑھنے والے تو کیوں سوچتے لگے،  
 بھی تو آفت ہی بنتی چلی جا رہی ہے | ورنہ ہے درحقیقت یہ بڑے سوچ کی بات کہ جس قدر  
 یہ چڑھ ترقی کرتی جا رہی ہے اسی قدر اس تمدن کی وہ ترقیاں بھی جو روح و قلب کے لئے  
 نہ ہی کم از کم جسم و جان کے لئے خیر و نعمت معلوم ہوتی ہیں وہ بھی بہت کچھ آفتِ جان  
 بنتی چلی جا رہی ہیں۔ سلامتی تا بہ امکان ان سے دوری ہی میں نظر آتی ہے خصوصاً

خالص دینی کاموں میں تو اس لادینی تمدن و ترقی کی راہوں کو وسائل و تدبیر کے درجہ میں استعمال سے جب تک بالکل ہی مجبوری و اضطرار نہ ہو بالکل ہی بچنا چاہئے، اور ہمارے اہل علم و فہم اگر ذرا اچانی فہم و فراست سے کام لیں تو انشائاً اللہ انبیائی طریق و تدبیر کو بالخصوص شی الاہنیائی اسوہ کو اس عہد میں بھی خطرات و مفسدات سے پاک ہی نہیں بلکہ جن مقاصد کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جاتی ہیں ان کے لئے کارگر بھی زیادہ پائیں گے۔

بے دینی قالب میں دینی مقاصد کی اصل یہ ہے کہ جو زندگی و تمدن اپنی ذات و جوہر ہی میں روح کو باقی رکھنے کی کوشش بے سود ہے، بالکلہ دین پرستی اور دین بیزاری کا نام ہو، اس کے تدبیر

چوکھٹوں میں ہم خالص دینی مقاصد کو بے دینی کے مفسدات سے بچا کر فٹ ہی کیسے کر سکتے ہیں۔ نہ یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ دین کا اہل نے خالی اپنے مقاصد کے تجریدی و فلسفیانہ تصورات عطا کر کے، ان کی تکمیل و تحصیل کی عملی تدبیروں کے لئے ہم کو ٹیروں وہ بھی دین بیزاریوں کے حوالہ کر دیا ہو اور خود اپنے مقاصد کے مناسب اسباب و وسائل کے معاملہ میں رہنمائی سے محروم رکھا ہو۔

اسلام کا مقصد بھی متعین ہے اور حصول مقصد اس ذرا طویل مگر ضروری جملہ معترضہ کا حاصل کے وسائل بھی بتا دیئے گئے ہیں! یہ ہے کہ جس طرح مسلمان کا مقصود تمام تر

ایمان اور عمل صالح کی اسلامی زندگی کے سوانہ کچھ ہے نہ ہونا چاہئے، اس طرح اس مقصود کے حصول و طلب یا مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی صلاح و اصلاح کے تدبیری اسباب و وسائل بھی کتاب و سنت کی اسلامی تعلیمات ہی ماخوذ و مستفاد ہونا

چاہئیں اور جس طرح ایمان و عمل صالح ہی کے ایجابی و سلبی پہلوؤں کی تعبیر معروف و منکر ہے، اس طرح معروف و منکر کے اوامر و نواہی پر اطلاع اور ان کی اتباع کا اس سے زیادہ سہل و سادہ فطری و طبعی موثر و کارگر طریقہ و تدبیر کیا ہو سکتی ہے کہ ایمان و عمل کے ہر معروف و منکر پر امر و نہی معاشرہ کے کم و بیش ہر فرد کا فریضہ اپنے اپنے محل و مقام کے اعتبار سے اور اپنی اپنی استطاعت پھر اس طرح قرار دیا جائے جس طرح معروف پر عمل اور منکر سے احتراز خود ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے پس کتاب و سنت پر مبنی معروف و منکر کے امر و نہی کی تعلیم و تدبیر کے مذکورہ بالا بیچ گانہ نظم و نظام کا مفاد و مدعا یہی ہے۔ خیال کیجئے کہ جس ملک و معاشرہ میں (۱) سب سے پہلے ایمان و عمل کے معروف و منکرات کا کامل و تحقیقی علم رکھنے والے علما کے ایک پورے طبقہ کے طبع کا خاص یہی کام و منصبی فرض ہو کہ چھوٹی بڑی تمام آبادیوں میں اس کے افراد پہنچ اور پھیل کر لوگوں کو خیر و شر یا طاعات و معاصی کے صحیح صحیح احکام پہنچاتے، ان کی بھلائیوں پر ایسے کو سمجھاتے بالفاظ دیگر ان کی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ معروف و منکر کا امر و نہی فرماتے رہتے ہوں۔ (۲) پھر اس کی بدولت ہر راعی یا نگران اپنی رعیت یا اپنی زیر نگرانی خصوصاً اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اپنی مسئولیت و ذمہ داری کو محسوس کر کے ہر معروف و منکر کی نگرانی کا اپنی پوری قوت و اثر سے حق ادا کرتے رہتے ہوں اور (۳) عام مسلمان بلا خاص تعلق کے بھی نفس اپنی ایمانی ولایت و محبت بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ یا محض دینی ہمدردی و خیر خواہی کی راہ سے ملتے جلتے، اٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے کو

اپنی اپنی واقفیت و اہلیت کے موافق سمجھاتے بچھاتے، روکتے ٹوکتے رہتے ہوں —  
 (وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ  
 عَنِ الْمُنْكَرِ) (۹) تو ایسی سوسائٹی یا سماج کی فضائیں منکرات کو غلبہ کے ساتھ  
 سر اٹھانے کا موقع ہی کیسے مل سکتا ہے ایسی فضائیں تو معاصی و منکرات کی حقارت و  
 کمتری اور ان سے نفرت و بیزاری آپ سے آپ پیدا ہوگی اور علانیہ و بے باکانہ فواحش و  
 منکرات کے ارتکاب کی جرأت ہی مشکل سے کسی کو ہوگی۔ جس کو ہوگی بھی بہت ہی چوری  
 چھپے۔ یہ نہ ہوگا کہ ہر بلا پیوں اور بد کاریوں کا انفرادی ارتکاب متعری ہو کر پورے  
 معاشرہ میں آزادی سے اپنے زہر کو پھیلاتا رہے۔ علی الاعلان پھولنے پھلنے کا موقع ایسے  
 ماحول میں صرف حسات و معروفات ہی کو حاصل ہوگا۔ (۴) تب ہی جا کر مسلمانوں کا  
 معاشرہ بہترین قوم یا خیر امت ہوگا جو ساری دنیا کی صلاح و فلاح کے لئے نکالی یا  
 اٹھائی گئی ہے اور جس کا اصل منصب و مقام بلا امتیاز رنگ و نسل قوم و ملک پوری  
 انسانیت کو خیر و صلاح کی راہ پر لگانا اور شر و فساد کے راستے سے ہٹانا ہے۔

خیر امت کے اس منصب و مقام کا منصبی فریضہ ہی امر بالمعروف و نہی عن  
 المنکر قرار دیا گیا ہے کہ ”تم ایسی بہترین امت ہو جو اٹھائی ہی گئی ہے پوری انسانیت  
 کی بہتری کے لئے اس طرح کہ ان کو معروف کا امر اور منکر سے نہی کرتے ہو۔ کُنْتُمْ  
 خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“  
 (۵) بالآخر جب اور جہاں کہیں اس خیر امت کو اس کی خاص امتیازی شان



خیر سی کی بدولت زمین پر موعود استخلا فی سیاسی اقتدار و تمکن یا حکومت اللہ تعالیٰ کی نصرت سے عطا ہو جائے تو اس کی شرط و غرض بھی دونوں ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کو قرار دیا گیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور ان کی نصرت فرمائے گا جو اس (کے دین) کی نصرت کرتے ہیں۔ اللہ یقیناً بڑی قوت و طاقت والا ہے (بندوں کی طرف سے) خدا یا دین کی نصرت کی صورت یہی ہے) کہ جب ہم ان کو زمین پر اقتدار و تمکن بخشے ہیں تو (خود اپنی صلاح کا بھی اہتمام رکھتے ہیں کہ) نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح کا حق بھی اس طرح پورا کرتے ہیں کہ) ان کو نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں اور انجام کار سب باتیں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔“

وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَبْغِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ الَّذِينَ  
 إِن مَلَكْنَا هُم مِّنَ الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا  
 بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَبِئْسَ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ - (سورہ ۲۲)

اسلامی نظامِ صلاح و اصلاح کا یہ آخری یا پانچواں جز پہلے کے چاروں اجزاء ہی کا دراصل لازمہ و تتمہ ہے جس طرح کسی جماعت و معاشرہ کا جو فرد بجائے خود خیر کا بہترین نمونہ ہوتا ہے، وہی دوسرے افراد کو خیر کی تعلیم و تلقین کے لئے زیادہ موزوں ہوتا اور اسی کی بات زیادہ وزنی ہوتی ہے، اسی طرح پوری انسانیت کے لئے بھی وہی قوم یا امت من حیث امت خیر یا معروف کے امر و اجراء اور

شریامنکر کی ہی وائسداد کی زیادہ حقدار و ذمہ دار ہوگی، جو سب سے زیادہ خود بخود  
 معروف کے علم و عمل کی عالم و عامل ہو۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کا یہ حیثیت قوم و ملت  
 خیر امت ہونا ہی دنیا کی تمام دوسری امتوں یا قوموں کی ہدایت و اصلاح کی  
 اب و اعدراہ و تدبیر ہے۔ کیونکہ خیر و شر یا معروف و منکر کی کامل و مستند الہی تعلیمات  
 کو قیامت تک کے لئے اب اسی امت کی امانت و حفاظت میں دیدیا گیا ہے۔

ہماری شرمناک صورت | مگر ہماری امانت و حفاظت کا حال جب یہ ہو رہا ہو کہ دست  
 قرآنی آئینہ میں | بازویا قوت و طاقت کیا معنی قال و حال یا زبان و دل

تک سے معروف و منکر کے امر و نہی کے ان تعمیری عناصر راجعہ ہی کو خیر باد کہہ چکے ہو  
 جن پر خود مسلمانوں کا اجتماعی و قومی اعتبار سے خیر امت ہونا موقوف و مبنی تھا  
 تو پھر دوسری قوموں کو ہم سے کیا سبق مل سکتا ہے بلکہ الٹا نتیجہ ہی نکلنا تھا اور نکل کر  
 رہا کہ دین کے معاملہ میں دنیا کی بدترین قوم یا شر امت ساری دنیا پر اس طرح چھاگی  
 کہ ساری دنیا کے خود مسلمان بھی الٹ کر اس کو بہترین قوم (خیر امت) سمجھنے اور  
 اس کے نقش قدم پر چلنے میں اپنی خیر ماننے لگے۔ عملاً بس ہو ہو وہی نقشہ ہمارا ہو رہا  
 ہے جو خود قرآن مجید نے ابتداءً اسلام میں منافقین و یہود کا کھینچا ہے کہ

کفر کی باتوں میں دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں زبانوں الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ

پرایمان و اسلام کا دعویٰ ہر دلوں میں اس کا الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ

نام و نشان نہیں . . . . . تَوَدُّ مِنْ قُلُوبِهِمْ . . . . .

خدا کی باتوں کو توڑ مروڑ یا تحریف کر کے ان کے  
اصل مطلب سے ہٹا اور اپنے مطلب کا بنا کر لوگو  
سے کہتے ہیں کہ ان (مخرف) باتوں ہی پر تم سے  
عمل کرنے کو کہا جائے تو کرو ورنہ نہ کرو۔ . . .  
اللہ تعالیٰ دنیا کی پراڑے ہوئے ایسے دلوں کو  
پاک فرمانے کا ارادہ ہی نہیں فرماتا۔ ان کیلئے  
تو دنیا میں بھی ربوزنہ صفت نقالی اور احساس  
کمتری کی رسوائی ہی رسوائی ہے اور آخرت  
میں تو بڑی سزا ہے۔

يُحْرِفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ  
يَقُولُونَ إِنَّا أُوتِينَاهُمْ هَذَا فَخَذُوهُ  
وَإِن لَّمْ تُوْتُوهُ فَاخْذُوا...  
.....  
أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِهِمُ اللَّهُ  
نُورَهُمْ قُلُوبَهُمْ فِي الدُّنْيَا  
خَيْرِي وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ  
عَظِيمٌ (۵۱)

کاش پرانے منافقین کے اس آئینہ میں آج ہم خود بد عیان ایمان اپنی صورت دیکھتے  
اور پہچانتے! خصوصاً جدید تعلیم و تہذیب کے وہ طبقات جن کے ہاتھ میں ہر جگہ  
مسلمانوں کی قیادت و حکومت آگئی ہے کہ مغرب و مغربیت کی ہر گندگی پر مکھیوں  
کی طرح گرتے ہیں۔ زبانوں پر اسلام، اسلام کے دعوے اور نعرے ہیں لیکن دل ایمان  
و اسلام کے یقین سے خالی۔ قرآن و حدیث کی ”برقی و پرویزی“ انتہائی جاہلانہ تحریفاً  
تک پر اتنے جری کہ پوری اسلامیت کو بالکل فرنگیت کے قالب میں ڈھال لینا چاہتے  
ہیں۔ نہ اس منافقانہ اسلام کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینے اور اصل اسلام کی طرف  
رخ کرنے سے روکنے میں اپنی والی کوئی کسر اٹھا رکھتے ہیں۔ ظاہری طور پر جہاں

کچھ آزاد ہیں یا نام نہاد آزادی حاصل ہو گئی ہے وہاں بھی اس آزادی کو مسلمانوں کو مسلمان  
یا خیر امت بنانے یا اسلام و اسلامیت کی خدمت میں استعمال کرنے کی جگہ اس  
سے اسلام دشمنوں ہی کی نقالی و غلامی کا کام لیتے اور آخرت کی برابری سے پہلے  
ہی دنیا کی رسوائی خریدتے ہیں: فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي  
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲۷)

جدید تعلیم والے تو پھر بھی اپنی تعلیمی ذہنیت ہی کے ہاتھوں خود اپنی اور اپنے  
سے بڑھ کر اپنے دین و ملت کی رسوائیوں کی اس راہ و روش پر ایک حد تک معذور کہے جائیں  
ہیں لیکن ان جدید (ماڈرن) مولویوں پر کس زبان و قلم سے نا تم کیا جائے، جن کی تعلیم تمام تر در  
دارالعلوموں میں ہوئی۔ کہ اپنی جدت پسندی و روشن خیالی کی داد دینے اور لینے میں تعد  
ازدواج و قطعید وغیرہ کے ایسے مسائل و حدود تک میں مَجْرَفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ  
مَوَاضِعِهِ كِي جرات سے نہیں چوکتے، جو کتاب و سنت میں منصوص اور عملاً سلف  
لے کر خلف تک متواتر و مسلم چلے آ رہے ہیں۔

۱۷ ابھی ۲۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو "مسلمانوں کی خاندانی زندگی" کے نام سے وہاں کے فوجی صدر کی طرف  
سے جو فرمان صادر کیا گیا ہے اور جو کتاب و سنت اور قریباً چودہ سو سالہ اجماع و تعامل کے سراسر خلاف  
ہے مگر اعلان یہ کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد قرآن پر عمل کرانا ہے۔ انشاء!

يُخَدَعُونَ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَآيُخَدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ -  
۱۸ اور یہ بھری بھری کارنامے ماہانہ رسالے اور کتابوں پر کتابوں کے ذریعہ اس ملک میں انجام دیئے جاتے  
جو عین اسلام کے نام پر لاکھوں مسلمانوں کا خون کرا کے وجود میں لایا گیا ہے!

بھڑاس نکلتی ہی چلی جا رہی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ حق جوئی کے بجائے خود رانی اور خدا پرستی کے بجائے دنیا پرستی کے غلبہ و استیلا نے دین کے کھلے کھلائق و بدیہیات کو بھی خود بہتیرے اہل دین کی نظریں ایسا نظری بنا دیا ہے کہ دین اپنے گھر ہی میں "غریب" و بیگانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری سچ پوچھنے تو بہت کچھ معروف و منکر کے نظم و نظام کے تعطل ہی پر ہے۔ جس معاشرہ کے لوگ عملی زندگی میں نہ خود معروف کو جاننے پہچاننے کی فکر کرتے ہوں، نہ دوسروں کو پہچاننے کا کوئی انتظام و اہتمام رہ گیا ہو اور منکر پر انکار و نکیر کا، اس میں معروف کا حشر اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ نامعروف و اجنبی ہو کر رہ جائے اور بالآخر حدیث ہی کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہونے لگے کہ معروف منکر اور منکر معروف کی جگہ لے لے، نہ صرف عمل میں بلکہ علم میں بھی۔ یعنی لوگ معروف سے انجان ہو کر منکر ہی کو معروف جاننے اور اس کا امر کرنے لگیں۔

ہم کو جسمانی صحت کا تو بڑا خیال ہے | قریب قریب یہی صورت حال اب اس معاشرہ و امت  
مگر ایمانی صحت کی ذرا بھی فکر نہیں! | کی آنکھوں کے سامنے ہے جو خود اپنے ہی اندر نہیں،

دنیا کی تمام دوسری قوموں کے اندر بھی معروف و منکر کے امر و نہی کے لئے خاص طور پر  
نامور و مبعوث تھی۔ کوئی بالکل غیر واجنبی یا معمولی بلنے جلنے والا بھی کسی بیماری آزاری  
یا کسی جانی و مالی خطرہ سے دوچار ہو تو اس پر آگاہ کر دینا اور اپنے علم و تجربہ میں کوئی  
دوا و تدبیر ہو تو بتلا دینا معمولی بھلا آدمی بھی اپنی بھلمناہٹ یا آدمیت و شرافت کا

تقاضا جانتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ دنیا کی بیماری و خطرہ کو بیماری و خطرہ جانتا ہے لیکن دین یا ایمان و عمل صالح کی بیماریوں اور خطرات میں بیگانوں کی دوستوں عزیزوں بلکہ اپنے بال بچوں تک کو مبتلا دیکھنے والوں کتنوں کو اتنی بھی پرواہ ہوتی ہے، جتنی ان کے معمولی کھانسی بخار کی۔ صاحبزادے بلکہ اب تو بہتوں کی صاحبزادیاں بھی اگر اسکول نہ جائیں، امتحان کی تیاری نہ کریں، اس میں پاس نہ ہوں تو باز پرس، ڈانٹ ڈپٹ سب کچھ ہوگی۔ لیکن روزہ نہ رکھیں، نماز نہ پڑھیں، مسجد کا دروازہ نہ جھانکیں، جھوٹا سچ کی پرواہ نہ کریں، بے دینیوں بددنیوں کی سوسائٹی میں بگڑتے رہیں، سینما بینی سٹرکوں پر آوارہ گردی کرتے رہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ بی اے۔ ایم اے بھی ہوتے رہیں تو ماں باپ گھر بھر سب ہی بلغ بلغ! خود اپنے قریبی عزیزوں، دوستوں کے تجربات یہاں تک ہیں کہ نماز روزہ کا ذکر ہی کیا صاحبزادہ بی اے، ایم اے ہوتے ہوتے روشن خیالی کی معراج کفر و ارتداد کی باتوں تک جا پہنچے پھر بھی خاصے اچھے دیندار والدین کو ایسی اولاد کا غم نہیں حالانکہ یہی صاحبزادہ اگر ذرا کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوں تو یہی والدین جان و مال سب کی بازی لگا دیتے ہیں۔ بات وہی ہے کہ دین کی صحت و مرض بیماری و ہلاکت یا معروف و منکر کی شعوری اہمیت و وزن ایسے دیندار والدین کے قلب میں بھی دنیاوی زندگی کے معمولی نفع و ضرر کے برابر بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ اس کا بڑا سبب بھی یہی ہے کہ جس چیز کی برائی بھلائی کا شعور و احساس بہ حیثیت مجموعی پورے معاشرہ میں مردہ ہو چکا ہو اس کے کچھ افراد اگر اپنے ذاتی عمل کی حد تک معاشرہ کی عمومی روش سے

کچھ الگ بھی ہوں تو اس کی وجہ بالعموم کوئی اتفاقی و استثنائی عادت کی سی "کَمَا  
يَدْخُلُ الْاِيْمَانَ فِي قُلُوْبِكُمْ" والی نیم جان ہی ہوتی ہے نہ کہ دل میں جاں گزریں یا  
شعوری ایمان و یقین کی زندگی و سرگرمی کی طرح فعال و جاندار، حوالاً زیادہ مسروں  
میں بھی صحتمند زندگی ہی کے آثار و افعال دیکھنا چاہتی ہے۔

افسوس کہ علما و خواص کا ایمان تک | اب تو عوام کیا علما و خواص تک کا ایمان کچھ نیم جان  
محض انفعالی ہو کر رہ گیا ہے۔ | اور انفعالی ہو کر رہ گیا ہے کہ بڑے بڑے خاندانی علما و  
مشائخ کے گھروں میں بھی یہی عبرتناک تماشہ دیکھا جاتا ہے۔ ابھی ایک دو پشت پہلے  
باپ دادا مسلم عالم و بزرگ تھے لیکن بیٹوں پوتوں کی وضع قطع صورت شکل باپ  
دادا سے کیا ملتی، نماز روزہ کے معمولی واجبات و فرائض اور بہتوں نے ایمان و اعتقاد  
تک سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ اس کے بعد اسلامی معاملات و اخلاق اور معاشرت  
کا ماتم ہی کیا ہی نہیں کہ اولاد کی معاملاتی بد عنوانیوں پر کوئی موثر مواخذہ نہیں بلکہ  
جان کر بھی ایسی اولاد کے ایسے معاملات میں بواسطہ یا بلا واسطہ معین و مددگار ہیں،  
جن سے ان کی بد معاملگیوں کی اور سمیت بڑھتی ہے۔ رہیں اخلاقی و معاشرتی کوتاہیاں تو  
ڈھونڈے ہی سے اب ویسا کوئی عالم و بزرگ لے گا جس کی مجلس خود ہی کبر و ریاحسد و  
غیبت، حرص و ہوس، نفس و نفسانیت، جاہ طلبی و زرپرستی کی باتوں سے گرم نہ رہتی ہو،  
تواہل و عیال یا اپنے توابع اور عام مسلمانوں کی روک ٹوک کا سوال ہی کیا! کہاں حدیث  
میں آتا ہے کہ "معروف و منکر کے امر و نہی یا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا آدمی اور جو کچھ بھی

گفتگو کرتا ہے اس کے حق میں بڑی ہی بڑی ہوتی ہے" کہاں عوام و جہلا نہیں ہمارے خواص و  
 علما کی مجلسوں کو بھی جا کر دیکھ لیجئے بالعموم ان ہی باتوں خصوصاً منکرات پر روک ٹوک  
 سے خالی ہوں گی۔ جو حضرات خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاحی خدات ہی میں مشغول ہیں  
 ان کی بھی خاص مجلسوں کو معروف و منکر کے خصوصی امر و نہی سے آپ خالی ہی پائیں  
 گے۔ بیشک نرمی سے کہئے، حکمت و دانائی سے کہئے، تنہائی میں سمجھائیے لیکن کہتے تو ایمان  
 و عمل صالح کے ہر چھوٹے بڑے معروف و منکر کے معاملہ میں۔

بہت سے منکرات کو ہم معمولی اور ایک اور بڑی غلطی اور غلط فہمی بہت سے منکرات و معاصی  
 ناقابل توجہ سمجھنے لگے ہیں۔

کے صغیر و خفیف یا چھوٹے اور ہلکے ہونے کے استخفاف  
 بلکہ استحقار کی پھیل گئی ہے حتیٰ کہ ماڈرن علما کی زبانوں پر ان کا "محقرات امور" تک ہونا  
 آجاتا ہے! اور بعض حضرات تو ان کی اصلاح کو نظر انداز کر دیتا ہی عین اصلاحی حکمت و  
 دانش خیال فرماتے ہیں۔ حالانکہ معصیت چھوٹی ہو یا بڑی ہے بہر حال وہ معصیت یعنی  
 خدا کی نافرمانی یا اس کی ناراضی کا سودا۔ اور خدا کی چھوٹی سی چھوٹی ناراضی کو چھوٹا سمجھنا  
 اور چھوٹا سمجھ کر بھول چوک سے نہیں دیدہ و دانستہ بے جھجک برابر خریدتے رہنا۔ خود ہی  
 سوچئے کہ کتنی بڑی بے باکی و جسارت بلکہ خدائے ذوالجلال کی عظمت و جلال کی صریح  
 عملی نفی ہے۔ یہی راز ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو جان بوجھ کر برابر کرتے رہنا یا صغائر  
 پر اصرار خود کبیرہ یا بڑا گناہ یا بڑی نافرمانی بن جاتا ہے۔ ذرا خود اپنی فطرت کو ٹٹولئے کہ جس  
 کی جتنی زیادہ عظمت و محبت آپ کے قلب میں ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ آپ اس کی



چھوٹی سی چھوٹی ناراضی و نافرمانی سے بھی طبعاً کتنا بچتے اور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں میں آپ اس کی خوشی و خوشنودی کا منہ دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر سوچتے تو یہی کہ ایمان و اسلام کا دعویٰ کرنے والے کی نظر میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون معظّم و محبوب ہو سکتا ہے یا ہونا چاہئے۔

”جمال پسندی“ کا فطری جذبہ دین | ایک اور انسان کی بالکل فطرت ہی کا مطالبہ ہے کہ وہ مقدّم ہی کے معاملہ میں سرد ہو جاتا ہے | بھر اپنی چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی ناقص یا داغدار رکھنا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ کھانے پینے، رہنے سہنے ہر معاملہ میں اپنی والی ”خوب سے خوب تر“ ہی کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ مرغوب و مطلوب شئی میں کمال ہی کا طالب و حریص رہتا ہے۔ بلکہ جب پورے کمال کا ساعی ہوتا ہے تب ہی جا کر اس کو تھوڑا بہت دلخواہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ پھر کیا قناعت کی مشق کے لئے دین اور دین کی باتیں یا خدا اور رسول کی رضا و ناراضی کے اوامرو نواہی رہ گئے ہیں۔ ایک اور مثال بہت موٹی لیجئے کہ کسی دولت مند ہزاروں لاکھوں کے مالک کے اگر دس پانچ روپے جیب سے گرتے رہتے ہوں تو کیا وہ ان کو برابر گرتے یا کسی اور طرح بے پرواہی سے ضائع جاتے دیکھتا رہے گا۔ ایسا کرنے والا اگر دولت مند ہو بھی تو مفلس ہوتے دیر اس کو بھی نہ لگے گی۔

بات یہ ہے کہ دین کی دولت کا دولت ہونا کیا سچ پوچھتے تو دین کی حقیقت ہی ہماری نظر سے غائب ہے۔ جب دنیا کی چند روزہ زندگی — وہ بھی ایسی کہ ٹھکانا ایک روز کیا ایک سانس کا نہیں — اس کی ضروریات ہی نہیں فضولیات تک کی چھوٹی

چھوٹی چیزوں کے بناؤ ستوار میں اپنی والی ہم کوئی گور کسر لگی نہیں رکھتے، تو دین جس کی حقیقت پورم دین یا آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اُس کے بناؤ بگاڑ، ترقی و منزل، نقص و کمال کے کسی معاملہ کو حقیر و خفیف یا چھوٹا اور ہلکا جانتا، خدا و رسول کی عظمت و محبت کی شان سے قطع نظر بجائے خود خالص طبعی و فطری نقطہ نظر کے بھی سراسر متافی ہے۔ کوئی سلیم الفطرت انسان اپنے صاف و شفاف کپڑوں پر ذرا سی نجاست کی چھینٹ یا داغ دھبہ لگ جانا اتفاقی طور بھی پسند نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ ایسے دھبوں کو چھوٹا جان کر سارے لباس پر ان کی گل کاریاں بے فکری سے کرتا رہے۔ دین کی قدر و قیمت اور پورم دین کی حقیقت پر نظر رکھنے والے کو تو اپنی آخرت کے سدا بہار ایک پھول پتی کے برباد ہونے کا بھی اتنا غم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے صحابہ و تابعین کا نہیں، اس گئی صدی کے اواخر اور اسی ہندوستان کا ذکر ہے کہ دیوبند کے ایک بزرگ حاجی محمد عابد صاحب کو:-

”ایک روز بہت رنجیدہ دیکھا گیا۔ کبیدگی و افسردگی کی یہ حالت تھی کہ جیسے کسی

جواں مرگ پر ہو۔ جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ

اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریر یہ فوت ہو گئی۔“

گر زباغے دل خلالے کم بود

بردنِ سالک ہزاراں غم بود

لہ سوانح قاسمی جلد دوم از مولانا گیلانی ص ۲۴۱-

خدا کی "رحمانیت" کا غلط تصور بھی ایک اوزر بردست بڑا شیطانی نرغہ و قریب خوف ورجا صراطِ مستقیم سے ہٹائے ہوئے ہے! کے ایمانی اعتدال و توازن کے بجائے خارجیت کے دوسرے

سرے پر جانیت و مرجیئت کا غلو و غلبہ ہے جس نے سلف سے خلف تک اچھے اچھے اہل علم کو صراطِ مستقیم سے ڈگا دیا۔ یعنی خدا کی رحمت و رحمانیت، عفو و کرم پر بھروسہ کر کے معاصی و منکرات پر دلیر ہو جانا۔ بشر بشری ہے فرشتہ نہیں۔ وہ ایمان و عمل صالح کے اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی بشریت کے تقاضوں اور لغزشوں سے معصوم نہیں بن جاسکتا کہ خدا کی رحمت و مغفرت سے بے نیاز ہو جائے بلکہ سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ کی عظمت و کبریائی کے سامنے حضرات انبیاء علیہم السلام بھی باوصف معصومیت اپنے ایمان و عمل کے انتہائی کمالات کو بھی بیچ دینے ہی پاتے اور نجات و مغفرت کے لئے پناہ اس کے فضل و کرم ہی کے دامن میں ڈھونڈتے اور پاتے ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو بہانہ بنا کر بڑے چھوٹے کسی طرح کے معاصی و منکرات پر دیدہ و دانستہ نفس کو مسلسل ڈھیل دیتے رہنا اس کا سبب تو جیسا کہ حضرت امام غزالیؒ کی تشخیص ہے کفر خفی یا پھر حماقت جلی ہے ارشاد ہے کہ

"تو دوری وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے ایک کفر خفی اور ایک حماقت صریح۔"

کفر خفی یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے اور ثواب و عقاب کو تو ناواقف ہے،

۱۔ مولانا علی میاں سلمہ کی تازہ تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" سے مستفید ہو رہا تھا کہ ص ۱۶۴ پر یہ بر محل ارشاد ہاتھ آگیا۔

اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر مخفی اور اس کے استدراج کا خیال کئے بغیر اس کے عفو و کرم پر اعتماد ہے۔ حالانکہ (دنیا و معاش کے معاملات میں) تو برونی کے ایک ٹکڑے، غلہ کے ایک دانے اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا پر بھروسہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار جتن کرتا ہے اور اس جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہو کہ الکیس من واف نفسه وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسه هواها وتمتی علی اللہ الامانی (ہوشیار ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا رہے۔)

واقعی اسلام کا دعویٰ کرنے والے اُن دانشمندیوں کی یہ منطق و ذہنیت عجیب ہی عجیب ہے کہ دنیا کی مسافرانہ زندگی کے ادنیٰ ادنیٰ اغراض و مقاصد کے لئے بھی ہزار جتن کرتے ہیں لیکن آخرت کی ہمیشگی والے وطن کی خیر و فلاح کے معاملہ میں خدا کے رحم و کرم اور عفو و درگزر پر اعتماد و تکیہ کافی جانتے ہیں!

ہر گناہ ایک بیماری ہے اور غفلت | کہنا یہی ہے کہ معاصی و منکرات چھوٹے ہوں یا بڑے اس کو مہلک بنا دیتی ہے۔ | ہیں سب بیماریاں ہی۔ بارہا چھوٹی سی بیماری مسلسل

غفلت و بے فکری کی بدولت بڑی سے بڑی بیماری کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بیماریاں اگر جسم بھر میں یا اکثر اعضا و جوارح میں پھیل جائیں تو

بھی زندگی کے مقاصد و مشاغل سے آدمی بڑی حد تک ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ دارہ میں درد ہو، آنکھوں میں آشوب ہو، پاؤں میں لنگ ہو، ہاتھ کی انگلیوں میں ورم ہو تو بتائیے کہ ایسا آدمی زندگی کا کونسا کام ٹھیک کر سکتا ہے۔ اسی طرح دین کی چھوٹی چھوٹی بیماریاں ہی اگر عقائد و دیانات عبادات و معاملات و معاشرت، غرض ایمان و عمل صالح کے سارے اعضاء و جوارح میں پھیل گئی ہوں اور ان کو چھوٹا یا ہلکا جان کر پیہم ان سے بے پڑا ہی برتی جا رہی ہو، تو یہ صغائر خود ہی کبائر نہ بن جاتے تو بھی ان میں مبتلا کیا صحت مند دینی زندگی کے حقوق ادا کر سکتا ہے۔ چہ جائیکہ بہ حیثیت مجموعی ایمان و عمل صالح کا سارا تن بدن کم و بیش صغائر و کبائر سب سے داغ داغ ہو رہا ہو، تو اسلامی تعلیمات کے وہ دینی دنیوی، انفرادی و اجتماعی برکات و ثمرات جو خود اسلام کی کتاب میں قدم قدم پر ایمان و عمل صالح کی صحتمند زندگی ہی کے ساتھ مشروط و موعود ہیں ان کے بجائے زبان و خسران یا گھائے ہی گھائے کے سوا کچھ ہاتھ لگ سکتا ہے۔

تقریروں، تحریروں، کتابوں، رسالوں میں دن رات ہم عہد رسالت و خلافت راشدہ کے واقعات اور تاریخ کو دہراتے رہتے ہیں حالانکہ اس عہد سعادت میں زبان و قلم چلانے کا تو کہنا چاہئے کہ نام ہی نہ تھا، سارا زور ایمان پر مبنی، عبادات و معاملات، اخلاق اور معاشرت کے چھوٹے بڑے اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب پر تھا۔ اور یہ اتباع و اجتناب بھی خود غرضانہ یا اپنی ہی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ دوسروں کو معروف و منکر کا امر و نہی کرنا بھی خود اپنا ہی عمل صالح جانتے اور اس کے واجبات و

مستحبات کا اپنے کو اس طرح مامور و مسئول یا ذمہ دار و جواب دہ جانتے جس طرح خود اپنی ذات کے اعمال و افعال کا۔ کبائر کے عام ارتکاب کا تو ان قرون خیر میں سوال ہی کیا۔ سیکڑوں ہزاروں میں ایک آدھ سے بھی ان کا صدور ہو جاتا تو ایمانی حس و ادراک اتنا بیدار و جاندار اور خدرا و آخرت کا خوف اتنا شدید کہ اس کے مقابلہ میں عورتیں تک خود اپنے جرم کا اقرار کر کے باصرار سنگ ساری کی عبرتناک موت قبول کر لینا آسان جانتی تھیں۔

دوسروں کو امر و نہی کی جو کچھ نوبت آتی تھی وہ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر ان بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر روک ٹوک کا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھ زبان او دل سے جیسا اہتمام تھا۔ تینوں کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

استیذان یا حصول اجازت بظاہر ایک معمولی معاشرتی ادب کا معاملہ ہے لیکن متفق علیہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں یہاں تک ہے کہ ”اگر بلا اجازت تم کو کوئی جھانکے بھی اور تم اس کو کنکری مار دو جس سے اس کی آنکھ ہی کیوں نہ پھوٹ جائے تو تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔“ عام عادت ہے کہ دروازہ پر کوئی آواز یا دستک دے اور پوچھو کہ کون ہے؟ تو جواب میں صرف ”میں“ کہہ دینے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ حضرت جابرؓ نے ایسا ہی جواب دیا تو آپؐ نے نہایت ناگواری سے فرمایا کہ ”میں کیا“ اصاف نام لے کر بتلانا چاہئے کہ فلاں ہوں۔



صحابہ کرام میں چھوٹی چھوٹی | معلم کتاب و حکمت علیہ التسلیم والتحیہ کی اسی نبوی تعلیم و تربیت  
باتوں کی نگہداشت | کا اثر حضرات صحابہ میں یہ تھا کہ خدا و رسول کی نافرمانی و

ناراضی کی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ان کی نظر کے سامنے آجاتی تو اس کو نظر انداز نہ کرنا کسی حال میں بھی گوارا نہ فرماتے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جن کی عظمت آج حکومت کے متوالوں کی نظر میں زیادہ تر ان کے ایک کامیاب صاحب حکومت و سیاست کی ہے، دیکھو کہ ان کی نظر بھی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کتنی رہتی تھی جن کو ہماری بڑی بڑی اصلاحی دعوتوں اور نامی گرامی دینی مدرسوں کے اچھے اچھے صاحب علم و صلاح ذمہ دار بھی اتنی چھوٹی جانتے ہیں کہ طلبا کیا اساتذہ تک کو معمولی و زبانی تنبیہ تفہیم تک کے درخور نہیں خیال فرماتے۔ آپ کو شہید کیا جا چکا ہے، آخری وقت ہے، عین اس حالت میں اسی نام نہاد ”چھوٹی“ بات پر بھی امر و نہی کا یہ خیال کہ کوئی نوجوان ٹخنوں سے نیچی ازار میں سامنے آجاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ ”بیٹا ازار ٹخنوں سے اونچا رکھا کرو، اس میں صفائی بھی اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری بھی۔“ ان ہی فاروق اعظم کا قول ہے کہ کسی کو اس کے عیب پر مطلع و متنبہ کر دینا، اس کو ہدیہ دینے کے ہم معنی ہے۔ ہدیہ کا حکم و حکمت یہ ہے کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ — تھادوا تتحابوا — لیکن آج بالعموم سب سے زیادہ نا محبوب و نامرغوب بلکہ مبغوض ہدیہ کسی دینی معروف و منکر کا امر و نہی ہے جو بارہا محبت کے بجائے اُلٹے نفرت کا سبب ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی نوکری چاکری یا جاہ و مال وغیرہ کے

کسی دنیوی نفع و ضرر سے کسی کو آگاہ کر دو تو البتہ تم کو اپنا بہت بڑا دوست و خیر خواہ  
جانے گا!

حضرت امام غزالیؒ نے احوال العلوم میں جہاں مسجد و بازار وغیرہ مختلف مقامات  
و مواقع کے منکرات گنائے ہیں وہاں راستہ کے منکرات میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں تک  
شامل ہیں کہ کوئی راستہ میں خرپوزہ کے جھلکے یا اتنا پانی ڈال دے جس سے لوگوں کے پھسلنے  
کا ڈر ہو تو اس کو بھی روکنا چاہئے۔ جانور پر کوئی اس کے برداشت سے زیادہ بوجھ لا دے  
جاریا ہو تو اس کو بھی منع کرنا واجب ہے۔

خیر القرون کے بعد بھی مدت تک | خدا ہی بہتر جانتا ہے یا تاریخ کے جاننے والے کچھ بتا سکتے  
امروہی کا اہتمام رہا | ہوں کہ امدد محمدیہ کی تاریخ میں یہ افتاد کب سے پڑی

کہ اس فاروقی ہدیہ کا اب راستہ گلی یا غیروں پر ایوں میں کیا خود اپنوں اور اپنے گھروں  
میں نہ خوش دلی سے کوئی دینے والا ہی ملتا ہے نہ لینے والا۔ اگرچہ خلفائے عباسیہ کے  
زمانے ہی میں کم و بیش ہر طرح کے منکرات و مفاسد پھیل چکے تھے، تاہم امام صاحب ہی  
نے ایسے واقعات نقل فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک معروف و  
منکر کے امروہی کا فریضہ مسلمان معاشرہ میں آج کل کی طرح نسیا نہیں ہو چکا  
تھا۔ ایک طرف خود ان خلفائے کو لوگ ٹوک دینے کی جرأت رکھتے تھے۔ دوسری طرف  
عوام میں بھی ایک دوسرے کو روک ٹوک کرنے والا پائے جاتے تھے۔

”خليفة تامون کو معلوم ہوا کہ ایک شخص بلا خلیفہ کے حکم و اجازت کے لوگوں میں



معروف و منکر کا امر وہی کرتا ہے خلیفہ نے بلوا کر پوچھا کہ تم بلا ہماری اجازت کے ایسا کیوں کرتے ہو۔ مامون اس وقت کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا جس کا کوئی حصہ گر کر اس کے پاؤں کے تلے آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے اپنا پیر خدا کے ناموں پر سے ہٹا لیجئے پھر جو کچھ فرمایا ہو فرمائیے۔ مامون مطلب نہ سمجھا اور بار بار پوچھتا رہا کہ کیا کہتے ہو؟ آخر چوتھی بار اس شخص نے کہا کہ یا تو آپ خود اٹھائیں یا مجھ کو اجازت دیں کہ میں اٹھ لوں۔ اجازت دی تو اس نے پاؤں تلے کی کتاب کی طرف اشارہ کیا تب خود مامون نے کتاب کو اٹھا کر چوم لیا۔ اس کے بعد پھر اس شخص سے سوال کیا کہ تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیوں کرتے ہو؟ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سپرد کیا ہے کہ

جب ہم ان کو زمین پر اقتدار عطا کرتے ہیں تو الذین ان مکناہم فی الارض قاموا وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امرنا بالمعروف و نہی عن المنکر کو معروف و منکر کا امر وہی کرتے ہیں۔ و نحو عن المنکر۔ (۲۲)

اس نے جواب دیا کہ اے امیر المؤمنین آپ نے بجا فرمایا لیکن ہم (عوام یا رعایا) اس معاملہ (یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر) میں آپ ہی کے مددگار ہیں۔ اور اس کا انکار وہی کرے گا جو کتاب و سنت سے ناواقف ہو، خود اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے کہ

مسلمان مردہوں یا عورت سب ایک دوسرے المؤمنون و المؤمنات بعضهم کے مددگار و خیر خواہ ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے اولیاء بعض یا مہرین بالمعروف و نہی عن المنکر کو معروف و منکر کا امر وہی کرتے ہیں۔ و ینہون عن المنکر۔ (۹)

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی مثال عمارت کی سی ہے جس کی ایک اینٹ دوسری کو سنبھالتی ہے — المؤمن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً — تو جو شخص کتاب و سنت کے احکام (یا اوامر و نواہی) کے جاری کرنے میں آپ کی مدد کرے، اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

یہ اور اس قسم کی جو دوسری حکایات امام صاحب نے ذکر فرمائی ہیں ان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون اور خلافت کے بعد بھی مدتوں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اسلامی انتظام و نظام کی اس اہمیت کا کچھ نہ کچھ احساس و اہتمام عام مسلمانوں تک میں موجود تھا کہ اس کو صرف علماء و حکام کا فریضہ نہیں جانتے تھے، بلکہ خود قرآن کی اس آیت (الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ) کی رو سے جس کو راقم ہذا بار بار دہراتا آیا ہے معروف و منکر کے امر و نہی یا نگرانی کو ہر مسلمان کی ایمانی و اسلامی ذمہ داری جانتے تھے اور المؤمن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً کی حدیث کی رو سے تو سچ پوچھتے مسلمان اجتماعی حیثیت سے ایسی عمارت بن ہی نہیں سکتے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے ہو، جہنگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ اپنے اپنے محل و مقام کے مناسب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی ایمان و عمل صالح کی اینٹ کا سہارا نہ بنا رہے۔ معروف و منکر کی حقیقت ہی اس کے سوا کیا ہے کہ وہ نام ہے معاشرہ میں ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے احکام یا اوامر و نواہی کے عملی اجرا کا۔

(سہ داشیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک خصوصی معاشری اصلاح | یادش بخیر۔ تھانہ بھون ہی کی یاد نے ایک اور بہت بڑے  
کی کوشش عام ہونی چاہئے | فساد کی یاد تازہ کر دی جس کا تعلق بھی دراصل معروف و

منکر ہی کے امر و نہی سے ہے۔ مراد ذات البین کا فساد ہے۔ معاشرہ میں کتنی گونا گوں  
دینی و دنیوی جانی و مالی، انفرادی و اجتماعی تباہیاں اور پر بادیاں آپس کے بگاڑ اور

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

سلسلہ اس سرِ پائمنکرات کو الحمد للہ خورد و بزرگ بہت سے علما و صلحا سے تعلق کی سعادت نصیب رہی مگر  
پوری زندگی میں عمر میں صرف ایک خورد مگر علم و صلاح میں بزرگ ایسے ناصح ملے جن سے تجربہ ہوا کہ  
دین واقعی سراسر نصیحت و خیر خواہی (الدین النصیحت) ہے۔ یہ خود راقمِ احقر کی وضع و قطع کی بعض  
ظاہری کوتاہیوں سے لے کر اولاد کی تربیت تک کے معاملات میں خورد اور خوردین رہ کر اس وقت تک  
برابر ہر چھوٹی سی چھوٹی بات کی طرف متوجہ فرماتے رہے، جب تک احقر کے عذرات معقول و مقبول ہوتے  
کا اطمینان نہ فرمایا۔ یا اس نے اپنی رائے و عمل سے رجوع نہ کر لیا، یا رجوع سے یا پس نہ ہو گئے۔ بے کج  
رہا نہیں جانا کہ یہ واحد استثنائی مثال سب سے کم عمر ایک تھانوی تربیت یافتہ — نام بھی لے دینے  
ہی کا جی چاہتا ہے — حضرت مولانا سید ابراہیم صاحب سلمہ (مہر دوئی) کی ہے۔ ان کا ناصحانہ و  
خیر خواہانہ معاملہ حسب تعلق کم و بیش سب ہی اہل تعلق سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس اصلاحی اخوت،  
دینی نصیحت اور ایمانی نگرانی و ولایت کی جزائے خیر بال بال بے حساب عطا فرمائے کہ نہ صرف اپنی ذات  
تک بلکہ اپنی تبلیغی و اصلاحی دعوت الحق کے ذریعہ اللہ کی کتاب اور اس پرستی رسول کی سب سے اہم  
لیکن مردہ اصلاحی سنت کے نظم و نظام کو از سر نو زندہ فرما رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بعض تھانوی نسبت  
والے اکابر ہی کا یہ بھی تجربہ ہوا کہ اپنی اولاد و توابع معتقدوں مریدوں تک سے اپنی طبعی کمزوری یا ان کی  
وجاہت وغیرہ سے متاثر ہو کر چشم پوشی و خاموشی ہی نہیں اختیار فرماتے، ہم تو انی تک فرما دیتے ہیں  
اور صریح منکرات پر مطلع ہو کر بھی بہ لطائف انجیل ان کی اصلاح سے گریز فرماتے ہیں حالانکہ پیری و  
مریدی کے تعلق کو خود حضرت مجدد وقت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے اولاد و والدین یا میاں بیوی کے  
تعلق سے بھی زیادہ ذمہ داری و مسئولیت قرار دیا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

جھگڑوں ہی کا وبال ہوتی ہیں جو بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہو کر بڑی سے بڑی دشمنی تک جا پہنچتی ہیں۔ عمر بھر کی محبتیں عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہیں، پرانے پرانے دوست ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے پر آمادہ بلکہ بیٹا باپ کے اور باپ بیٹے تک کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے جس کا ٹور ایک ہی ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کہ بیعت کی حقیقت ہی مرید کی طرف سے صریح معاہدہ ابتلاء کی ہے اور پیری کی طرف سے صریح معاہدہ اصلاح ہے اس لئے مرید کی اصلاح کے معاملات میں چشم پوشی و خاموشی دراصل کھلی خیانت و بدعہدی ہے۔ ارشاد ہے کہ

» ایک وہ ہیں جنہوں نے اطاعت کا ہم سے صریح معاہدہ نہیں کیا ہے جیسے بی بی بچے

کہ گو شرعاً ان پر ہماری اطاعت واجب ہے مگر انہوں نے صراحتاً اس کا کوئی التزام

و معاہدہ نہیں کیا کہ تم ہم کو تعلیم و تبلیغ کرو، ہم تمہاری تعلیم پر عمل کریں گے۔

مگر ایک ایسا تعلق ہے جن میں دوسرا شخص ہماری اطاعت کے صریح التزام کا عہد کرتا ہے

یعنی پیری و مریدی کا تعلق۔ کیونکہ پیری و مریدی نام ہی ہے مرید کی جانب سے معاہدہ

اطاعت کا اور پیر یا شیخ کی جانب سے معاہدہ تعلیم و اصلاح کا۔ صرف ہاتھ میں ہاتھ

لیکر سبق پڑھا دینے کا نام پیری و مریدی نہیں جیسا کہ آج عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے

کہ بس ایک مرتبہ سبق پڑھا لیا اور مرید ہو گئے، اب نہ پیر کے نزدیک تعلیم ضروری نہ مرید

کے لئے ابتلاء۔ مجھے اس میں کلام ہے کہ اس طرح کسی طالب علم کو چپکے سے جلد

مرید کر لیا جائے بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مرید کی اس غلطی کی گویا

توثیق ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے۔

مرید غریبوں کا سوال ہی کیا، تجربہ و تحقیق کر کے دیکھ لیجئے تھانوی حلقہ کے باہر پیری شاذ و نادر ایسے

بائیں گے جو بیعت کی حقیقت ہاتھ میں ہاتھ دینے سے زیادہ کچھ جانتے اور بتاتے ہوں۔ باقی مرید کے

معروف و منکر یا اصلاح کی ذمہ داری کا احساس ابھی دیکھتے ہی دیکھتے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کہ اصلاح ذات البین جو دراصل معروف و منکر ہی کے امر و نہی کی ایک صورت ہے اس کا معاشرہ میں رواج و اہتمام اس درجہ عام ہو کہ عزیزوں دوستوں تعلق والوں میں جہاں باہم دو شخصوں میں کوئی کشمکش و کشیدگی شروع ہو، بات بڑھنے اور جھڑ پکڑنے سے پہلے ہی سلجھانے اور ملانے کی کوشش لازم ہے۔ ابتدا میں کامیابی آسان ہوگی۔ مگر یہ کوشش کرے کون؟ ہمارے بہتیرے مسلمان بھائیوں کا تو اٹلے ٹھماص مذاق ٹھہرانا اور فساد ڈلوانا ہی ہوتا ہے جو اس حد تک نہیں جاتے، ان میں بھی بہت زیادہ وہ ہوتے ہیں جو لوگوں میں آپس کے بگاڑ کا تماشہ دیکھ کر لطف ضرور اٹھاتے اور موقع پا کر آگ کو بھڑکا دینے سے نہیں چوکتے۔ بعض اچھے اچھے تہجد و تسبیح والوں کو بھی اس کا رخیس کی کرتے نہیں دیکھا۔ بڑا ولی ان کو سمجھنا چاہئے جو محض غیر جانبدار تماشائی بنے رہنے پر قناعت کر لیتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس تماشہ کو تاسف و تکلیف کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) خود تھا نوی پیروں میں کیا ہوتا جا رہا ہے حالانکہ تھا نوی پیران پیر کی نظر میں یہ صریح خیانت و معصیت ہے۔

”جس میں ترک تبلیغ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ حقیقت بیعت کی رو سے جس طرح مریدی کی طرف سے اطاعت کا وعدہ ہوتا ہے اسی طرح شیخ کی طرف سے اصلاح کا۔ حیرت ہے کہ مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع، پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں، کچھ روک ٹوک نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوخ یا تو پیری کی حقیقت نہیں سمجھے یا جان بوجھ کر پہلو ہی کرتے ہیں۔“ (تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۳۱۲)

کم از کم تمنا نہ بھون میں پیری و مریدی کی حقیقت کا یہ سبق اتنا ڈرایا جاتا تھا کہ جان بوجھ کر پہلو ہی کے سوا اتنی جلد اس سبق کے بھولنے کا حسن ظن بہت ضعیف الحافظہ حضرات ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

دیکھتے ہیں۔ باقی ایسا تو شاذ ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا جس کو اپنے خاص دوستوں عزیزوں میں بھی اصلاح ذات البین کی کوئی خاص فکر ہوتی ہو، اور ایسے تو بڑے بڑے رہنماوں میں بھی عنقا کا حکم رکھتے ہیں، جو اس کو دین و آخرت اجر و ثواب کا کوئی بڑا کام جانتے اور خود اس میں کوئی خاص بڑی دلچسپی لیتے اور کوشش فرماتے ہوں، کم از کم راقم عاجز کو تو مدت العمر میں ایک ہی آدھا ایسی مثال ملی وہ بھی ادھوری، نیم دلانہ کوشش و دلچسپی کی۔

”حکیم الامت“ کی | ہاں اس بارے میں بھی اگر کوئی بالکل استثنائی تجربہ ہوا تو وہی تمہانہ بھون  
 امتیازی شانِ اصلاح والے بدنام ”سخت گیر و سخت مزاج“ حکیم الامت کا اپنے ہی

ایک نہیں کسی خانگی معاملات میں اور کیا کہوں کہ شان ہر معاملہ میں عَزَّوَجَلَّ عَلَیْہِ فَاَعْنِیْمْ  
 حَرِیصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَوْفٌ رَّحِیْمٌ وَلَیْسَ بِیْ اللّٰمِیْنَ (فداہ بابی و امی)  
 ہی کی ایسی سراپا رفت و رحمت کی کہ اس وقت بھی یاد سے دل بھرا رہا ہے! ایک معاملہ  
 میں تو ایک قریب ترین عزیز نے پوری مسل اس مجرم کے جرائم کی مرتب کر کے خدمت میں  
 بالا بالا بھیج دی تھی۔ یہ تو کیا ہوتا کہ اس سیہ کار کے ساتھ کسی حسن ظن کی بنا پر کوئی یک طرفہ  
 رائے قائم اور فیصلہ صادر فرمادیتے۔ طول طویل پوری فہرست جرائم ملاحظہ فرمائی اور  
 گو یہ نالائق نام لیوا حاضر تھا نہ بھون ہی میں تھا مگر ایک درمیانی واسطہ سے مسل اس

سے ترجمہ بھی آیت کا تھانوی مفسر ہی کے قلم سے درج ہے کہ ”حضورؐ کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں  
 گذرتی ہے اور تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند یا حریص رہتے ہیں، اور یہ حالت تو سب ہی کے ساتھ بالخصوص  
 مومنوں مسلمانوں کے ساتھ تو بڑے شفیق و مہربان ہیں؟“

تاکید کے ساتھ بھیجی کہ اس کو پڑھ کر اطمینان سے جواب تحریر ایسی عرض کر دوں۔ ایک دوسرے اس سے زیادہ سنگین معاملہ میں تو بلا احقر کی کسی درخواست کے خاص ہدایات اور اہتمام کے ساتھ مخدومہ محترمہ پیرانی صاحبہ مدظلہا تک کو درمیان میں ڈال کر اصلاح فرمائی۔ اصلاح ذات البین کو دین کے ایک اہم حق عباد کی طرح فریقین کے حقوق کی پوری رعایت و اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کی کسی دوسری جگہ ان دو سے نہ پہلے کوئی تیسری مثال ملی نہ بعد میں۔ اگر ملیں تو بعض تقاضاوی اکابر تک کے ہاں بالکل بالعکس مصلحت پسندانہ گریزی اور مصلحت بھی کسی فریق کی ناراضی کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ باقی اور جن ایسے اہل اصلاح سے نیاز مندی کی سعادت حاصل ہے جن کے تقویٰ و تقدس کے یوں اور بہت سے تجربات کی بنا پر بہت معتقد و معترف ہوں لیکن جہاں تک اصلاح ذات البین کا تعلق ہے وہ کیا جو بڑی بڑی مستقل اصلاحی خدمات ہی کے لئے ماشاء اللہ اپنی زندگیوں کو وقف فرمائے ہوئے ہیں وہ بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بجز عام تقریری و تحریری صورتوں کے خاص انفرادی طور پر نہ معروف و منکر کے امر و نہی کو مامور خیال فرماتے ہیں نہ اصلاح ذات البین کو اصلاحی کام۔

حالانکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ہاں تحریر و تصنیف کے ”بے پایاں فتروں“ کا ذکر ہی کیا۔ خطاب عام کے ساتھ تقریروں یا خطبوں کا مجموعہ جمعوں کے علاوہ خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ اجمعین کا ہمارے آج کل کے بہت سے گھنٹوں تقریر فرمانے والے انشاگفتار خطبوں کی شاید دو ہی ایک تقریروں کے مساوی ثابت ہو۔ ورنہ حدیثوں کے

سارے مجلدات تمام تر انفرادی خطاب خاص یا مجلسی ملفوظات ہی کی نوعیت رکھتے ہیں۔ یعنی ایمان و عمل صالح کی دعوت و تعلیم بھی زیادہ تر انفرادی خطاب کے رنگ میں ہوتی تھی، اور معروف و منکر کے امر و نہی کی شان بھی یہی تھی۔ یہ مطلب بالکل نہیں کہ تصنیف و تالیف یا طول طویل تقریریں حرام ہیں، لیکن لادینی و سیاسی پروگنڈا بازوں کی طرح ان کی اتنی بھرمار کہ قلم و زبان کی دراز نفسی ہی گویا اصلی کام ہے، یہ یقیناً دین اور دینی و انبیائی طرز و طریق اور روح و مزاج کے خلاف ہے۔ انبیائی دعوت و اصلاح تعلیم و تبلیغ امر و نہی کا اصل طریق انفرادی و مجلسی یا خطاب خاص ہی کاربہا ہے۔ موٹی بات یہ ہے کہ جس چیز کی تعلیم و اصلاح ہم خطاب عام سے ضروری جانتے اس کے خلاف جب اپنی آنکھوں کے سامنے گھر باہر دوستوں عزیزوں ملنے جلنے والوں کو کرتے دیکھیں تو اس کے لئے آنکھیں بند کئے رہنا کیسے جائز ہوگا کہ عام جلسوں، تقریروں یا کتابوں مضمونوں کے ذریعہ تو کہتے ہی رہتے ہیں اور آئندہ بھی کہتے رہیں گے!

اصلاح "ذات البین" کی بہر حال اس وقت ذکر خاص ذات البین کی اصلاح کا چل رہا تھا قرآنی و حدیثی اثاث

یہ تو اور بھی بالکلیہ فریقین ہی کو انفرادی طور پر سمجھانے بچھانے یا کوئی حاکمانہ جاہی و مالی یا اخلاقی اثر حاصل ہو، اس سے عملاً کام لینے ہی کا معاملہ ہے خود قرآن میں دیگر عنوانات کے علاوہ خاص امر ہی کے عنوان سے جو حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس میں کسی سے لڑائی جھگڑا یا شر و فساد پیدا ہو تو تو اس کی اصلاح خود ہی کر لیا کرو (فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ) (۲۱) دوسری جگہ خصوصیت کے ساتھ



مسلمانوں کو حکم ہے کہ ”مسلمان (اپنے پرانے) سب ہی بھائی بھائی ہیں لہذا جن دو بھائیوں میں کچھ جھگڑا فساد پیدا ہو جائے اس کو (جہاں تک تمہارے امکان میں ہو) دور یا اس کی اصلاح کر دیا کرو“ (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ) (۲۹) تو کیا اس حکم کا اصل مطلب یہ ہے کہ ”اصلاح ذات البین“ پر انشا پر دازانہ کوئی مقالہ و کتاب لکھ دیا کرو یا کوئی انشا گفتار نہ دھواں دھار تقریر کسی جلسہ و مجمع میں کر دیا کرو! یا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو فریقوں میں کوئی نزاع و فساد دیکھو تو ترغیب و ترہیب اثر و دباؤ وغیرہ کی جو صورت بھی اپنے بس میں ہو اس سے کام لے کر اصلاح کی عملی کوشش کیا کرو۔ اصلاح بین الناس ہی کے حکم کا صدقہ و معروف کے حکم کے ساتھ ذکر ہے  
 الْإِمْنُ مِنْ آخِرِ بَيْدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (۲۹) یعنی صدقہ و معروف ہی کی طرح اصلاح بین الناس بھی ایک خیر و نیکی ہی کا کام ہے جس کو خود بھی کرنا چاہئے اور دوسروں سے بھی کرنے کو کہتے رہنا چاہئے۔

ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہر شخص کے ہر ہر جوڑ بند یا عضو پر ہر سو رچ نکلنے والے دن یعنی روزانہ صدقہ عائد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صدقہ صرف مال یا روپیہ پیسہ کا نہیں ہو سکتا کہ اس کی ہر شخص کو کہاں استطاعت ہوتی ہے اس لئے آگے مثلاً کئی ایسی چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو مفلس سے مفلس کے بھی اختیار میں ہیں۔ ان میں سب سے پہلے یہی ہے کہ دو شخصوں کے درمیان انصاف و صلح کر دینا بھی صدقہ ہی ہے، کسی کو سواری پر سوار ہونے میں مدد دینا یا اس کا سامان لے کر دینا بھی

صدقہ ہے۔ کوئی اچھی بات کہہ یا بتلا دینا بھی صدقہ ہے اور ہر قدم پر جو نماز کے لئے (مسجد جانے میں) اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور راستہ سے کسی تکلیف کی چیز (کانٹے وغیرہ) کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صبح اٹھنے سے لے کر رات کو سونے تک جو یہ صدقہ و خیرات ہم پر عائد فرمایا گیا ہے جس طرح اس سے مراد نہ صرف مالی صدقہ ہے اسی طرح صرف زبانی و قلمی دعوت و تبلیغ بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اچھی بات کہہ دینے (الکلمۃ الطیبہ) کی صرف ایک فرد خطاب عام والی تقریر و تحریر بھی ہو سکتی ہے ورنہ اصل مدعا ہر فرد کو وقت و موقع اور اپنی استطاعت کے اعتبار سے دوسروں کی کوئی نہ کوئی عملی خدمت و اعانت کرتے رہنا ہے۔

خصوصاً اصلاح بین الناس کی اہمیت تو شارع علیہ السلام کی نظر میں یہاں تک ہے کہ لوگوں میں ملاپ کرانے کے لئے اگر کوئی بھلائی کی بات خلاف کہہ دینے یا "دروغ مصلحت آمیز" سے کام لینا پڑے تو وہ بھی جائز ہے بلکہ ایسا شخص سرے سے دروغ گو ہی نہیں — لیس الذی یصلح بین الناس فیضی خیرا ویقول خیرا — ایک اور بخاری و مسلم ہی کی متفق علیہ طویل روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ جھگڑا ہے تو آپ خاص کر کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر ان میں صلح کرانے تشریف لے گئے جس کی وجہ سے نماز میں کچھ تاخیر ہو گئی۔

۱۵۰ ریاض الصالحین باب اصلاح بین الناس -

آج کل اس اصلاحی خود جا کر یہ فرض و سنت ادا کرنے کو تو جانے دیجئے۔ راقم عاجز کو اچھے اچھے  
 کوشش میں دقت | مشائخ و علما کا تجربہ یہ ہے کہ درخواست کرنے پر بھی گریز فرماتے ہیں، جس  
 کی وجہ کبھی برسرناحق فریقین کی ناراضی سے بچنا ہوتا ہے اور زیادہ تر یہ کہ ایسا فریق ثالث  
 بانحیر کے منصفانہ یا شرعی فیصلہ کو قبول کرنے ہی پر تیار نہیں ہوتا۔ انتہا یہ کہ حضرت مولائی  
 و مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے وقت کے مشہور و مسلم شیخ اور سب سے  
 بڑے دینی دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث نے خود راقم احقر کو اسی طرح کے ایک  
 سلسلہ میں تخریر فرمایا کہ

”مجھ کو تو حکمت کا نہایت تلخ تجربہ متعدد مرتبہ ہوا ہے۔ فریقین فیصلے سے پہلے تو بہت  
 اعتقاد ظاہر کرتے ہیں مگر جب فیصلہ کر دیا جاتا ہے تو جس فریق کی خواہش کے مطابق نہیں  
 ہوتا تو مخالف ہو جاتا ہے اور تسلیم کرنے سے منکر ہو جاتا ہے جس سے تمام محنت بے کار  
 ہو جاتی ہے بالآخر میں نے حکم بننے سے انکار کر دیا۔ جب اس پر بھی زیادہ اصرار ہوا تو  
 میں نے رجسٹری کی شرط لگائی۔ مگر افسوس کہ رجسٹری شدہ حکم نامہ کے بعد بھی فیصلہ پر ایک  
 فریق فیصلہ کے بعد راضی نہ ہوا اور مقدمہ بازی کی لعنت پیش آئی۔“

سہ مقدمہ بازی کی لعنت کو پوچھئے ہی نہیں۔ خود راقم ہذا کو اپنی شامت اعمال اور فتنہ احوال کی بدولت اس کے  
 کئی کئی تجربات ایسے ہوئے اور ہو رہے ہیں کہ آپ بیٹی نہ ہوتی تو یقین آنا دشوار ہوتا۔ مدعی ہونے کی ہمت تو  
 کہاں سے لانا اس کے مقابلہ میں ہزاروں کے نقصانات اٹھانا ہون جانتا رہا۔

ایک طوالت ہی کو لیجئے کہ کسٹوڈین کی طرف سے ایک دعویٰ محض ایک ہریان کی عنایت سے  
 دائر ہو گیا، اس کا سلسلہ ۱۲، ۱۳ سال سے چل رہا ہے اب دو سال سے ہائی کورٹ میں ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

انا للہ وانا الیہ راجعون! سوچنے کی بات ہے کہ ایسے بزرگ کے مقابلہ میں اس کی عقیدت کے مدعیوں کو ایسی ڈھٹائی کی جرأت کیسے ہوئی۔ یہ نہیں کہ اس ڈھٹائی والے کچے شہدے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے نماز روزہ بلکہ تہجد و تسبیح والے بھی کرتے ہیں، بات وہی حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ والی یاد آتی ہے کہ دینداروں نے بھی دین خالی نماز روزہ یا اور ترقی کی تو بس عرفی عبادات کے اور ادونو افل ہی کو سمجھ رکھا ہے۔ باقی اخلاق و معاملات یا حقوق عباد کو دین کی فہرست سے خارج دنیا کے معاملات جان کر اپنے کو آزاد قرار دے لیا ہے۔ اس کے تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ جس کو بھی کچھ معاملاتی سابقہ لوگوں سے پڑتا ہے بلا استثناء سب سے شہادت اسی کی ملتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ”دین کامل“ کے متعلق محض پوجا پاٹ کا دین ہونے کی خوش فہمی پیدا کیسے ہوئی؟

موجودہ صورت حال کی ذمہ داری | جواب ایک ہی ہے۔ دین کامل یا پورے دین کے پورے علماء و مشائخ کی مدافعت پر ہے! احکام او امر و نو اہی کے جو عالم اور انبیائی امانت و وراثت کے جو حامل و وارث تھے پہلے خود ہی دنیا طلب ہو کر اپنے دنیوی معاملات میں دینی

رہنہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) پھر عدالتی قانون کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ کمزور سے کمزور بلکہ بے بنیاد دعویٰ کر کے آپ سالہا سال طوالت تو دے ہی سکتے ہیں، اور اگر جعل فریب جھوٹی گواہیوں کلا کے مختلف اور رشوتوں کا حق ادا کرتے رہیں تو کامیاب ہو جانا بھی بے بنیاد سے بے بنیاد دعویٰ میں بالکل بعید نہیں ورنہ غریب مظلوم کے جان و مال وقت و قوت سب کا دیوالہ نکلوادینا تو بالکل یقینی ہے۔

سے سنائے نہیں میں تو ذاتی تجربات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ قانون اور اس کی عدالتیں سراسر ظلم کے اڈے ہیں بلکہ اس کی تعلیم گاہیں ہیں۔ تفصیل اس کی سبق آموزی کے لئے کچھ اپنے ”اسباق زندگی“ میں کی ہے۔

ہدایات سے تہاؤن و غفلت برتنے لگے۔ لازماً ان کے عام مواعظ اور خاص اصلاحی تعلیمات میں بھی یہ حصہ کم و حذف ہوتا رہا۔ بالآخر گھر باہر، اپنیوں پر ایوں کو خطاب خاص سے روک ٹوک کا دروازہ بند ہو کر رہا۔ وہی بنی اسرائیل والی صورت کہ پہلے ان کے علما منکرات کی روک ٹوک کرتے، پھر بھی وہ نہ مانتے تو بے تکلف میل جول، کھانے پینے، دوستی عزیزداری وغیرہ کے تعلقات جاری رکھتے۔ علما بنی اسرائیل کی طرح کیا آج ہمارے علما و مشائخ اسلام کی بداہنت کا دانستہ یا نادانستہ ایک بڑا سبب یہ نہیں ہوتا کہ روک ٹوک سے دعوت و عقیدت میں خلل پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ سب کچھ سہی واقعہ بہر حال اپنی جگہ پر ہے کہ کتاب و سنت کی کھلی کھلی نصوص و تصریحات پر مبنی معروف و منکر کے امر و نہی کا جیتا جاگتا پورا نظام ہدایت و اصلاح مردہ و معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کے بعد اول تو عوام کے لئے روزمرہ کے ضروریات دین یا اوامر و نواہی کے جاننے ہی کی کیا صورت رہی۔ کچھ تھوڑے بہت جانتے بھی ہوں تو جب گھر باہر پورے معاشرہ میں ان کے فعل و ترک پر کسی طرح سماجی عزت و ذلت، نیک نامی و بدنامی کا سوال نہ رہ گیا ہو تو پھر ان سے بے اعتنائی کے آخر کار ڈھٹائی تک پہنچ جانے کا سوال کوئی بڑا سادہ لوح فطرت بشری سے جاہل ہی اٹھا سکتا ہے۔

موجودہ مصلح علما و صلحاء | پرانے مولوی مشائخ تو بچا رہے اب پرانے ہو چکے۔ اگلے وقتوں کی فروگذاشت | کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔ لیکن ہمارے نئے (ماڈرن) علما و صلحاء ہی نہیں، ناچار اللہ پوری امت کی اصلاح و اصلاح کی پوری ملہیت و اخلاص

اور دل و جان کے ساتھ ہمت لے کر اٹھنے والے بھی خدا ہی جانتا ہے کہ اس سادہ لوحی میں کیسے بتلا ہیں کہ سارا زور یا ڈرن پر و پگنڈہ ہی کے رنگ والی دھواں دھواں تقریروں اور دفتر کے دفتر تحریروں ہی پر اس طرح صرف فرما رہے ہیں کہ نہ خطاب عام و خاص سے ایمان و عمل صالح کے مہمات کی دعوت و ترغیب نہ ان کے مفاسد کی اصلاح کا اہتمام۔ کلمہ توحید کی لفظی اصلاح و تصحیح کی ضرورت و اہمیت میں بھی کلام ہرگز نہیں۔

لیکن جب تک توحید اللہ کی معنوی حقیقت پر جس کی تفصیل اوپر  
توحید اللہ پر زور دینے کی ضرورت ہے  
ابتدا ہی میں عرض ہو چکی، مستقل و مسلسل زور پر زور نہ دیا جاتا رہے  
یہ شجر بے ثمر ہی رہے گا۔ اس کلمہ کا جوہری مطالبہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و  
اقرار ہے کہ اس کے سوا زمین و آسمان کی کسی مخلوق کے آگے نہ بندگی و عبادت کا سر  
جھکایا جائے گا نہ حاجت روائی و استعانت کا ہاتھ اٹھایا جائے گا۔ بس لے دے کر  
ایک اور صرف ایک ہی کے آگے جھکنا اور صرف اسی سے مانگنا ہے۔ جب تک عبادت  
و استعانت یا الہیت و الوہیت کا یہ انحصاری رشتہ بالکلیہ نہ سہی کم از کم کسی معتد درجہ  
تک "اکالہ اللہ" کا عہد و پیمانہ کر کے صرف اللہ ہی کے ساتھ وابستہ نہ ہو جائے اس وقت  
تک ہر نفع و ضرر، عطا و منع کے معاملہ میں ظاہری اسباب و تدابیر ہی پر آدمی جائز و ناجائز  
حلال و حرام کی تمیز کے بغیر بالکلیہ اعتماد و بھروسہ کرنے یا ان ہی کو تمام تر اللہ بنا لینے  
کے سوا آخر اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

ساتھ ہی "یقینِ آخرت" اس لالہ اللہ یا توحید الہ پر اعتماد و ایمان سے بھی کچھ بڑھ کر ہی کی تخلیق ضروری ہے | آخرت پر یقین و اذعان لازم ہے۔ انسان اپنی بالکل انسانی و فطری وعاقبت اندیشی یا مستقبل ہی کے کسی بڑے نفع و ضرر کی امید و بیم کی بنا ہی پر نقد یا حاضر کے چھوٹے نفع و ضرر سے قطع نظر کر سکتا ہے ورنہ پھر تو نقد کو ادھار پر چھوڑنا "کار خرد منداں" ہرگز نہیں، سر اسر حماقت ہی کا سودا ہوگا۔

لیکن کیا اور کس سے | کہ ہمارے نئے پرانے علماء و مصلحین سب ہی نے ایمانیات کے ان عرض کیا جائے۔ | ہی سب سے بڑے مطالبوں سے قطع نظر فرمایا ہے۔ علوم و فنون ادب و شاعری، تعلیم و تہذیب، سیاست و معیشت تمدن و ثقافت سب ہی پر اسلام و اسلامیت کے ٹپے لگا لگا کر زبان و قلم دونوں سے سیلاب و طوفان اٹھا رکھا ہے لیکن توحید الہ اور آخرت پر ایمان و ایقان جو پورے اسلام و اسلامیت کی جان ہے اس کی تعلیم و تبلیغ پر زور کے خورد بینی ذرات بھی اس سیلاب و طوفان میں ڈھونڈھنے ہی سے ہاتھ آتے ہیں! اگر الہ واحد اور یوم دین ہی کی دعوت و تلقین کو زبان و قلم دست و بازو سب کی دینی خدشات میں ان کی واجبی اولیت و اہمیت کا حق نہیں دیا جاتا تو پھر دین کے نام سے بھی علم و ادب، سیاست و معیشت، انسانیت و ثقافت کا ڈھنڈورا پیٹنا دراصل دنیا ہی کا بوزنہ وار پروپیگنڈہ ہے۔

غیبی ایمان میں شہادتِ یقین | لیکن ایمان بہر حال نام غیب ہی پر ایمان کا ہے۔ اس غیبی عمل صالح ہی سے پیدا ہوتا ہے | میں شہادتِ یقین کی طاقت عمل صالح کی شہادت ہی سے

پیدا ہوتی ہے جس قدر ایمانی تقاضوں یا توحید و آخرت کے ایمانی مطالبوں پر اصول و فروع جزئیات و کلیات سب میں اوامر و نواہی پر عمل زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور اوامر و نواہی پر عمل یا ان کے فعل و ترک کا اہتمام معاشرہ میں ان پر طاقتور اثر نہی ترغیب و ترہیب تعظیم و تمیزی پر موقوف ہوتا ہے خصوصاً جن اوامر و نواہی یا احکام کا تعلق غیبی و ایمانی نفع و ضرر سے ہو کیونکہ شہادتی یا دنیاوی نفع و ضرر تو اکثر آنکھوں کے سامنے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کا نقد و نقد ہی سودا ہوتا ہے۔ اس میں ہم چشموں یا معاشرہ کی نظر میں پسند و ناپسند، عزت و ذلت یا اس کی طرف سے روک ٹوک کی حاجت زیادہ نہیں ہوتی۔ بخلاف آخرت کے نفع و ضرر یا خدا کی رضا و ناراضی کے اوامر و نواہی کے کہ ان میں تو معاشرہ کی طرف سے امر و نہی روک ٹوک یا پسند و ناپسند عزت و ذلت کا رد عمل اتنا سخت و نمایاں ہونا چاہئے کہ افراد عدلانہ یا ڈھٹائی کے ساتھ اس سے قطع نظر نہ کر سکیں۔ چوری چھپے کوئی کچھ کر لے تو وہ اور بات ہے۔ اس کا اثر متعدی نہ ہوگا۔ بس یہی معروف و منکر پر امر و نہی کی اصل حقیقت و حکمت اور کتاب و سنت پر مبنی اس کے نظام کی ایمانی و عملی اہمیت ہے۔

انہی واپری مستقل غیبات و ایمانیات والے دینی نفع و ضرر کے معاملات کا ذکر ہی کیا، خود اس دنیا کے ایسے معاملات جو ذرا تِل اوٹ ہوں آدمی ان کے ساتھ پہاڑ اوٹ ہی کا معاملہ کرتا ہے۔ نہ دنیوی پولیس و عدالت یا قانون و حکومت کا ڈر کام دیتا ہے، نہ گرفت وافتا کا احتمال و اندیشہ۔ دنیا کی سیدھی راہ پر بھی دین یا خدا و آخرت یا پھر



سماج و معاشرہ کا خوف و خیال ہی چلا سکتا ہے عقل میں کسی طرح نہیں آتا کہ آج کل کے نام نہاد عقلا کی عقل اتنی گٹھل کیسے ہو گئی کہ اتنی موٹی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر خدا و آخرت سے ہماری بے عقلی کو بیزاری ہے تو کسی اور طرح معاشرہ ہی میں بھلائی برائی عزت و ذلت، رغبت و نفرت کا احساس اتنا جاندار و بیدار کر دو کہ افراد رائے عامہ کے دباؤ کو آسانی سے ٹھکرانہ سکیں کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ عقل ان کی اتنی کیا ماری گئی ہو گی، البتہ دین بیزاری یا بے معنی ناندہ بیت کے دعوئے افتخار ہی نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے ورنہ ان جدید عقلائے روزگار میں سے کسی کسی کی کبھی کبھی ذرا آنکھ کھل جاتی ہے تو روشنی کے اقرار پر مضطر ہو جاتا ہے!

لہ پرسوں ہی کے اخبار میں اسی اقرار کی شہادت کی تازہ تازہ مثال خود ہمارے بھارت دیس اور صوبہ (پٹی) کے کسی غیر ذمہ دار ہاشما کی نہیں وزیر پال صاحب کی زبانی سن لیں۔

اخبار کی تین کالمی جلی سرخی یہ ہے کہ ”رشوت خوری کا استیصال سماج کے موجودہ ڈھانچے میں آسان نہیں“ پولیس عدالت اور خود انسداد رشوت ستانی کے مستقل افسروں وغیرہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کیوں آسان نہیں؟ اور بے بسی کی نوبت یہاں تک ہے کہ

”جب میں خود اپنے قریب کے ساتھیوں کو جن کے ساتھ بچپن سے میں نے کام کیا ہے اور جن کی قربانیاں بھی ہیں اور خود اپنے خاندان والوں نیز اپنے شاساؤں کو دیکھتا ہوں اور اب ۵۳ سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں تو میں ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ رشوت خوری ختم ہو گئی“

اب ذرا کان لگا کر سکو لڑھم کی اس بے بسی کا اصل سبب آگے سنیں:

جو چیز بددیانتی اور رشوت خوری کو روکتی ہے وہ خوفِ خدا ہے، یا دوسری دنیا کا خیال لیکن آج سوسائٹی کا جو رنگ ہے اس میں خدا یا دوسری دنیا کا کوئی مقام نہیں رہا ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ)

اسلامی و قرآنی اصطلاح میں معروف نام ہی ہے خصوصیت کے ساتھ خدا کی خوشنودی اور آخرت کی بہبودی والی جانی پہچانی پسندیدہ نیکی یا عمل صالح کا اور منکر خدا کی ناراضی اور آخرت کی بریاری کے ایسے ناپسندیدہ و فاسد عمل کا جس کو معاشرہ میں اس درجہ مردود و اجنبی بنا دیا گیا ہو، کہ لوگوں میں عموماً اس کے جاننے پہچاننے ہی سے انکار

و بقید حاشیہ از صفحہ ۱۷۱ گذشتہ روزانہ اسکولوں کالجوں میں ہم خدا کے انکار کی

باتیں پڑھتے ہیں اور یہ سنتے ہیں کہ انسان بس ایک مٹی کا پتلا ہے۔

شاید سکولرز ہم کی لاج رکھنے کے لئے آگے ایک دوسری تدبیر ارشاد ہے کہ

”دوسری چیز برائی سے روکنے والی اگر کوئی ہے تو ایمان داری، ایمان داری کی خاطر اور

برائی سے بچنا برائی کی خاطر، سو ایسی تربیت ہمارے بچوں کو کہاں دی جاتی ہے

ایک لیکچر پال سے لیکر وزیر تک اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ کیا ایسی تربیت

اس کے گھرانے میں دی جاتی ہے، ہرگز نہیں۔“

گرٹ کھانے اور گلنگلوں سے پرہیز کرنے والی عامیانا ہندی مثل یاد آتی ہے، بے خدا و آخرت کے ایمان داری ایمان داری کی خاطر یا نیکی برائے نیکی کی بودی منطق کا عملی جواب اس ”بدی برائے بدی“ سے کیوں نہ دیا جائے جو آج ”آرٹ برائے آرٹ“ کی عربانیوں، ترقی پسند ادب و شاعری کی فحاشیوں، کلچر یا ثقافت کی سخافتوں، آزیباشی بیابہوں، بن بیابہ ماؤں، قانونی یا رضامندانہ زنا کاریوں اور گلی کوچوں میں پھینکے ہوئے، مرے ادھ مرے، زانی بچوں وغیرہ طرح طرح کی ترقیوں کی صورت میں ہر ترقی یافتہ و ترقی خواہ ملک میں دن دوئی رات چوگنی ترقی ہی ترقی پر ہے۔

اس کے علاوہ ”نیکی برائے نیکی“ کی شاعری یا فلسفہ ”برائے شعر گفتن“ یا آرام کرسی کی حد تک خوب

بہت خوب ہے لیکن حقائق و واقعات عملی دنیا میں اتنے شاعر و فلسفی کتنے بن جاسکتے ہیں جو مثلاً رشوت

ہی کے ٹھوس مادی منافع کو محض ”شعریت“ و فلسفہ کے پیچھے گنوا تے رہیں۔ ہاں ہمارے وزیر یا تدبیر نے

ایک تیسری تدبیر جو تجویز فرمائی وہ بلاشبہ سب سے زیادہ عملی اور کارگر تدبیر ہو سکتی ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

کیا جاتا ہو۔ یہ صورت نہ خالی انجمن بازیوں، جماعت سازیوں سے پیدا ہو سکتی ہے نہ بڑے بڑے جلسوں، کانفرنسوں کی صرف پنڈال کے اندر گونجنے والی خطیبانہ تقریروں سے

دبقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ”اور وہ ہے سوسائٹی کا ڈر کہ اگر ہم نے برائی کی تو سوسائٹی میں بدنام ہو جائیں گے لیکن جب سوسائٹی کا حال یہ ہے کہ جب بے ایمان کی بھی عزت کی جاتی ہے تو پھر کسی کو بے ایمانی کرنے میں سوسائٹی کا ڈر کیا ہو سکتا ہے۔“

بات بالکل پتہ کی ہے کہ آدمی عادی بے تکلف اور آسانی سے ایسی ہی چیز کو ترک و اختیار کر سکتا جس کی سوسائٹی میں روک اور چلن ہو یا جس پر نیک نامی و بدنامی پسند و ناپسند، عزت و ذلت کا سماج کی طرف سے علانیہ نمایاں طور پر اظہار ہوتا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر پتہ کا وزیر صاحب ہی کا اقرار ہے کہ ”جب حال یہ ہے تو حکومت کے بس میں کس طرح ہے کہ وہ سوسائٹی کا مزاج بدل دے جب خدادل میں نہیں، پڑوس میں دیوار حائل ہے اور پولیس تھانہ سات کو س، تو پچھا ہو کہ سات کو س پر پولیس رشوت سے روکے کیسے ممکن ہے۔“

باشاہ اللہ سکول حکومت کی نمک خواری کا حق وزیر صاحب نے ادا کیا ہو، نہ کیا ہو، لیکن حق کی تلخ گوئی اور صاف گوئی کا حق بال بال ادا فرمادیا کہ سوسائٹی کے اس مزاج کو بدلنا سکول حکومت کے بس کا روگ نہیں۔ اس کا علاج صرف خدائی حکومت ہی ہو سکتی ہے کہ کوسوں منزلوں باہر کی پولیس و عدالت کے ڈر کی جگہ دلوں کے اندر خدا و آخرت کا خوف و خیال پیدا و پائدار کیا جائے کہ اس خوف و خیال کی استواری نہ صرف سب سے زیادہ آدمی کو بجائے خود رکنے میں موثر ہو سکتی ہے بلکہ ہر شخص حسب تعلق اور اپنی بساط بھر دوسروں کو بھی روکے گا۔ باپ یا گھر کا سردار گھر والوں کو، بھائی بھائی کو، دوست دوست کو، پڑوسی پڑوسی کو، بلکہ راہ چلتا اجنبی اجنبی تک کو اس طرح روکے اور بچائے گا جس طرح کنویں تالاب میں گرنے والے کو بچانے پر مضطر ہو جاتا ہے۔ سماجی عزت و نیک نامی ان سے بچنے بچانے والوں ہی کا حصہ و حق ہوگی اور جس معاشرہ میں رشوت خوار موثر نشین کی رسوائی اور ایماندار خاک نشین کی پیشوائی ہوتی ہو اس میں ناممکن ہے کہ بے ایمانی و بددیانتی پھیل پھول سکے۔

لے قومی آواز ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء

نہ محض انشا پر داخانہ رسالوں، کتابوں وغیرہ کے دفتروں انباروں سے۔ اس کی ایک ہی تدبیر معروف و منکر کے امر و نہی کا کتاب و سنت پر مبنی وہی ہمہ گیر مفصلہ بالا نظام و انتظام ہے کہ اپنے پرانے جس کو جب جہاں کسی چھوٹے بڑے منکر میں مبتلا دیکھا جائے، اس کو بروقت و بر محل ہی بطور مناسب روک ٹوک تفہیم و تنبیہ کی جائے نیز منکرات پر اصرار کرنے والوں کو شادی و غمی، دوستی و قرابت، ملنے جلنے وغیرہ تمام سماجی تعلقات و مواقع میں محسوس کرایا جائے کہ سوسائٹی ایسے افراد کو ناپسندیدگی یا چشم پوشی کیا معنی علانیہ ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ایک طرف فواحش و منکرات میں مبتلا موٹروں و شو فرینگلہ و گملہ والوں کو معلوم ہو کہ بھائی بندوں یا سماج میں ان کو کوئی اچھی لڑکی ملنا دشوار ہوگا، دوسری طرف دال روٹی سے خوش پیرل چلنے والے دیندار و دیانت دار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لوگ اپنی لڑکیاں دیتے ہوں اور وہ لڑکیاں ایمانداری کی دال روٹی کو بے ایمانی کے پلاؤ زردہ سے زیادہ قبول کرنے والی ہوں۔ منکرات کے رد و انکار کا یہ معاملہ جس معاشرہ و ملت میں بھی تمام معاشرتی تعلقات و تقریبات میں ظاہر ہو، اس میں پولیس و عدالت سے تدریجاً بد معاشوں کو کیا خدا و آخرت سے بد اعتقادوں کو بھی کھلے بندوں اپنی بد معاشیوں اور بد اعتقادوں کے مظاہروں کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

ذکر اصل میں معروف و منکر ہی کے ذیل میں ایک بہت بڑے انفرادی سے بڑھ کر اجتماعی معروف و منکر یعنی ذات البین کے فساد اور اس کی اصلاح کا آگیا تھا۔ اس فساد کی بڑی جڑ دراصل ہمارے بہت سے دینی و اخلاقی معاصی و منکرات ہی ہیں۔ معروف و منکر کے

امروہی کی بدولت جو معاشرہ نفس و نفسانیت ضد و عدالت وغیرہ کے معاصی و منکرات سے جتنا پاک ہوگا، اولاً تو باہمی لڑائی جھگڑے اتنے ہی کم ہوں گے دوسرے جو ہوں گے بھی ایسے دیندار و دیانت دار معاشرہ کے فریقین میں شریعت و انسانیت کی راہ سے آسانی سے صلح و اصلاح ہو جائے گی۔ اور "مقدمہ بازی کی لعنت" تک نوبت کم ہی آئے گی۔ بس شرط وہی ہے کہ ایک طرف تو نفس و نفسانیت حرص و ہوس کی راہ سے ناجائز و ناحق باتوں پر لڑائی جھگڑا کرنے والوں کی دوستوں عزیزوں وغیرہ کسی کی طرف سے کسی طرح اعانت و ہمت افزائی قطعاً نہ ہو۔ دوسری طرف جو لوگ اپنی نزاعوں کا فیصلہ ہر طرح سمجھانے بچھانے کے باوجود شریعت و معقولیت کی راہ سے کرنے کرنے پر راضی نہ ہوں ان کے خلاف سماجی ناپسندیدگی و بیزاری کا اظہار ہی نہیں مظاہرہ بلکہ بضرورت مقاطعہ ہونا چاہئے۔ بلکہ جن لوگوں میں کچھ دینی ہمت و حمیت زیادہ ہے، جن کو فریقین پر کوئی جاہی و مالی یا اخلاقی اثر اور دباؤ حاصل ہے، ان کو تو اس سے کام لے کر ظلم و زیادتی والے فریق کو دبانے میں پورا پورا کام لینا چاہئے، یا جیسا خود حدیث ہی میں آتا ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہئے، یعنی قدرت ہو تو ظلم و زیادتی سے باز رہنے پر مجبور کر دینا چاہئے۔ اوپر کہیں پوری حدیث گزر چکی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ حضورؐ نے قسم کھا کر فرمایا کہ تم معروف کا امر اور منکر سے ہی ضرور بالضرور کرتے رہنا اور ظلم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے باز رکھ کر ضرور بالضرور اس کو حق و انصاف کی طرف پھیرتے یا اس پر مجبور کرتے رہو، ورنہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تم سب کے دلوں کو ظلم و زیادتی کے منکرات کے

معاشرے میں بے حس اور بھروسے کی طرح لعنت زدہ فرارے گا، جس طرح بنی اسرائیل کو فرما دیا،  
خدا کی پناہ کیا آج ہم اس ملعونیت کے درجے کو نہیں پہنچ گئے ہیں۔

بخلاف اس کے جس ملت و معاشرہ میں پوری سماجی و اخلاقی طاقت سے

منکرات و مظالم کا ہاتھ پکڑ لیا جاتا ہو اور اپنا پرہیزگاری کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ ہو، اس

میں کوئی ظلم و زیادتی اس نوبت تک جاہی مشکل سے سکتی ہے کہ کسی ظالم کو عدالت تک

جانے کی جرأت یا مظلوم کو ضرورت رہے۔ اگر کوئی بد بخت ایسی ہمت کرے بھی تو ایسے

معاشرہ میں گواہی شاہدی وغیرہ سے اس کی ہمت بڑھانے والے کا ملنا دشوار ہوگا۔ سماجی

کی پسند و ناپسند عزت و ذلت کی طاقت حکومت کی پولیس و عدالت سے کہیں زیادہ زبرد

ہوتی ہے۔ مسلمان معروف و منکر کے اسلامی نظام کو برپا کر کے اپنے اندر اس کی معاشرتی

یا سماجی طاقت پیدا کر لیں تو نہ صرف یہ طاقت ہی بہت کچھ اسلامی حکومت کا کام

دے گی بلکہ یہی طاقت صحیح اسلامی حکومت کے قیام و اقامت کی صحیح راہ ہوگی۔

ایسے منظم و مضبوط معاشرہ پر اس کی مرضی کے خلاف اپنی پرانی حکومت زیادہ دنوں

چل ہی نہیں سکتی۔ باقی گاڑی کو گھوڑے سے آگے جوتنے اور اسلامی حکومت کے بغیر

بھی مسلمان معاشرہ جتنا اسلامی بن سکتا ہے بنانے سے پہلے اسلامی حکومت کے دعوت

و دعوت کی گاڑی چلانے کی کوشش صرف فتنہ و فساد یا نا کامیوں اور خود کشیوں ہی کی

دعوت ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی۔ اتنے چھوٹے منہ سے اتنی بڑی بات نکالنا ہوگی تو

سخت جسارت و بلامت کی بات۔ تاہم عرض کئے بغیر رہا نہیں جاتا کہ کربلا سے لے کر

بالاکوٹ و شمالی، بلکہ تازہ تازہ مصر کی اتحوانی تحریک تک کے انجاموں کے دیگر اسباب کے ساتھ خود دینی فہم و نظر کے اعتبار سے یہ بہت بڑا سبب نظر انداز کیسے کر دیا جائے کہ ملک و معاشرہ بہ حیثیت مجموعی یا اس کی اکثریت اپنی انفرادی و اجتماعی استطاعت کے اندر بھی اسلامیت والے ایمان و عمل صالح کی طاقت ضعیف کیا عملاً ضایع کر چکی تھی۔ ان دعوتوں اور تحریکوں کی اٹھانے والی بعض عظیم شخصیتوں کی مجاہدانہ عظمت سے حاشا و کلا انکار نہیں، نہ مجتہدانہ خطاؤں سے کوئی غیر نبی معصوم ہے۔ سوال صرف اس پورے ملک و معاشرہ کی (نہ صرف جماعت دعوت کی) بہ حیثیت مجموعی ایمان و عمل صالح والی صلاحیت و صلاح کا ہے کیونکہ زمین پر خدائی حکومت چلا سکنے کی صلاحیت و اولیت والوں ہی سے استخلاف فی الارض یا حاکمانہ اقتدار کا وعدہ ہے۔

گذری ہوئی تاریخ تو تاریخ ہی ہو چکی خواہ بعید کی ہو یا قریب کی، اس میں زیادہ کاوش و نزاع بھی ایمان و عمل صالح کا صحیح مزاج و مذاق نہیں۔ یہ ہر طرح نالائق و ناکارہ، عاجز و دریا ندہ، اپنے گئے گزرے ٹوٹے پھوٹے ایمان کی بنا پر الحمد للہ ثم الحمد للہ اس کا بے شائبہ شک و ریب ایمان رکھتا ہے کہ اسلامی حکومت یا خلافت کے حصول و قیام کی بھی اسلامی راہ بالذات و براہ راست اس حکومت کی طلب و دعوت ہرگز نہیں بلکہ پہلے ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی معتد بہ درجہ کے اسلامی زندگی برپا کرنا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ ہی کے نزدیک اور اس کی حکمت و مصلحت ہوگی تو بلا سہارے مطالبہ حکومت کے وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ خدا سے وعدہ خلافی کا احتمال بھی ایمان

نہیں کفر کی شان ہے: "إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ"

بلکہ سچ پوچھتے تو یہ کچھ اسی قسم کی بے ادبی و بے تمیزی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام سے وعدہ کرتا ہے کہ تم میری فرمانبرداری و رضا جوئی کا حق ادا کرو گے تو میں تم کو فلاں عہدہ یا جاگیر سے نوازوں گا تاکہ اس کے حقوق و فرائض بھی تم میری راہ و رضا کے موافق ادا کر سکو۔ غلامانہ جاں نثاری کا فرض یہ ہو گا کہ وہ ہر خیال و خواہش کو ذہن و دماغ سے نکال کر تن من دھن سے اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں اس طرح لگ جائے کہ نہ دن کو دن جانے، نہ رات کو رات۔ نہ کہ اس کے بجائے براہ راست موعود عہدہ و جاگیر کی سعی و طلب، فکر اور دھن میں لگ جائے۔ ایسے موعود و مشروط انعام و اکرام کی واحد و صحیح فکر و تدبیر اس کے سوا کچھ نہیں کہ بے چون و چرا وفاداری کے ساتھ کسی چھوٹے سے چھوٹے حکم یا امر و نہی میں اس بادشاہ کی خوشی و خوشنودی حاصل کرنے میں اپنی والی کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ چہ جائیکہ ایسا بادشاہوں کا بادشاہ جس کے علم نامحسوس، کوئی چھپی سے چھپی چیز اس سے چھپی نہیں جو اس کا اندیشہ ہو کہ شاید وہ میری جانبازانہ اطاعت کو شیوں پر پوری طرح مطلع نہ ہو یا میرے دشمن و بدخواہ کچھ لگائی بچھائی میں کامیاب ہو جائیں۔ علم ہی کی طرح اس کی قدرت بھی نامحسوس و لہذا اس کا بھی وہم نہیں کیا جاسکتا کہ عین وعدہ پورا کرنے کے وقت کوئی ہاتھ پکڑے یا اور کسی وجہ سے وہ عاجز و مجبور ہو جائے یا خود اس سے بادشاہی چھین جائے یا مر ہی جائے، اس لئے کسی نہ کسی صورت سے جلد از جلد یاد دہانی کر لے کہ وعدہ پورا کر لینا چاہئے۔



جب اس طرح کے کسی احتمال کی گنجائش نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سرپا رحم و رحمت کرم و شفقت ہے۔ خصوصاً اپنے فرمانبرداروں اور اطاعت شعاروں کے حق میں، نیز ہماری اہلیت و صلاحیت ہمارے دینی و دنیوی نفع و ضرر اور ہر طرح کی مصلحت کو بھی وہ ہم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا ہے۔ اس کا وعدہ اٹل ہے۔ کسی بھول چوک کا دور دورا مکان نہیں، تو پھر نہ گھبراہٹ کی ضرورت نہ جلد بازی کی ضرورت صرف ایک ہی بات کے ہمہ تن اہتمام کی ہے کہ جب وہ ہم پر ہمارے اختیار و وسعت سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں ڈالتا تو بس ضعف و معذوری، محکومی و مجبوری کے جس ناموافق سے ناموافق حال میں بھی ہم ہوں اپنی وسعت و استطاعت بھر بندگی و طاعت میں کوتاہی و غفلت سے کام نہ لیں۔ بس اتنا ہی ایمان و عمل صالح کی زندگی کا آسان سیدھا سادھا مطالبہ ہے جس کے پورا کرنے پر اس کے اٹل وعدہ کی حکمت و مشیت بھی لازماً پوری ہو کر رہے گی۔

پھر قلم بظاہر موضوع سے بہک گیا۔ مگر بظاہر ہی۔ ورنہ مطلب وہی ہے کہ ایمان و اسلام کا اصل مطالبہ براہ راست حکومت طلبی کا نہیں بلکہ محکومی کی بدتر سے بدتر حالت میں اپنے اختیار بھرا ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرنا اور دوسروں پر چین پر جتنا اختیار ہاتھ زبان یا دل سے ہو اس کے موافق ان کو بھی امر و نہی کے ذریعہ اس زندگی پر چلانے میں کسی ڈھیل یا کمی و کوتاہی سے کام نہ لینا۔ کام کی ہمت و عزیمت رکھنے والوں سے اس ناکارہ کا سارا اصرار لے دے کر یہی ہے کہ وہ نام کی اسلامی یا غیر اسلامی جس بُری

بھلی حکومت میں بھی ہوں، اختیاری اعمال صالحہ یا اوامر و نواہی کے معاملہ میں انفرادی و اجتماعی عقلمندی اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی جدوجہد ہی ہر حال میں دین کی مقدم جدوجہد جانیں۔ اور اوامر و نواہی کے لئے جدوجہد امر و نہی کے کسی ہمہ گیر نظام و انتظام کے سوا سوچ ہی کیا جاسکتی ہے اور اس سوچنے کو ہمارے ناقص علم و فہم کے حوالہ کرنے کے بجائے جس نے اپنی رضا و نارضی کے اوامر و نواہی کی کامل کتاب ہدایت عطا فرمائی ہے اسی نے اسی کتاب ہدایت میں ساتھ ہی ساتھ ایسا کامل و ہمہ گیر نظام ہدایت بھی عطا فرمادیا ہے جس کے ذریعہ ہر کس و ناکس پڑھے اُن پڑھے کو ایک طرف امر و نہی کے ضروری احکام معلوم ہوتے رہ سکتے ہیں اور دوسری طرف ان پر عملی ترغیب و ترہیب ہوتی رہ سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس طرح صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کتاب کے تمام احکام ہدایت کی قوی و عملی تشریح فرمادی ہے، اس طرح معروف و منکر کے امر و نہی کے پورے نظام ہدایت کا قوی و عملی اسوہ چھوڑا ہے۔

باقی اس محرومی کا علاج ہی کیا کہ سب کچھ گھریں ہوتے ہم غیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور ان کے دروازوں پر درپوزہ گری کرتے پھر بلکہ ان کی بوزنہ صفت نقالی ہی کو اپنا سرمایہ فخر و ترقی جاننے لگیں! حالانکہ ان غریبوں کا خود حال یہ ہے کہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے کبھی کبھی آنکھ کھل جاتی ہے تو بتوں کی دعا، خدا کی یاد پر مضطرب رہتی ہے۔ ابھی اور ایک وزیر یا تدبیر کی تازہ تازہ فریادیں آپ وہی دو باتیں

تو سن چکے جس کی تفصیل و تفہیم راقم آثم کی اس ساری دراز نفسی کا خلاصہ ہے یعنی ایک طرف معاشرہ میں خدا و آخرت کا خوف و خیال پیدا کرنا، دوسری طرف جاہ و مال دولت و ثروت کے بجائے معاشرہ میں عزت و ذلت، برتری و کمتری، نیک نامی و بدنامی کا معیار، شکوکاری و بدکاری کو بنانا۔ جس سوسائٹی میں بھی بدی اور بدوں کو اپنی ذلت و حقارت قدم قدم پر اپنوں، پرالیوں سب میں محسوس کرنا پڑے، اس میں موٹر، شو فر، نوکر چاکر، کوٹھی بنگلہ سب کچھ رکھ کر بھی بدوں اور بدکاروں کو جیتا اجیرن ہی ہو کہ رہے گا۔ بنانے والے کی حکمت نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ بھینسوں اور ہم چشموں کی عزت بھری نگاہ کا مال و متاع سب سے کہیں زیادہ بھوکا ہے۔ بلکہ مال و متاع کی فراوانی بھی سچ پوچھتے تو زیادہ تر اس بھوک ہی کے لئے چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کی بدولت نام و نمود یا عزت و برتری حاصل کرے تو پھر وہ رشوت و خیانت وغیرہ ناجائز طریقوں سے ایسا روپیہ کیوں چاہنے لگا، جس کی بدولت موٹر و بنگلہ خریدنے سے کہیں زیادہ گھر باہر رسوائی و بدنامی خریدنا پڑے۔

ایک فساد ذات البین یا آپس کے لڑائی جھگڑوں ہی کو لے دیکھئے کہ ان میں سے کتنوں کی بنیاد کسی ایک یا دونوں فریقوں کی کچھ نہ کچھ ظلم و زیادتی، شریکداری اور خود غرضی ہی ہوتی ہے۔ اگر ان چیزوں سے کسی سماج میں پوری طرح سماجی نفرت و بیزاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہو اور ان کے مرتکب کو شادی و غمی وغیرہ کے تمام معاشرتی تعلقات و تقریبات میں اپنی کمتری و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہو تو فریاد اتنے ڈھیٹ یا بے حیا

کتے ہوں گے، جوان کا چوری چھپے نہیں، کھلے بندوں دن دوپہر کچھری دفتر ہر جگہ مسلسل ارتکاب کرتے رہیں۔ کوئی بجائے خود اتنی ڈھٹائی اور بے شرمی پر آمادہ بھی ہو جائے تو ایسے شر و فساد سے بیزار معاشرہ میں اس کا ساتھ اور شہہ دینے والے اور وکلا کے دفتروں سے لیکر کچھری کے کٹھروں تک جھوٹ اور فریب کا طوبار باندھنے والے کتنے بلیں گے جو اس شر و فساد اور ظلم و زیادتی کی رسی درازہ ہونے دیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ معروف و منکر کے اسلامی احکام اور ان کے امر و نہی کے اسلامی نظام کا، بلکہ معروف و منکر کی نفس اصطلاح و تعبیر ہی کا نشا و نہر عاتقاً تمام تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ معروف کو جاننے پہچاننے یا پسند کرنے کے سوا منکرات کو ان پر انکار و نیکر کے درویشی عملاً اتنا مکروہ و مبغوض بنا دیا جائے کہ معاشرہ میں ان کا جاننے پہچاننے یا پسند کرنے کا معنی نام لینے والا ہی ملنا دشوار ہو جائے۔ یہی حقیقت حب اللہ اور بغض فی اللہ کے حکم کی بھی ہے کہ لوگوں یا ان کے اعمال و افعال سے ہماری محبت و نفرت دوستی و دشمنی کا ہر تعلق صرف دور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و نارضائے پسند و ناپسند، فرمانبرداری و نافرمانی کی بنا پر ہو۔ اور میں کیا کہتا ہوں یہی تو انبیائی تعلیم و اسوہ ہے جو نبی کیا نبیوں کے باپ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کر کے دکھایا کہ باپ تک سے بغض و عداوت کا اعلان کر دیا۔ حتیٰ کہ بجز ان کے حق میں دعائے استغفار کے وہ بھی برتیا، وعدہ اور کوئی تعلق نہ رکھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس ابراہیمی عمل کو ہم مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ "اسوہ حسنہ" ٹھہرایا گیا کہ:-

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي  
 إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا  
 لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَاءُ وَمِنْكُمْ وَمِمَّا  
 تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا  
 بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ  
 الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا  
 حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدَّثَكُمْ  
 الْآيَاتُ الْكُبْرَىٰ إِبْرَاهِيمَ لَا إِلَهَ إِلَّا  
 اللَّهُ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا مَلَكَتْ  
 لَكَ يَدَايَ مِنْ شَيْءٍ

(۶۱)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے  
 عمل کا یہ بہت اچھا عملی نمونہ ہے کہ ان سب نے  
 اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو بھی تم  
 خدا کے سوا اپنا معبود بناتے ہو سب کے بیزاری کا  
 اعلان کرتے ہیں کہ جب تک تم خدائے واحد پر ایمان  
 (اور اسی کی بندگی و فرمانبرداری کے لوازم کو  
 قبول نہ کرو) تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ  
 کھلے کھلے بغض و عداوت ہی کا معاملہ رہے گا  
 البتہ ابراہیم کی زبان سے باپ کے حق میں اتنی  
 بات نکل گئی تھی کہ تمہارے لئے استغفار کی دعا  
 کروں گا پھر بھی محض زبانی دعا سے زیادہ کوئی اختیار  
 قطعاً خدا کے آگے نہیں رکھتا کہ مثلاً دعا قبول ہی  
 کرالوں یا عذاب سے تم کو بچالوں۔“

جب اعلانی و اعتقادی کفر موجب بیزاری اور باعث عداوت و بغض قرار دیا  
 گیا ہے تو کیا علانیہ عملی کفر یا کفرانہ زندگی کو کھلی چھوٹ اور آزادی دیدی جاسکتی ہے  
 بلکہ ایک اعتبار سے تو زبان سے اقرار و ایمان اور عملی انکار و طغیان زیادہ سخت و  
 اشد ہے کہ اس سے خود ہماری طرف سے علانیہ ایمان کے استخفاف و تحقیر کے علاوہ

غیروں اور کھیلے کافروں کی نظر میں اور بھی اسلام کی عزت و وقار کو ٹیٹھ لگتا ہے اور اس کی طرف کسی رغبت کے بجائے اُلٹے نفرت ہوتی ہے۔ اپنی تباہی و بربادی کے ساتھ دوسروں کی ہلاکت و خسران کی یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے، اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں خود ہم مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی ہو رہی ہے۔

اہم کام معروف و منکر کے امر و نہی | غرض دینی و دنیوی صلاحی و اصلاحی دعوتی و تبلیغی جس کے شعور کی بیداری ہے | پہلو سے بھی دیکھئے اہم و اقدم کام معروف و منکر کے امر و نہی

ہماری کے انفرادی و اجتماعی شعور و احساس کو زندہ و برپا کر کے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو از سر نو اسلامی زندگی اور مسلمان معاشرہ یا خیر امت بنانا ہے۔ اس کے بغیر خالی زبان کی درازی یا کاغذ کی ناو سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کسی کے بھی دین و دنیا کا بیڑا کسی طرح بھی پار نہیں لگ سکتا۔ زیادہ مقدم و موثر امر و نہی کا انفرادی شعور و احساس ہے یعنی وہی المؤمنون و المؤمنات بعضهم اولیاء بعض: ہر مرد و عورت اپنی نفس ایمانی و ولایت و ہمدردی یا نگرانی و ذمہ داری کا یہ فرض محسوس کرنے لگے کہ راہ چلتے بھی کسی کو کسی دینی و اخلاقی خامی و کوتاہی میں مبتلا پائے اس سے روکنے اور بچانے میں "ہاتھ زبان یاد دل" سے جو اور جتنی سعی و تدبیر کر سکتا یا اپنے محل و مقام کے لحاظ سے جس قسم کا کوئی مادی و اخلاقی اثر یا دباؤ ڈال سکتا ہو، اس سے کام لینے میں کوئی کمی نہ کرے۔

یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اندھے کی لالٹھی چلانے لگے۔ اچھڑا لگے کہ علمائے امت

حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے دین کے دوسرے اوامرو نواہی کی طرح خود امر و نہی کے احکام کلیات و جزئیات اصول و فروع، کتاب و سنت ہی کی روشنی میں مرتب فرمادیئے ہیں۔ ان ہی کو ہر بے بچھے ماحول کے چوکھٹے میں بے تکلف فٹ کیا اور وقت و موقع مناسب کام لیا جاسکتا ہے۔ بس کلی اصول اس باب میں وقت کے حکیم و مجدد حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمۃ کا سامنے رکھنا چاہئے کہ جسمی بیماریوں کی طرح دینی و اخلاقی بیماریاں بھی بیماریاں ہی ہیں اور جس طرح ہم کو جسم کے بیماریوں کے ساتھ تو ہمدردی و شفقت لیکن بیماریوں سے تکلیف و نفرت ہوتی ہے اور حسب تعلق و طاقت ہم ان کو دور کرنے کی دوا دوش میں کوئی کسر لگی نہیں رکھتے۔ نہ بیمار کو اس کے حال پر چھوڑ دینا گوارا کرتے ہیں۔ بعینہ ہی معاملہ معاصی و منکرات کے بیماریوں کے ساتھ نقلاً ہی نہیں عقلاً بھی کرنا چاہئے کہ جیسا اور جتنا ان سے تعلق ہو اور جتنی ان کے فلاح و پرہیزی کی ہم فکر و تدبیر کی طاقت رکھتے ہوں، اس میں کمی نہ ہو بلکہ جس طرح معمولی انسانیت کا تقاضا ہے کہ راستہ چلتے ہم کسی غیر سے غیر کو بھی کسی تکلیف و مرض میں پائیں تو جو کچھ بر محل اس کی مدد کر سکتے ہوں کریں۔ یہی تو مطلب و مطالبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معروف و منکر کے امر و نہی کو راستہ تک کے حقوق میں داخل فرمادینے کا ہے۔ کتنی بڑی رحمت و شفقت ہے۔

اور اس شفقت و خیر خواہی کے تقاضے ہی سے حسب ضرورت بیمار کو کڑوی سے کڑوی دوائیں بھی پلانا پڑتی ہیں، بد پرہیزیوں سے زبردستی روکنا پڑتا ہے۔ گھر میں علاج و

پر سبزی، دیکھ بھال کا حق خود اپنے سے نہ ادا ہو سکتا ہو تو اسپتال بھیجنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ ہو تو سخت سے سخت اپریشن کرانا پڑتے ہیں۔ اپنی وسعت بھر بلکہ قرض و دام کر کے دوا و علاج کے مصارف پورے کئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت تک ہوتا رہتا ہے جب تک مریض کے جانبر ہونے کی کچھ بھی آس رہتی ہے۔ بلکہ معالجوں کے جواب دینے کے بعد بھی ہماری محبت و شفقت جواب نہیں دیتی اور جب تک بیمار کی سانس چلتی ہے کچھ نہ کچھ دوا دے کر چلتی رہتی ہے۔ یہ سب کس زندگی یا اس کی آرام و راحت کو بچانے کے لئے، جس کی نسبت یقین کامل ہے کہ سو دو برس بھی چلتی رہے تب بھی ایک نہ ایک دن چل ہی بسے گی تو پھر ایمان والوں کو ایمان ہی سے سوچنا اور بتلانا چاہئے کہ کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کے بناؤ بگاڑ یا سو دو زبان، فلاح و خسران کی خاطر ہم کو خود اپنے اور اپنے اہل و عیال اعزہ و احباب کے لئے کیا کچھ نہ کرنا چاہئے اور جان و مال کی کونسی فکر و تدبیر اٹھا رکھنی چاہئے۔

ہماری پہلی جیلہ بازی | بعض بڑے بڑے علم و صلاح والوں اور اچھے اچھے دیندار دوستوں عزیزوں کو دیکھا کہ اولاد کو دینی تعلیم کی طرف شروع شروع میں جوش و خروش کے ساتھ لے چلے۔ ابتداً حفظ قرآن سے کرائی لیکن آدھا سو نہ دھا یاد کر کے ہی ہمت ہار دی کہ کیا کریں، نہیں چلتا چلا تا۔ اور پھر نہ جانے کس ذہنیت کے تحت بیہوشی و بددینی کی علمی و عملی راہوں پر اتنا آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا کہ عمل کیا ایمان تک کی خبر نہ رہی۔ ابھی چند دن پہلے ایک خاندانی مشہور بڑے صاحب علم و قلم بزرگ و



محترم دوست کے بھائی کا کچھ اس سلسلہ میں ایک تعزیت نامہ ملاحظہ ہو:

میرا خاندان چند پشت اوپر سے علما و فضلا و صوفیا کا تھا۔ علاقہ پر اس خاندان کے زہد و تقویٰ کا بڑا اثر تھا بڑی عزت تھی کہ میرے اور بھائی صاحب کے بعد آنے والی نسلوں نے اس خاندانی وراثت و وقار کو یک قلم لات ماری اور سب کے سب لارڈ کرزن ہیں، فرنگی صورت، فرنگی معاشرت۔ ہم لوگ خاموش دیکھ رہے ہیں اور دم بخود ہیں بلکہ علاقہ بھرم بخود ہے۔ مگر ہم نے نکر نہیں لی آزاد چھوڑ دیا۔ اس پالیسی سے کم از کم کوئی دماغی کوفت تو نہیں ہے۔ میاں روپیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں۔

بس ہر وقت میرا اور بھائی صاحب کا ہی رونا کاٹا ہے، یہ ایک عالمگیر وبا ہے

اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

برادر گرامی قدر سلمہ سے سوال صرف اتنا ہے کہ کیا اس طرح ہم اپنی اولاد کو کسی خطرناک و مہلک بیماری میں مبتلایا اس کو ہاتھ میں زہر کا پیالہ لئے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے آزاد چھوڑنا پسند کریں گے اور کیا ادنیٰ ایمانی ہمت و حمیت کے بھی یہ شایان شان ہے کہ "اپنی دماغی کوفت" کو بچانے کے لئے اولاد کو اگر اسلام کا سپاہی نہیں بنا سکتے تو اسلام دشمن کمپ میں جاتے رہنے کا دم بخود تماشہ دیکھنے کی پالیسی اختیار کر لیں۔ پھر یہ پالیسی بہتوں کی انفعالی حدود ہی تک نہ رہتی، بلکہ اس دین دشمن راہ کے ساتھ عملاً اس درجہ تعاون اور ہمت افزائی کا معاملہ ہوتا ہے کہ محض دنیا کے لالچ میں ان "فرنگی

صورت، فرنگی سیرت و فرنگی معاشرت والے "لارڈ کرزنوں ہی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی دامادی کا شرف بختا جاتا ہو۔ بلکہ اس "لارڈ کرزنی" میں مزید ترقی کرنے کو الے کے لئے ان بے غیرتوں بے شرموں کی طرف سے صرف جہیز میں موٹروں بنگلہ تک کی فرمائشیں نہیں ہوتیں، بہتر سے خود "لارڈ کرزن" کے گھر جا کر پورا پکا "ولایت آباد" بننے بنوانے تک کی شرط لگاتے ہیں۔ تعجب ان بے حمیت و غیرت فروش دنیا پرستوں پر نہیں کہ ان کا تو "کالج کے چکر" سے لے کر "صاحب کے دفتر" تک پوری زندگی کا کاروبار ہی دنیا ہی رہ جاتی ہے۔ تعجب پر تعجب ایسے دینداروں، نماز روزہ بلکہ تسبیح و تہجد والوں کی عجیب و غریب ذہنیت پر ہے کہ ان کی نظر میں بھی دینی و اخروی زندگی اور اس کا بناء بگاڑا تا کم وزن ہو چکا ہے کہ اس پر بھی دینی تعلیم و تربیت والوں کے بجائے فرنگی تعلیم و ترقی والوں ہی کو ڈھونڈتے اور مقدور بھران کے بے حیائی و زر طلبی کے یہ مطالبات پورے کرتے ہیں۔

دوسری عذر تراشی | دوسرا عذر وہی "عالمگیر و با" والا ہے کہ "اس کو کوئی روک نہیں سکتا" لیکر کیا طاعون ہیضہ وغیرہ کی جان لیوا وباؤں میں بھی یہی کہہ کر ہم تسلی حاصل کر لیتے ہیں اور کیا ان سے بچنے بچانے کی مقدور بھر کوئی کوشش اٹھا رکھتے ہیں؟ پھر کیا ایمان و باؤں سے بچنا بچانا ہزارہ درجہ زیادہ جان توڑ کوششوں کا متقاضی نہیں؟ جواب اپنے ہی گریبانوں میں سر ڈال کر دینا چاہئے کہ یہی نہیں کہ جان لیوا وباؤں کے مقابلہ میں ان ایمان لیوا وباؤں سے بچنے بچانے کی پاسنگ بھر بھی کوشش کرنے والے

ہم میں سے کتنے ہوتے ہیں اور اس کے بجائے اٹے دین دشمن و ایمان سوز آگ میں جان بوجھ کر جان و مال سب پر کھیل کر محض چند روزہ زندگی کے جاہی و مالی عہدہ و نوکری کی حرص و ہوس میں اپنی چہیتی سے چہیتی اکلوتی اولاد تک کو خوشی خوشی جھونک دینے والے کتنے ہوتے ہیں! مراد خصوصیت سے بطور مثال اسکول و کالج ہیں۔ اس روز روشن حقیقت سے کوئی اندھا ہی ہوگا کہ خدا بیزاری کے ان وہابی مرکزوں سے کوئی ازلی خوش قسمت و سعادتمند ہی "عمل صالح" تو الگ رہا "ایمان صحیح" بھی اپنا سلامت لے کر باہر آتا ہوگا! خود اس تعلیم جدید کے ایک بڑے مستثنیٰ فرزند سعید کی شہادت حرف

لے ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" میں بلاشبہ تاریخ اسلام کے اس سب سے بڑے فتنہ کی تفصیل اور اس کی طرف توجہ دلانے کا حق ادا کر دیا ہے (جزاہ عن الاسلام و امتہ) لیکن موصوف کا یہ خیال کہ اس فتنہ کو جدید علم و فلسفہ کے مقابلہ میں کھینچ تان کر صرف قرآن کا کوئی فلسفہ بنا کر روکا جاسکتا ہے، ان کی ناشائستہ ایسی فلسفہ ساز ذہانت و صلاحیت کا جوش ہی جوش ہی! ان سے بڑھ کر حیرت ہی حیرت ہمارے مولانا علی میاں سلیم کے اس جوش پر ہے کہ اس "نئے طوفان" کا زور تحریر و تقریر کے کلامیاتی طوفان یا تحقیقاتی و تشریحی مجالس سے توڑا جاسکتا ہے۔ اس طوفان کے اٹھانے میں اہل باطل ہم سے ہزاروں درجہ آگے ہیں اور رہیں گے۔ ہم ان سے کبھی بازی شلے جا سکیں گے۔ بے شک اس کاغذی یا الفاظی مقابلہ کا فرض بھی فرض کفایہ کے درجہ میں امت پر عائد ہے لیکن بجائے خود یہ کافی ہرگز نہیں۔ بقول حضرت دریا بادی "صاحبِ صدق" اگر الفاظ کے زور سے سب کو قائل کر دیا ممکن ہوتا تو امام رازی کے بعد دنیا میں کوئی لمحہ یاد ہر یہ باقی ہی کیوں رہ جاتا۔ (۲۹ جولائی سنہ ۶۰ء)

اس فتنہ کا تدبیری توڑ صرف گیلانی اقامت خانوں کی تجویز ہے مگر وہ ٹھوس عمل یا ورثہ باری کا کام ہی اس لئے اس کی داد تو خود ہمارے علی میاں سلیم کے علاوہ بھی ہندستان و لیکر پاکستان تک سب ہی نے دی لیکن عمل کیلئے کوئی قدم آگے نہ بڑھا۔ سب بڑھ کر خود اس ناکارہ ہی نے اس کی تفصیل کچھ مکتوبات گیلانی کے مقدمہ میں لکھی ہے۔

حرف ناقابل انکار ہے کہ "اس نوعیت کا فتنہ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں بھی کبھی رونما نہیں ہوا۔"

تیسرا بہانہ | ایک تیسرا بہانہ یہ ہے کہ دینی مدرسوں اور دارالعلوموں میں پڑھنے والوں یا عالم بن کر نکلنے والوں میں بھی سچے سچے پکے دیندار جب شاذ و نادر ہی اب نظر آتے ہیں تو دین کے ساتھ دنیا بھی کیوں کھوئی جائے؟ بہت بڑی حد تک یہ بالکل سچ ہے جس کی کچھ تفصیل و توجیہ اوپر کہیں گذر چکی۔ باایں ہمہ ان کی اکثریت نہ صرف ٹوٹے پھوٹے نماز روزہ کی پابند ہوتی ہے بلکہ ایسے ازلی بد بخت و شقی ان میں شاذ و نادر ہی ملیں گے جن کا ایمان ہی متزلزل یا سرے سے رخصت ہو چکا ہوگا۔ اور دولتِ ایمان کی قدر و قیمت پہچاننے والے جانتے ہیں کہ ایمان ضعیف و ضعیف اور بے عمل سے بے عمل بھی ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ قیمتی ہے۔

چوتھی شکایت | ان شیطانی وساوس کو شہ دینے والے حیلوں میں ایک یہ بھی ہے کہ بہتوں کو دیکھا کہ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت میں اپنی جان لڑادی مگر نتیجہ الٹا رہا۔ جواب ایسے سارے حیلوں بہانوں کا ایک ہی سوال ہے کہ کیا کسی ویساویاوبانی آپ وہو اسے بچنے بچانے کی فکر و اہتمام کو غیر ضروری و لایعنی ٹھہرانے کے لئے کوئی عقلمند بھی اس عذر کو عاقلانہ قرار دے گا کہ فلاں فلاں ہر طرح کی فکر و تدبیر دوا علاج کے باوجود اس وبا کا شکار ہی ہو گیا؟ اس طرح کی تمام ذہنی بی پرواہیوں اور کوتاہیوں کا بڑا بنیادی سبب یومِ دین یا آخرت کی زندگی کا عملاً مد نظر نہ رہنا ہے۔ خفی و اجمالی ایمانِ آخرت جس کو اوپر کہیں سلی بھی کہا گیا ہے

ایمان آخرت گزندی حالت میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو نصیب ہے لیکن دنیا کے معاملات میں آخرت کا سود و زیاں نفع و نقصان بد نظر اچھے اچھے دینداروں میں کم ہی نظر آتا ہے۔

ان جیلہ جوتیوں | غرض اگر جسم و جان کی دنیوی بیماریوں کی طرح روح و ایمان کی دینی  
کی وجہ! | بیماریاں بھی بیماریاں ہی ہیں اور دنیوی بیماریوں سے صرف دنیا کی فانی  
زندگی کو خطرہ ہے اور دینی بیماریاں دین و آخرت کی غیر فانی و ابدی زندگی کی ہلاکت  
تباہی کا سامان ہیں، تو یوم دین و آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو خود ہی سوچنا چاہئے  
کہ دنیوی سود و زیاں کے بالمقابل دینی فلاح و خسران کا معاملہ کتنی زیادہ جان توڑ کوشش  
کا مقضیٰ ہے۔ لیکن عام صورت حال کیا بالکل برعکس نہیں کہ دنیا کے لئے پیسہ پیسہ پر  
جان دی جاتی ہے اور دین پیسہ پیسہ پر فروخت کیا جاتا ہے!

بس گھر باہر اپنوں پر ایوں سب کے حق میں ہر چھوٹے بڑے معروف و منکر کے  
امر و نہی کی نوعیت و حیثیت بالکل وہی ہے جو کسی چھوٹی بڑی بیماری میں مبتلا بیمار کی دوا  
پر مہیر کے معاملہ میں حسب تعلق زیادہ سے زیادہ سعی و تدبیر کی۔ البتہ درجات میں دونوں  
کے اتنا زمین و آسمان کا فرق و تفاوت ہے کہ اگر ایک طرف خالص دنیوی سود و  
زیاں کے لحاظ سے ہفت اقلیم کی دولت و حکومت یا زندگی بھر کے فقر و فاقہ کا  
سوال ہو اور دوسری طرف ایک دن کیا، ایک گھڑی کے اخروی ثواب و عقاب کا، تو  
سرے سے آخرت کے منکر و کافر یا اس کے علم و شعور سے انتہائی جاہل و غافل مومن کے

سو اکون دانشمند آخرت کے چھوٹے سے چھوٹے نفع و ضرر کو دنیا کے بڑے سے بڑے نفع و ضرر کے مقابلہ میں نظر انداز کرنا گوارا کرے گا۔ یا آخرت کی چھوٹی سی چھوٹی اور دم بھری بیماری کو دنیا کی زندگی بھر کی صحت و تندرستی کے معاوضہ میں قبول کرے گا! ایسے سرپرستوں یا والدین سے بڑھ کر اولاد کا دشمن کون ہو گا جو جہنم نہیں، دنیا ہی کی کسی آگ کی طرف اٹھنے والے اس کے ہر چھوٹے بڑے تیز و سست قدم کو اگر سمجھا سمجھا کر روکنے پر قادر نہیں تو زبردستی روکنے کو عین محبت و شفقت ہمدردی و خیر خواہی نہ جانے گا۔ گو بالآخر ناہم و نادان اولاد کی خود کشانہ ضد و والدین کے معاہدانہ و خیر خواہانہ جبر پر غالب ہی آکر رہے۔

یہ جبر و زبردستی تو بدرجہ مجبوری اور بالکل آخری چارہ کار ہو گا۔ ورنہ جس ملک و معاشرہ میں صرف زبان و دل سے معروف و منکر کے امر و نہی کا حق ادا کیا جاتا ہو، یعنی ایک طرف ہر چھوٹے بڑے معروف کی اس کے درجہ کے مطابق زبانی تعلیم و ترغیب ہوتی ہو اور معروف کے اختیار کرنے سے معاشرہ میں سرخروئی و سربلندی حاصل ہوتی ہو اسی طرح دوسری طرف ہر چھوٹے بڑے منکر پر اس کی حیثیت کے مناسب روک ٹوک ہوتی ہو اور اس کے مرتکب کی رسوائی و بدنامی تو ایسی سوسائٹی میں منکرات کا علانیہ ارتکاب کسی بڑے پیمانے پر جڑ ہی کیسے پکڑ سکتا ہے۔

اعمال کا کیا ذکر جبکہ | لیکن بار بار کہے بغیر باہنیں جانا عقائد و اعمال کے دوسرے اصول و قریب توجید کے لالے پڑے ہیں | کلیات و جزئیات کا نام ہی کیا لیا جائے، توحید جو سارے ایمان کا اسلحہ کی جان و بنیاد اور اس کا سب سے بڑا امتیاز ہے اور جس کے دشمن انکار و الحاد ہی بڑھ

شُرک و شریکات کے عقائد و رسوم ہیں۔ ان شریکات میں غیر اللہ کی نذر و نیاز سے لے کر سجدہ رکوع اور طواف تک کا کونسا عبادت و استعانت کا مشرک نہ عقیدہ و عمل ہوگا جس میں ہمارے لاکھوں کروڑوں بھائی جاہل و عوام ہی نہیں، خاصے پڑھے لکھے خواص تک گرفتار نہیں۔ اور جن کا اعتقاد و عمل درگاہوں تعزبوں وغیرہ کے ساتھ بعینہ وہی نہیں جو پکے سے پکے مشرکوں کا اپنے دیوتاؤں کے ساتھ، دلیل بھی کم و بیش بعینہ وہی کہ هُوَ كَلَّا شَفَعَاءُ تَعِنْدَ اللّٰهِ اَوْ يُقَرَّبُوا۟ بِنَا۟ اِلٰى اللّٰهِ زُلْفًا۔ یعنی ہم اُن کو خدا نہیں کہتے مانتے، البتہ خدا کے پاس یہ ہماری سفارش اور اس کے تقرب کا وسیلہ ہیں۔

میں تو اپنے نادان مسلمان بھائیوں کے جب ان مشرکانہ تصورات و افعال کو دیکھتا ہوں، تو ان کو غیر مسلم مشرکوں سے ممتاز کرنے والی کوئی دل لگتی دلیل و تاویل ڈھونڈنے نہیں پاتا! اچھلا و عوام کو جانے دیں، کتنے علما و مشائخ ہیں جو کھلے کھلے شریکات کے نفس شرک ہونے تک پر متفق نہیں۔ بلکہ غضب پر غضب ہے کہ خود قرآن و حدیث سے اس مشرکانہ ضلالت کی تائید و تاویل گھڑ گھڑ کر یضیل بہ کثیراً و جمیداً یہ کثیراً کی شہادتیں فراہم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ شرک و شریکات کی نجاست و گندگی کے ساتھ نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت جمع ہو سکتی ہے اور نہ اس کی تائید و فضل کے بغیر مسلمانوں کی دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی صلاح و اصلاح کی کوئی سعی و تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔ دین و ایمان کا اس المال تو توحید ہی ہے۔ جب وہی سلامت نہیں تو دوسروں کے لئے جو لبطا ہر سود و فلاح ہے مسلمان کے حق میں وہ بھی سراسر زبان و

خسران ہی ثابت ہو کر رہے گا۔

جو حضرات علما و صلحا انفرادی یا جماعتی طور پر صحیح عقائد کے حامل اور اپنی ذات کی حد تک شرک و بدعیات سے مجتنب ہیں وہ بھی اپنی تقریروں، تحریروں، مجلسوں اور بلاقاتوں میں ان پرہی و نکیر اب شاذ و نادر ہی فرماتے ہیں۔ اور سیاسی لیڈروں کی طرح زیادہ تر آئے دن کے فروعی مسائل و جزئیات ہی میں اُکھچھے رہتے ہیں۔ امت کی ایمانی و عملی گونا گوں خامیوں، کوتاہیوں اور غفلتوں پر توجہ کرانے یا انفرادی و اجتماعی طور پر خطاب خاص و عام کے ذریعہ عقائد و اعمال کی اصلاح کی کسی منظم و مستقل سعی و تدبیر کے بجائے بس جدید رنگ کے جلسوں، کانفرنسوں یا میلادوں، جشنوں میں کچھ جدید ہی رنگ کی تقریروں، یا رسائل و اخبارات وغیرہ میں اسی رنگ کی تحریروں پر قناعت فرماتے ہیں جو بالکل ایسا ہوتا ہے جیسے کسی مریض کو دوا دینے کی جگہ اس کو صحت و مرض پر لکچر دیئے جائیں۔

خلاصہ یہ کہ ایمان و عمل صالح کے اصول و فروع، جزئیات و کلیات کسی کے معاملہ میں نہ اب ہمارے عوام میں معروف و منکر کے امر و نہی کی المومنون بعضهم اولیاء بعض والی ایمانی ولایت یا دوستی و نگرانی کا کوئی پتہ و نشان ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بلا کسی تعلق یا معمولی جان پہچان تک کے محض مسلمان ہونے کے رشتہ سے راستہ گلی تک میں جس چھوٹے بڑے منکر یا برائی میں مبتلا پائے روک ٹوک اور بچانے کی کوشش کرے۔ نہ قُوا انْفُسَکُمْ وَاہْلِیْکُمْ نَارًا کے سے تہدیدی حکم کے ہوتے والدین، سرپرستوں



یا کسی اور حیثیت سے راعی و نگران کی ذمہ داری رکھنے والوں کو اپنے زیر نگرانی اہل و عیال  
 افراد و جماعت کے معروف و منکر کے باب میں خود اپنے مواخذہ و مسئولیت کی کوئی خاص فکر  
 پرواہ۔ اور نہ "منکدامتہ" والی سب سے بڑھ کر ذمہ دار جماعت حضرات علما کو خیر کی طرف  
 بلانے معروف کا حکم کرنے اور منکر سے باز رکھنے کے اپنے فرض منصبی کا احساس و اہتمام  
 الا ماشاء اللہ۔

ایک ایسا ملک و معاشرہ فرض کرو جس میں نہ حکومت کی طرف سے حفظانِ  
 صحت یا بیماری کی روک تھام کا کوئی انتظام، نہ ماں باپ یا سرپرست اپنے بال  
 بچوں اور زیر سرپرستیوں کی چھوٹی بڑی بیماریوں میں دوا پر مہر کی خبر لیتے ہیں نہ عام لوگوں  
 میں اتنی ہمدردی و غمگساری کہ اپنے پرانے کسی کو بیمار دیکھ کر اس پر ترس کھاتے اور  
 مدد کرتے ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر اور طبیب جو زندگی بھر بیماری و تندرستی ہی  
 کے علم و فن کی تعلیم و مہارت حاصل کرتے رہے وہ بھی اپنا یہ فن و پیشہ چھوڑ کر دوسرے  
 مشاغل میں لگے ہیں۔ ایسے ملک و معاشرہ کا حال اس کے سوا کیا ہوگا کہ گھر گھر اور گلی  
 گلی چھوٹی بڑی ہر طرح کی بیماریاں پھیل گئی ہوں۔ ہماری دینی و ایمانی، اخلاقی و روحانی  
 بیماریوں کے معاملہ میں یہی فرضی مثال آج ساری دنیا کے مسلمانوں کا کم و بیش واقعی  
 حال بن کر رہ گئی ہے۔ نتیجہ وہی ہے کہ افراد اور جماعتیں ادارے اور انجمنیں سب ہی  
 قریب قریب چھوٹے بڑے ہر طرح کے منکرات کا شکار ہیں۔ جس طرح کوئی فرد خواہ  
 وہ چھوٹی سی چھوٹی بیماریوں میں سر سے پاؤں تک مبتلا ہو، انفرادی زندگی کے

فرائض و مشاغل کو صحتمندانہ طریقہ سے انجام نہیں دے سکتا، نہ ایسے افراد سے مرکب کوئی معاشرہ صحیح معنی میں زندگی کے اجتماعی ثمرات سے متمتع ہو سکتا ہے۔ ہوہو اسی طرح جب کہنا چاہئے کہ پوری امت مسلمہ اسلامی احکام — چھوٹے بڑے معروفات و منکرات اور امور و نواہی — کے لحاظ سے ظاہری و باطنی امراض کی پوٹ بن کر رہ گئی ہو تو آخر صحتمند اسلامی زندگی کے دینی و دنیوی انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی ثمرات و برکات کیسے اور کہاں سے ظاہر و مرتب ہو سکتے ہیں! مرض لے دے کر ایک ہی ہے — مسلمانوں کی نامسمانی — اور لازماً

## علاج بھی ایک ہی

یعنی وہی مسلمانوں کو مسلمان بنانا۔ بالفاظِ دیگر زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کی عملی زندگی کو زندہ یا اس کو از سر نو برپا کرنا۔ اس کی تدبیر بھی ایک ہی ہے دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عام و تمام نظام کا دوبارہ زندہ کرنا۔ سوال ہے کہ کون کرے؟ اس کا جواب بھی ایک ہی ہے۔ حضرات انبیاء و نبی الانبیاء علیہم السلام کا نہ تو سیاسی کوئی پروگرام تھا، نہ معاشی منصوبہ بندی۔ ان کا اصلی منصب اور سارا مشن لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا، معروف کا حکم کرنا اور منکر سے منع کرنا تھا۔ یہی اہم اقدام فریضہ اب تمام عالم میں علمائے اسلام کا ہے۔ یہ نہ صرف خاتم النبیین بلکہ تمام انبیاء و مرسلین کے جانشین اور تمام بندگانِ خدا کے لئے نہ صرف دعوتی کام پر یا مور اور اس کے اسین ہیں، بلکہ جس چیز کی دعوت دیں اس پر عمل کی حفاظت و نگرانی بھی ان

کی ذمہ داری ہے۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم العلماء امانة الرسل علی عباد اللہ من حیث یحفظون لما یدعون الیہ۔ اس امانت و حفاظت کا حق ادا کرنے کے دو ہی بنیادی طریقے ہیں:-

(۱) ایک تو دین کے تمام شعبوں ایمانیات و عبادات ہی نہیں معاملات اور اخلاق و معاشرت ظاہر و باطن قلب و قالب سب کے احکام کا علم حاصل کرنا اور تبلیغ ما انزل الیک کی وراثت کے مطابق دوسروں تک پہنچانا۔ اس تبلیغ ما انزل میں معروف و منکر کے امر و نہی کے حکم کی تبلیغ بھی داخل ہے کہ لوگ نہ صرف خود ایمان و عمل صالح کے مختلف اوامر و نواہی کو جانیں اور ان پر چلیں، بلکہ اپنے اپنے محل و مرتبہ کے لحاظ سے دوسروں کو بھی اوامر کا امر اور نواہی سے نہی، ساتھ ہی اپنی والی ان پر چلانے کی سعی کرتے رہیں۔ خود پیغمبروں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بَلِّغْ مَا اُنزِلَ اِلَيْكَ (جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا ہے دوسروں کو پہنچا دو) کے علاوہ دوسرا کام یہ بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کو اس ”ما انزل الیک“ پر چلانے کے لئے معروف کا امر اور منکر کی نہی بھی فرماتے ہیں۔ ”یا ہرہم بالمعروف وینہاہم عن المنکر۔“

(۲) دوسرے حضرات انبیاء کی دعوت و تبلیغ کی بڑی خاص خصوصیت یہ ہے کہ جس نیر کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے اور جن اوامر و نواہی کا امر و نہی فرماتے، ان پر عمل کا خود کمال و بے داغ نمونہ و مثال یا اسوہ ہوتے ہیں۔ علما کو بھی اس کا اہتمام زیادہ سے زیادہ

لازم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں وہ ایمان صلح کی دینی و اسلامی زندگی کا خود مقدور بھر  
 بہترین نمونہ ہوں۔ جس طرح رسول کی ذات اقدس ساری امت و انسانیت کے لئے  
 اسوۂ حسنہ تھی — لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — اس طرح آپ کے  
 ورثا اور حاشیوں کو بھی اپنے اپنے مقام اور حلقوں گھر باہر، مدرسہ و مسجد، خانقاہ و مجلس  
 ہی میں نہیں، ہر جگہ اور دین و دنیا کے ہر معاملہ میں نمونہ عمل ہوں۔ نیز دوسروں کے ساتھ  
 بلکہ ان سے مقدم خود اپنے اہل و عیال، اعزہ و اقربا کی صلاح و اصلاح کی فکر ہو کہ  
 اس کا بھی خاص طور پر خود رسول اللہ ہی کو حکم تھا۔ وَأَمْرٌ أَهْلًا بِالصَّلَاةِ —  
 وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔

(۳) ایک اور بہت زیادہ اہم انبیائی دعوت و تبلیغ کا امتیاز جس کو بار بار نام بتام  
 قرآن مجید میں دہرایا گیا ہے مخلوق سے کامل استغناء ہے یعنی حضرات انبیاء اپنی اصلاحی  
 و دینی خدایات پر دنیا والوں سے کسی قسم کے اجر و معاوضہ کے قطعاً طالب نہیں ہوتے،  
 ان کی نظر صرف خدا پر رہتی ہے — لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ  
 رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ دنیاوی اغراض کے لئے دنیا والوں پر نظر بھی اخلاقی و نفسیاتی ہر اعتباراً  
 سے قدرۃً للہیت کے اثر کو لوگوں کی نگاہ میں گھٹا اور گرا دیتی اور قبول حق کی راہ میں  
 بڑا حجاب بن جاتی ہے۔ یہ وصف اب الاشارة اللہ ہمارے اچھے خاصے کھاتے پیتے مشائخ  
 علمائے قریب قریب تا پید و نادر ہی ہے۔ عوام و خواص کوئی بھی ان کو جاہ و مال  
 کی حرص و ہوس میں اپنی سطح سے بہ مشکل اونچا پاتے ہیں۔ جن کی بدولت انکار و استہزا کا

خصوصاً دین دشمنوں کو بڑا حربہ ہاتھ آجاتا ہے۔

عین ان سطروں کے دوران تحریر میں ایک مشہور و خوش بیان پاکستانی واعظ و عالم پر ایسا ہی شدید و استہزائی طنز و طعن پڑھنے میں آیا۔ ماشاء اللہ معمولی خوش حال نہیں، اچھے مالدار ہیں۔ ایک سرکاری کمیشن کے رکن تھے۔ اپنے رفقاء کمیشن سے اختلاف پر طویل بیان شائع کیا ہے، جو بجائے خود خوب مدلل و معقول ہے لیکن چونکہ کمیشن کا الاؤنس قبول کرنے میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہتے تھے اس لئے یاروں کو دلائل کا وزن گھٹانے کے لئے اس طرح کے فقرے چست کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا کہ آپ ان اجتماعات میں شریک رہے اور مقررہ الاؤنس وصول کرتے رہے۔ . . . . نہ صرف ان تمام اجتماعات میں شریک ہوئے اور پورا الاؤنس وصول کرتے رہے، بلکہ کئی ماہ تک منہ میں گھونگھیاں ڈالے بیٹھے رہے، جبکہ دستار پھر کانے تک کی پھٹی کسی گئی ہے! کاش موصوف نے الاؤنس کو رد فرما دیا ہوتا تو نہ صرف مخالفوں کو ان کے دلائل کے رد کرنے کیلئے ایسے استحقاق کی گنجائش ملتی بلکہ ان دلائل کا اخلاقی وزن کتنا بڑھ جاتا۔

مگر کیا اور کس سے عرض کیا جائے کہ یہ ایک ہی مثال نہیں۔ بالعموم اب ہمارے اچھے اچھے علماء و صلحا سب ہی سرکاری و غیر سرکاری علمی و دینی کمیٹیوں، کمیشنوں، جلسوں، کانفرنسوں، میلادی جشنوں، ریڈیائی تقریروں وغیرہ کے الاؤنسوں اور فیسٹ کلاس کے سفر خرچوں وغیرہ کے وصول فرمانے میں پکے دنیا داروں سے ایک قدم پیچھے نہیں رہتے۔ تعسیف و تالیف کی خالص دینی خدمات

تک کو کتب فروشی کا مستقل کاروبار بنایا گیا ہے اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَلٰى اللّٰهِ کے لئے مشکل ہی سے کوئی کچھ چھوڑنا جانتا ہوگا۔

کہاں انبیائی وراثت والے علما کی شان و صفت یہ تھی کہ خدا و آخرت کے اجر و ثواب کے سوا دنیا کے مال و متاع پر وہ غلط انداز سے نظر بھی نہ ڈالتے، کہاں آج دنیا داروں کو اپنی اور ان کی دنیا داری و دنیا طلبی میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا غرض دعوت و اصلاح کے خالص انبیائی فرائض انجام دینے والے علما کا بالخصوص سب سے مقدم فریضہ خود اپنی ایمانی و اسلامی زندگی کو دوسروں کے لئے عمل و اتباع کا ممتاز و موثر نمونہ بنانا ہے۔ پھر دور و نزدیک کے عام مسلمانوں کو وعظ و تذکیر، تحریر و تقریر کے ذریعہ عام طور پر اور خاص زپرنگرانوں، عزیزوں، دوستوں، ملنے جلنے والوں کو موقع و محل کے مناسب خاص تفہیم و تہنیت سے تیر کی طرف بلانے، معروف کا امر اور منکر کی ہی کرتے رہنا، بس ہی انبیائی چانشینی کا حق ادا فرمانے والے علماء کی تمام تر زندگی ہے اور ہونی چاہئے۔ دل خوشی سے اچھل پڑا اور ان معروضات پر بڑا اطمینان ہوا کہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معروف و منکر ہی کے مباحث میں منکراتِ عامہ کے عنوان کے تحت اپنے عینی فرائض کے بعد علما کا مخصوص فریضہ یہی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے کہ

”شہر کی ہر مسجد و محلہ میں ایک فقیہ یا عالم کا ہونا واجب ہے، جو لوگوں کو ان کے دین

کی تعلیم دیتا رہے۔ اسی طرح ہر گاؤں میں بھی ایک عالم ہونا واجب ہے، اور جو عالم

بھی اپنے فرض عین سے فارغ اور فرض کفایہ کے لئے فرصت رکھتا ہو، اس پر واجب ہے کہ اپنے شہر کے آس پاس کی بستیوں میں جا جا کر لوگوں کو دین کی باتوں اور

شریعت کے فرائض کی تعلیم دیتا رہے۔“

علمایا فقہا کا تو یہی خصوصی و منصبی کام اور ذمہ داری ہے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ غیر علما اس ذمہ داری سے بالکل سبکدوش ہیں۔ حضرت امام ہی کا ارشاد ہے کہ ”جو شخص ایک مسئلہ بھی جانتا ہے وہ اس کا عالم ہے۔“ اور اس کے ذمہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ جانتا ہے دوسروں کو بتلائے ورنہ وہ بھی گناہ میں شریک سمجھا جائے گا۔ پھر آگے علما کو خاص طور سے متنبہ فرمایا ہے کہ ان سے اگر اس میں کوتاہی ہو

”تو بہت زیادہ گناہگار ہوں گے کیونکہ وہ اس کام کی زیادہ لیاقت و قدرت رکھتے

ہیں۔ باقی دوسرے کاروباری لوگ اگر اپنے اپنے کاموں کو چھوڑ کر اس میں لگ جائیں

تو معاشی ابتری پھیل جائے گی۔ جو انھوں نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے وہ مخلوق

کی معاشی درستی کے لئے ناگزیر ہے۔“

بخلاف عالم یا فقیہ کے کہ

”اس کی تو خاص شان اور خاص خدمت ہی یہ ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے اس کو پہنچا ہے دوسروں کو پہنچاتا رہے کہ یہی وہ کام ہے جس میں علما

انبیاء کے وارث ہیں۔ کسی کو اس عذر سے گھر میں بیٹھ رہنا اور مسجد میں نہ آنا جائز نہیں

کہ لوگ نماز ٹھیک نہیں پڑھتے بلکہ جب اس کا علم ہو تو ان کی تعلیم کیلئے نکلنا تو اور

واجب ہے، اسی طرح اگر معلوم ہو کہ بازار میں مثلاً کسی وقت یا ہمیشہ منکر کام ہوتا ہے

اور اس کے دور کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو جائز نہیں کہ گھر میں بیٹھا رہے؟

آگے علماء و عوام سب ہی مسلمانوں کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا اصلاح دین کی بعینہ وہی ترتیب تحریر فرمائی ہے جو راقم الحروف بار بار عرض کرتا آیا ہے کہ

”سب سے پہلے ہر مسلمان پر خود اپنی اصلاح لازم ہے کہ فرائض کی پابندی کرے

اور محرمات کو ترک پھر اپنے گھر والوں کو تعلیم کرے، پھر ٹپوس والوں کو پھر محلہ والوں

کو پھر شہر والوں کو پھر شہر کے قرب و جوار والوں کو پھر دیہاتیوں کو۔ اسی طرح دنیا

کے سرے تک۔ اگر قریب والے اصلاح و تبلیغ کی خدمت کو اس طرح انجام دیں گے

تو دور والے سبکدوش رہیں گے ورنہ قریب و دور والے جو بھی اس خدمت کی منتظر

رکھتے ہیں سب ہی گنہگار ہوں گے اور جب تک روئے زمین پر ایک انسان بھی کسی

ایک دینی فرض سے جاہل رہے گا اور عالم کو قدرت ہوگی کہ خود جا کر یا دوسروں کے

ذریعہ اس کو بتلائے تب تک وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہ قرار پائے گا۔ . . .

. . . اور اس کام سے بڑھ کر یا تو فرض عین ہے یا کوئی اور ایسا فرض کفایہ جو اس سے

بھی اہم و اقدم ہو۔“

البتہ اس زمانے میں ہر مسجد و محلہ، بستی و قریہ اور اس کے ہر گھر تک اسلام کے سارے احکام

کو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح پہنچانا اور معروف و منکر کے امر و نہی کے

۱۵ اجیاء العلوم جلد دوم ۲۶۸ مطبوعہ مصر۔



فرضاً ان پر عمل کی نگرانی اس وسعت کے ساتھ قائم کرنا کہ "کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ  
 چھوٹے، جو کسی ایک دینی فرض سے بھی جاہل و غافل رہے" بڑے وسیع  
 و مستحکم نظم و نظام کو چاہتا ہے مگر ہے ہر حال میں یہ کام ہر ملک و شہر اور آبادی کے علماء ہی کا  
 کہ وہ افسر شوریٰ بننے والے باہمی مشورہ سے کوئی ایسا وسعت پذیر نظام تجویز  
 فرمائیں جو خواہ شروع کسی ایک ہی مسجد و محلہ سے ہو لیکن تدریج و استحکام کے ساتھ  
 اس طرح پھیلتا جائے جس طرح کوئی صالح تخم صالح زمین میں پڑ کر بڑھتے بڑھتے پھولوں  
 پھاؤں سے لدا ہوا تناور درخت ہو جاتا ہے۔ اسی خیال کے مد نظر خود اس سر اپانا لایق  
 و ناکارہ نے تجرید تعلیم و تبلیغ نام کے ایک رسالہ میں مجدد وقت حضرت مرشد تھانوی  
 علیہ الرحمہ کے تبلیغی و اصلاحی ارشادات کی روشنی میں کچھ معروضات خصوصاً مساجد  
 نظام کے عنوان سے — پیش کر دیئے تھے شاید وہ بھی کچھ لائق اعتنا ہوں۔

ضرورت باتوں کی نہیں | لیکن عملی چیزوں میں خالی کاغذی ناؤ سے دین و دنیا کا کون سا بیڑا  
 عمل کی ہے! پار لگا ہے۔ باطل سے باطل تحریک کو بھی اگر کوئی عمل و ہمت کا  
 مرد لے کر کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے ملک کے ملک چل پڑتے ہیں۔ اس کی بہترین  
 مثال عقل و نقل سب کے خلاف خدا بیزار اشتراکیت کی تحریک ہے تو پھر حق تو حق  
 ہی ہے۔ البتہ انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ سن کر بہت کم اور دیکھ کر بہت  
 زیادہ قبول کرتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی کسی معتدبہ آبادی میں کسی معتدبہ درجہ تک بھی  
 ایمان و عمل صالح کی — محض عبادات نہیں معاملات اخلاق و معاشرت ظاہر

باطن — سب کی پوری اسلامی زندگی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی محسوس و مرنی ہو کر اپنوں پر ایوں سب کی آنکھوں کے سامنے ہو تو پھر انشاء اللہ اسلامی معاشرہ کا یہی تخم مدنی زندگی کا پرتو بن کر دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی ہر قسم کے برگ و بار پیدا کرنا شروع کر دے گا اور ملکی زندگی کے سارے مصائب و مشکلات کو دور کر کے رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غیبی تائید و نصرت ایسے معاشرہ و جماعت کے ساتھ قدم قدم پر ہوگی اور ایسی ہوگی کہ صلح حدیبیہ کی سی ظاہری کمزوریاں، نہ صرف مکہ کی فتح بلکہ ”اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ“ بن جائیں گی۔ نادانی میں بعض بڑے ایمان والے قلموں سے بھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سیاسی دوراندیشی کا شاہکار تھا، حالانکہ وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم و رضو عنہ کی رضا والی کھری اور پکی ایمان و عمل صلح والی زندگی پر بنی اٹل وعدہ کی فتح مبین تھی۔

سالہا سال سے اپنی کچھ ٹوٹی پھوٹی تحریروں میں یہ کس مہر س عرض کر رہا ہے کہ مسلمان جب تک ٹوٹا پھوٹا ایمان و اسلام اپنے گلے سے لگائے ہیں، ان سے خدا کا معاملہ دنیا میں بھی عقلاً و نقلاً نہ وہ ہوگا نہ ہونا چاہیے جو دوسری قوموں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ تمہیل کا معاملہ ہے، ہمارے ساتھ تنبیہ کا کہ اپنے نام کے اسلام کو کام کا بنانے کی چونک پیدا ہو۔ خدا و رسول کا دامن چھوڑ کر خالص سیاسی تدبیر و دوراندیشی کا ”شاہکار“ بھی ہمارے حق میں ہر اس تباہ کار ثابت ہو کر رہے گا ہماری ہزار تدبیروں کی تدبیر سب سے پہلے خدا سے اپنا معاملہ درست کرنا ہے۔

اور وہ درستی ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی حضرات صحابہ والی ایسی ہمہ جہتی محسوس و مرنی زندگی کے سوا کچھ نہیں جس کو دوست دشمن سب گھر باہر مسجد اور بازار ہر جگہ دیکھ سکیں۔ یہ لکھ ہی رہا ہوں کہ ماشاء اللہ ایک نوجوان مومن صالح — وہ بھی جدید تعلیم یافتہ — قلم کی چند سطریں صلح حدیبیہ ہی کے ذکر میں اتفاقاً سامنے آگئی ہیں، حرف حروف راقم عاجز کے دل و دماغ کی ترجمانی ہیں۔ اس صلح کی سب سے بڑی فتح یہی تھی کہ اس کی بدولت مکہ کے مشرکوں اور دینہ کے مسلمانوں میں کھلی آدورفت اور میل جول کے مواقع پیدا ہو گئے۔

”اس طرح ان (مشرکین) کو اسلام کو جاننے اور برتنے کا موقع ملا۔ روزمرہ کی زندگی میں مسلمانوں کی اخلاقی پاکیزگی اور برتری نے ان کے دلوں پر وہ اثر کیا جو برسوں کی جدوجہد نہ کر سکی۔ مسلمان بھی آزادی سے مکہ جانے لگے، وہ اگرچہ اپنی دعوت کے متعلق زبان سے کچھ نہ کہتے مگر ان کا عمل سیکڑوں تقریروں اور وعظوں کا (کیا ان سے ہزاروں درجہ بڑھ کر) کام کرتا اور دین کے منکروں کو دین کی طرف کھینچتا۔ اس سال جتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے“

بے شک امت کے کچھ افراد اور بعض جماعتیں یہ دعویٰ الی الخیر کافرینہ تو کچھ وعظ و تقریر، تحریر و تصنیف سے ادا فرما رہی ہیں وہ بھی خیر یا ایمان و عمل صالح کی ظاہری

لہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی سلمہ۔ الفرقان بابت ماہ نومبر ۱۹۵۶ء ص ۳۲

و باطنی زندگی کے پورے اواہر و نواہی کا نہیں۔ ایمانیات و عقائد میں شرک شریکات تک سے تعرض کم ہی کیا جاتا ہے۔ عبادات میں نماز و زکوٰۃ تک کی تصحیح و تاکید کا کما حقہ اہتمام نہیں ہوتا۔ باقی معاملات و اخلاق اور معاشرت جن سے اسلامی زندگی دن رات چشم دید حقیقت بن کر گھر باہر اپنوں پر ایوں سب کے سامنے آئی اور زبان حال سے ہر کھلی آنکھ کو خیر کی دعوت یا بھلائی کی ترغیب دیتی، وہ تو صدیوں سے عملاً اتنی ناپید ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان میں کسی فرق و امتیاز کی کوئی نشانی نہیں رہ گئی ہے۔ وجہ صرف وہی ہے کہ **يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ** کے ساتھ ہی عملاً خیر کو برپا کرنے کے لئے **يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** کا جو نظام خود کتاب و سنت نے عطا فرمایا ہے اس کی تعلیم و تبلیغ اب بالید یا مقدور بھرت و طاقت سے کیا باللسان یا زبان اور تقریر و تحریر تک سے بڑے بڑے مقررین و مصنفین میں بھی کوئی دیوانہ اللہ کا بندہ ہی اس بد مزگی کو خریدتا ہوگا۔

پھر اس کے بغیر اسلام کے اس مدنی یا مثالی معاشرہ کا مسلمانوں کی کسی چھوٹی بڑی آبادی میں پر تورو نما ہونے کا سوال و امکان ہی کیا رہ جاتا ہے جس کے عملی معلم کتاب و حکمت (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا سلام و اجازت کسی کے آجانے کی سی بظاہر چھوٹی سی چھوٹی معاشرتی چوک کو بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔ حکم ہوتا کہ واپس جاؤ اور پھر سلام و اجازت کے بعد آؤ۔ سوچنا چاہئے کہ ایسے معاشرہ میں جہات امور پر روک ٹوک یا معروف و منکر کے امر و نہی کا کیا اور کس درجہ اہتمام ہوگا۔

ایک مستحکم مثالی معاشرہ | ایک اور چیز بھی ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی کا کوئی چھوٹا بڑا  
 پیدا کر دکھانے کی ضرورت ہے | عملی و مثالی معاشرہ پیدا کرنے میں مانع ہے۔ تقریر و تحریر کی حد تک  
 دعوت خیر کی خدایات انجام دینے والے ایسے اہل علم و صلاح حضرات کی بحمد اللہ خاصی  
 تعداد پائی جاتی ہے جن کے نہ اخلاص میں کلام کیا جاسکتا ہے، نہ جدوجہد میں کوئی کمی و  
 کوتاہی پائی جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کی بھی نظر اسلامی زندگی کا کوئی ہمہ جہتی ٹھوس  
 اور مستحکم مثالی معاشرہ پیدا کرنے کی خدمت کی طرف نہیں جاتی۔ توجہ کہنا چاہئے کہ تمام تر  
 کیفیت سے زیادہ کمیت یا وسعت اور پھیلاؤ پر مبنی ہے۔ یہ انبیائی طریق و منہاج کے بجائے  
 غالباً آج کل کے فرنگی طرز کا غیر شعوری تاثر ہے جو پروگنڈے کے نام سے شر کے پھیلانے  
 میں کارگر حربہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ حدود و اعتدال کے ساتھ اس حربہ سے کام  
 لینے میں مضائقہ نہیں بلکہ ضرور لینا چاہئے۔ لیکن خدائی نصرت و تائید — جو دینی و  
 انبیائی طریق کار کا اصلی مدار ہے — اس کو متوجہ کرنے کا راز پروگنڈہ کی وسعت نہیں  
 بلکہ دنیا طلبی کے بجائے خدا کی رضا اور آخرت طلبی کی ٹھوس ہمہ گیر زندگی کی کیفیت والا  
 مدنی معاشرہ ہے جو زبان سے کچھ کہے بغیر سیکڑوں ہزاروں تقریروں اور تحریروں سے  
 زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ خالی زبان و قلم کا پروگنڈہ تو بس ڈھول کے اندر پول والے  
 اہل باطل ہی کو مبارک ہو۔

آج ہمارے سامنے دور و نزدیک ہندوستان و پاکستان کیا سارے اسلامی و  
 غیر اسلامی ملکوں کے مسلمان جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں — ایمان کے

دل و دماغ سے سوچا جائے۔ — تو کیا وہ اس کے سوا اور ایمانی و عملی فساد کا خمیازہ ہیں کہ مردم شماری کے رجسٹروں میں نام لکھانے والے نام کے مسلمانوں کے سوا کسی معتد بہ درجہ میں بھی اسلامی او امر و نواہی کے کام والا کوئی مرنی معاشرہ کسی ملک میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی آبادی کی بہت بڑی اکثریت — ۹۰،۸۰ فی صد سے کم نہیں۔ — ایک طرف علما خیر و معروف کے اسلامی احکام سے جاہل اور دوسری طرف عملاً کم و بیش ہر طرح کے معاصی و منکرات بدعات و شرکیات کا معاشرہ بن کر رہ گئی ہے۔ فسق و فجور لہو و لعب کی جن دوکانوں اور اڈوں کو دیکھئے مسلمان آبادیاں سب ہی کی رونق و آبادی میں اپنے عددی تناسب سے کہیں بڑھ چڑھ کر نمایاں اور نمائندہ ملتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو تعجب کی بات معاصی و منکرات میں مبتلا ہونے والوں کی کثرت نہیں بچنے والوں کی قلت ہے کہ اتنے بھی کیسے بچ نکلے! یہ کھلا ہوا نتیجہ ہے دعوت خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی ہمہ گیر اسلامی تعلیم سے مسلسل صدیوں کی غفلت کا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا | ہندوستان میں اس وقت اسلام یا مسلمانوں کے دین کے لئے سب سے سب سے بڑا مسئلہ | بڑا مسئلہ اور ان کی آئندہ نسلوں کے لئے خصوصاً سب سے بڑا خطرہ بچوں کی ابتدائی جبری تعلیم ہے۔ اس کی راہ سے بلا کسی خارجی جبر و اکراہ کے ایک آدھ نسل کے بعد ہی ہماری نسلوں میں رہے رہے نام کے اسلام کا نام باقی رہ جانا بھی (اعاذنا اللہ منہ) مشکل ہوگا۔ راقم حروف نے تقسیم کی بالکل ابتدا ہی میں جمعیتہ العلماء کے بعض اکابر سے یہ اندیشہ عرض کیا تھا۔ ہفتہ وار صدق میں ”مسلمانوں کی نئی مشکل کا پرانا حل“ کے عنوان سے عام توجہ بھی

دلالتی تھی کہ ہر لے ہوئے حالات میں سب سے مقدم اسی کی فکر ہے، گوزرا دیر سے مگر مستقل طور  
 جمعیت ہی کو اس خطرہ کی طرف توجیہ ہوئی تھی۔ اور اب یوپی کی حد تک زیادہ انتظام و استحکام  
 کے ساتھ تعلیمات دین کی تحریک کو تاہم جو تندرست نظر ہیں وہ استیصال مرض کی نہیں، بلکہ  
 مرض کے وقتی بحران کو دور کرنے کی۔ وقت کے بحران کو کسی نہ کسی نہج سے ٹالنا اہم و اقدام  
 بھی یقیناً ہے۔

خدا کرے بحران کا یہ خطرہ ٹل جانے کا کوئی سامان ہو جائے تو پھر استیصال مرض کا  
 مستقل علاج وہی ہے کہ جمعیت یا علما کی کوئی اور جماعت اپنے کو مستقلاً منکما امت کے  
 — دعوت خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی والے — اسی کام و نظام کے لئے  
 وقف کر دے جو علما کا اصلی و منصبی انبیائی فریضہ ہے۔ اگر اس فریضہ کا حق استحکام کے ساتھ  
 شہر شہر، قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ ادا ہوتا رہتا تو آج مسلمان گھرانوں میں بلا کتاب و مکتب کے  
 روایتی و موروثی طور ہی پر صحیح، دین عملاً اتنا راسخ و مضبوط ہوتا کہ کتابی و جبری تعلیم کے  
 ناموافق حالات ایک نسل میں کیا نسلہا نسل میں آسانی سے اس کو زیر پتہ کر پاتے۔ اور اس  
 نام نہاد لادینی جبری تعلیم کے توڑ کا جو عملاً دین شرک کی تعلیم ہے کسی گھبراہٹ کے بغیر  
 معقول و مستقل سدا واکر سکتے۔ باقی وقتی خطرہ کے لئے جو آج اس طرح کی تدبیریں سوچی  
 جا رہی ہیں کہ اگر حکومت کچھ نہ سنے اور اسلامی توحید کی عین ضد جبری شرک کی تعلیم کی  
 اصلاح نہ ہو تو خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کی تمام آبادیوں میں ہزاروں  
 لاکھوں ایسے مکتبوں کا جال بچھا دیا جائے جن میں سرکاری جبری مدرسوں کے علاوہ

بچے گھنٹہ دو گھنٹہ دینی تعلیم حاصل کیا کریں، ان میں کوئی مستقل و شکر کامیابی بجائے خود بھی مشتبہ ہی ہے۔ باقی ایمان و عمل کا جو ذہنی و نفسیاتی رسوخ گھر ملیا اور روایتی فضا سے پیدا ہوتا ہے وہ تو بہر حال نرے کتابی مکتبوں سے نہیں پیدا کیا جاسکتا۔

اور اسی وجہ سے مشتبہ ہے کہ مسلمان گھرانوں میں دین کے عملی و روایتی تعامل و توارث کے مٹ جانے سے دین کی قدر و قیمت عوام کے دلوں میں اتنی نہیں رہ گئی ہے کہ ان کے نجی مکتبوں کے وسیع پیمانے پر قیام و بقا کے لئے بقدر ضرورت سرمایہ جمع کیا جاسکے یا وہ اپنے بچوں کو منہسی خوشی ان میں پڑھنے پر مجبور کریں۔ عوام تو عوام آج ہمارے مسلمان خواص ہی ایسے کتنے ہیں جو دنیوی تعلیم کی دنیوی ترغیبوں کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ ساتھ ہی قدرت و وسعت رکھتے ہوئے ضمناً ہی یہی خود اپنے بچوں کے لئے کوئی فکر کرتے ہوں۔ فکر و تدبیر تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کی دل میں قدر و قیمت ہو۔ ایسی وقتی تحریکیں وقتی بحران کو تو کچھ ٹال سکتی ہیں لیکن مرض کا مستقل علاج نہیں۔

پاکستانی مسلمانوں کی پاکستان کی بھی ساری مصیبت یہی ہے کہ مسلمانوں کا دین کے علم و مقصد سے غفلت عمل سے توارثی و تعالیٰ یا روایتی تعلق زندہ نہیں رہا تھا۔ اب

جو ان کو آزادی ملی تو قدرۃ ہندوستان والوں ہی کی طرح زر طلبی و دنیا پرستی کی طرح طرح کی بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں اور فسق و فجور ہی کی راہوں میں اور زیادہ آزاد ہو کر کھل کھیلے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ دیکھ کر بھی حضرات علما کے اپنے اصل فرض مسلمان سازی سے زیادہ کیا کہنا چاہئے کہ تمام تر دستور سازی وغیرہ کے سے وقتی



مسائل ہی کی طرف منقطع ہے اس کا نتیجہ بھی صفر ہی نکلتا نظر آتا ہے۔ یہ وہی اصل مرض کے بجائے اشتداد مرض کے وقتی و ظاہری علامات پر سارا زور لگا دینے کی غلطی ہے۔ سوچنے کی بلکہ انتہائی شرم کی بات ہے کہ ایسی مسلمان حکومت جو اسلام کے فلک شکاف نعرے لگا کر قائم کی گئی ہو، اس میں خود مسلمانوں ہی سے اسلامی دستور بنانے کا مطالبہ کرنا پڑ رہا ہو، جس طرح بیرون (انگریزوں) سے آزادی کا پڑ رہا تھا۔ پھر اس مطالبے کے ماننے اور متوانے میں بھی ہر طرح کی دشواریاں اور رکاوٹیں خود مسلمانوں ہی کی طرف سے ڈالی جا رہی ہوں۔ کیسے غضب و عبرت کے مناظر ہیں یہ اب بات وہی ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کے سوا اپنے مسلمان ہونے کے تمام دوسرے ایمانی و عملی مطالبوں کو ہم بالکل بھول بھلا چکے ہیں۔ ہمارے ذہن میں تو اسلامی یا دینی حکومت کا مطلب بھی لے دے کر یہی رہ گیا تھا کہ بٹوارہ کر کے بلا شرکتِ غیرے حکومت آزادی کے دنیاوی مزے پوری طرح پوری آزادی سے لوٹنے کو ملیں گے۔

علمائے اسلام کا غرض ہندوستان ہو یا پاکستان، عرب ہو یا عجم جہاں کہیں کے مسلمانوں پر نظر فریضہ ڈالنے ایک ہی مرض کا شکار پائیں گے کہ تو لا اپنے کو مسلمان کہنے کے باوجود عملاً زندگی کے ہر شعبہ میں ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی فراموش ہو چکی ہو علاج خود فراموشی کی پیدا کی ہوئی ان ساری بیماریوں کا قدرۃً ایک ہی ہے، یاد دہانی یا تذکیر کے منصوص و یا مور طریقے۔ دعوت الی الخیر۔ کو ہمہ گیر بنانا اور معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعے معاشرہ میں اس کو از سر نو برپا کرنا۔ اور اس کام کا اساسی

خصوصی طور پر جب ایک خاص جماعت منکم امتہ والے علما ہی پر فرض عاید کیا گیا جیتک وہی جماعت عرب و عجم ہر جگہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے پوری طرح بیدار و کمر بستہ نہ ہوگی، اس وقت تک جڑیں بہر حال دن پر دن سوکھتی چلی جائیں گی اور خالی شاخوں پر پانی ڈال ڈال کر پھل لانے کی ساری کوششیں احمقانہ توقعات بنتی رہیں گی۔

جمعیتہ العلماء ہندوستان و پاکستان میں نظم و نظام کے ساتھ جو جماعتیں اپنے اپنے رنگ سے اپیل میں دینی نقطہ نظر سے کچھ اسلامی خدایات انجام دے رہی ہیں، تاریخی اولیت ان میں غالباً جمعیتہ العلماء کو حاصل ہے۔ یہ اجنبی حکومت وقت کے مقابلہ میں دینی نقطہ نظر سے کراہتدار سیاسی محاذ پر رونا تما ہونی تھی۔ تقسیم تک اس کا رخ کم و بیش تمام تر اسی محاذ پر رہا۔ نئے حالات میں بھی زیادہ تر حکومت کی راہ و تعلق سے کچھ وقتی غیر سیاسی دینی و دنیوی خدایات — مثلاً ابتدائی جبری تعلیم کا مسئلہ یا متروکہ جائیدادوں کے معاملہ — کی طرف متوجہ رہی۔ ہیں یقیناً یہ بھی سب مسلمانوں ہی کی خدایات خصوصاً جبری تعلیم کا مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر جو ایمان لیوا اثر ناگزیر ہے، اس کا کوئی توڑ نکالنا ایک اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں وقت کے سب سے شدید دینی خطرہ و فتنہ کا سدباب ہے۔ لیکن ہے بہر نوع یہ بھی وقتی ہی خدایات و ضرورت۔ بلکہ اس وقتی خطرہ و فتنہ سے اس خطرناک شدت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا ہی اس لئے کہ حضرات علما نے دعوت الی الخیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی اپنی مستقل منصبی خدایات سے قاصر رہے۔ علما کے ہر فرد اور ہر جماعت و جمعیت کا اصل فرض اپنے

اسی مستقل منصب کو ہاتھ میں لینا اور اس کا حق پورا کرنا ہے پھر انشاء اللہ وقتی مسائل و مشکلات  
 اولاً تو پیدا ہی کم ہوں گے اور جو ہوں گے ان کا حل آسان ہوگا اور امت "منکرامتہ"  
 والی جماعت کے اثر و نگرانی میں رہ کر دینی ہی نہیں یقیناً دنیوی یا سیاسی و معاشی فتنوں  
 فسادوں سے بھی محفوظ رہے گی یا آسانی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہو سکے گی۔ جب  
 مسلمانوں کی دنیا یا سیاست و معیشت سب کی سب بالکلیہ ان کے دین کے تابع ہے  
 تو تبوع کی درستی از خود تابع کی درستی کو مستلزم ہے اور کسی وقتی و عارضی نادرستی و فساد  
 کے ظہور کی صورت میں اس کی اصلاح بھی آسان ہی ہوگی۔

جماعت اسلامی | دوسری نسبتہ نو پیدا جماعت اسلامی ہے، یہ بھی اصلاً سیاسی میدان ہی کی  
 کی الٹی منطق | پیداوار ہے جو حکومت و سیاست کے غیر اسلامی نظامات و نظریات کے  
 مقابل الہی حکومت یا اسلامی سیاست کی برتری کی دعوت و دعویٰ لے کر اٹھی تھی۔  
 نقطہ نظر یہ تھا اور بڑی حد تک اب بھی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی صلاح و اصلاح  
 کے لئے مقدم سیاسی انقلاب ہے۔ بلا اسلامی حکومت کے نہ مسلمان مسلمان بن سکتے ہیں  
 نہ ان کے دینی و دنیوی مسائل و مشکلات حل ہو سکتے ہیں۔ یہ درحقیقت انبیائی تعلیم و تاریخ  
 کی پوری منطق کو الٹ کر نتائج کو مقدمات اور مقدمات کو نتائج بنا دیتا تھا۔ حضرات انبیا  
 اور انبیائی راہ پر چلنے والوں کا سب سے پہلا کام دعوتی جدوجہد سے ایمان و عمل صالح  
 کی زندگی یا معاشرہ پیدا کرنا ہے۔ باقی دینی یا الہی حکومت کا قیام و بقا خود خدا کی  
 طرف اور اس کی نصرت خاص سے موعود و مشروط نتیجہ یا انعام ہے۔ پہلے ایمان و

عمل صالح والامعاشرہ پیدا کر لینے کا۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ  
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۳۶) یعنی جو لوگ (کسی معتدبہ جماعت یا معاشرہ کی صورت  
میں) ایمان و عمل صالح کی زندگی کا ثبوت دیتے یا اس کا حق ادا کرتے ہیں ان کو زمین  
کی خلافت (اسلامی یا الہی حکومت) بھی ضرور اللہ تعالیٰ عطا کر کے رہے گا۔

اس کا ایک وقتی فائدہ اتاہم جماعت اسلامی کی الٹی منطق کا ایک وقتی فائدہ ضرور ہوا  
کہ جدید تعلیم کے افراد و طبقات جن کی ساری تعلیم و تربیت کا محور اسی دنیا کا جاہ و  
مال ہوتا ہے۔ اور حکومت دونوں کا منظر اتم ہے۔ ان میں بہتوں کا رخ  
دنیا کی اس راہ سے دین کی طرف پھر گیا۔ غلط راستہ پر کچھ اور چلنے کے بعد آدمی منزل  
کی سمت مڑ جائے تو صبح کا بھولا شام تک انشا اللہ ٹھکانے ضرور پہنچ جائے گا۔ بعد کو  
الحمد للہ اس جماعت کو بھی معلوم ہوتا ہے اپنی الٹی منطق کا کچھ احساس ہوا اور  
حکومت الہیہ کے بجائے اقامت دین کی تعبیر اختیار کر لی۔ خصوصاً ہندستان  
میں کام کرنے والی جماعت اسلامی تو اس تعبیر و تبدیل کا حق بھی ماشار اللہ خاصا ادا کر رہی  
اور اپنی منطق کو سیدھا کرتی جا رہی ہے۔ دونوں میں بڑی خامی ایک ہی ہے کہ ان کے  
اکابر و اصاغر سب کا دینی فہم و فکر زندہ اہل علم و عمل کی تعلیم و تربیت سے ماخوذ  
ہونے کے بجائے زیادہ تر صرف کتابوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لازماً غیر تربیت یافتہ ذہانت و  
ذہنیت اور تحریر و تقریر کے انشائی و خطابتی زور میں بارہا افراط و تفریط میں پڑ کر کہیں سے  
کہیں نکل جاتے ہیں۔ کسی تجربہ کار یا ہر طبیب کے مطب میں نسخہ نویسی کی مشق کے بغیر طب کی

خالی کتابیں پڑھ کر ان حضرات نے مطب کھول دیا اور علاج کرنے لگے۔ بس یہی ان کی ساری خامیوں کی جڑ ہے۔

اصل میں یہ کام بھی جدید سیاسی افکار و احوال اور ان کے عیب و ستر سے پوری طرح آگاہی حاصل فرما کر "علماء اسخین" ہی کا تھا۔ جب انہوں نے وقت کی اس ضرورت کا احساس اور اس کے لئے ضروری تیاری نہ فرمائی تو ضرورت تو ضرورت ہی ہے اپنے تقاضوں کو کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی چھوڑتی ہے۔ جو ان کو پورا کرنے کے لئے میدان میں آگیا لوگ اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اب جو حضرات علما ان کی بے راہ روی یا بے اعتدالیوں کی شکایت فرماتے ہیں، ان کو سوچنا چاہئے کہ میدان خالی چھوڑ دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور کیا اس کا تدارک محض کچھ تردیدی رسالوں یا تکفیری فتوؤں سے ممکن ہے؟

اسلام کی سیدھی صحیح راہ پر | سچ پوچھئے تو نبوت و اسلامیت کی سیدھی صحیح راہ و منطق بڑی چلنے والی جماعت "تبلیغی جماعت" ہے | حد تک اختیار کرنے والی نمایاں جماعت اس وقت "جماعت

الیاسی" یعنی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت ہے اس کو بعض جوان سال و جوان ہمت دین کے ایسے اہل علم مل گئے ہیں جن کا علم و فکر ایک طرف محض کتابی نہیں بلکہ خود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ و دیگر مستند "اسخین فی العلم" علمائے امت کی صحبت و تربیت سے ماخوذ ہے، دوسری طرف انہوں نے اپنے تن من و دھن سب کی بازی حکومت و سیاست سے قطع نظر فرما کر پہلے مسلمانوں کو مسلمان بنانے یا دعوت و اصلاح کی انبیائی خدمت پر لگا رکھی ہے۔ ساتھ ہی خود اپنے کو اصلاح و تربیت سے

اب بھی بے نیاز نہیں سمجھتے۔ اسی کی برکت ہے کہ باوصف ذہن و ذہانت انشا و خطابت اور جدید معلومات و رجحانات سے خاص مناسبت و واقفیت میں جماعت اسلامی سے کسی طرح پیچھے نہ ہونے کے امت میں انتشار پیدا کرنے والی خود رانی اور اجتہاد و تجدید سے اکھٹا لکھنا بالکل محفوظ ہیں۔

اس جماعت میں | راقم نالائق و ناکارہ کی نظر میں ایک ہی کمی — بہت بڑی کمی — ایک بڑی کمی تھی کہ ان حضرات کی توجہ کہنا چاہئے کہ تمام تر صرف ایمان و ایمانیات کے احیاء ان کے راسخ و صادق بنانے تک محدود تھی۔ علم و الصالحات میں صرف نماز پر زیادہ زور تھا حتیٰ کہ بہتوں نے اس کو صرف کلمہ و نماز کی تحریک سمجھ لیا ہے، باقی دین و شریعت کا وہ پورا حصہ جس سے خود اس دنیا کی پوری زندگی سرایا دین و اسلام بنتی ہے یعنی خالق کے ساتھ خود مخلوق یا بندوں کے باہمی تعلقات و حقوق — معاملات و اخلاق اور معاشرت — ان پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی حالانکہ ان کے بغیر خود ایمان و ایمانیات ناقص اور بے جان رہتے ہیں، ایمان و عمل دونوں ایک دوسرے پر عمل و رد عمل ہی سے زندگی و تازگی اور قوت و استقامت پاتے ہیں جس طرح اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے روح و روحانیت کی ترقی و تکمیل کو جسم و جسمانیات (یا اعمال جسم) کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، اسی طرح دین کی روح اپمان کی تکمیل نہ بغیر اعمال صالحہ کے ہو سکتی ہے اور نہ بلا عمل ایمان میں رسوخ و اخلاص ہی نصیب ہو سکتا ہے۔

بڑی آرزو تھی اور ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ایسی دیوانہ وار خدمت گزار

جماعت کے بڑوں کو اس بڑی کمی کی طرف متوجہ فرمادیں۔ مدت ہوئی ماہنامہ الفرقان میں نگاہِ اولیں کے زیر عنوان یہ پڑھ کر دل مسرت سے اچھل پڑا تھا کہ آخر ان حضرات نے خود ہی اپنے تجربات کی بنا پر اس کمی کو محسوس فرمایا اور دعوتی جدوجہد کے ساتھ عملی و اصلاحی تربیت کی فکر پڑ گئی۔ اور عمل سے مراد صرف تازہ وزہ کے خالی عبادتی اعمال نہ رہے، بلکہ دین و شریعت کے تمام شعبے عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق و معاملات اور معاشرت سب ہی مد نظر ہیں۔ عصری رجحانات کی خاطر سیاست و حکومت کا بھی نام لے لیا گیا ہے۔ جو نفس دین کا کوئی جوہری جز یا مطالبہ و مقصود نہیں بلکہ صحیح و کامل زندگی کا موعود نتیجہ۔ اور پھر اسی دینی زندگی کی حفاظت اور مزید ترقی کا ذریعہ یعنی ایمان و عمل صالح کے اسلامی زندگی کے نتیجہ و انعام کے طور پر ایک طرف خلافتِ ارضی کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ دوسری طرف اس وعدہ کے پورا ہونے پر اسی ایمان کی ترویج و تحفظ میں معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ اس حاکمانہ و سیاسی اقتدار و قوت سے کام لینے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

مَا قَالِ اللهُ: الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّا فِي

الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۲۲)

مطلب یہ کہ ہم حاکم ہوں یا محکوم بالذات و براہِ راست انفرادی و اجتماعی خصوصی و عمومی طور پر اسلام کا اہم و اقدم مطالبہ ہم سے مقدر و بھرہ طرح کی جانی و مالی قربانیوں اور شہداء و مصائب کے تحمل کے ساتھ ایمان و عمل صالح کی زندگی کو خود اختیار کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ہے۔ پھر اس کی زندگی ہی سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو اپنے وقت پر

دینی زندگی کا سامان رونما ہو کر استخلاف فی الارض یا عطاءے حکومت کا وعدہ بھی پورا ہو کر رہے گا۔ تب ہی یہ حکومت اس کے شہری عوام و خواص سب اپنے اپنے محل و موقع کے لحاظ سے اپنے اقتدار و اثر کو معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ ایمان و عمل صالح کی دینی و اسلامی زندگی کی ترقی و ترویج میں استعمال کریں گے۔

درمیان میں یہ جملہ معترضہ اس لئے ضروری تھا کہ اقامتِ دین یا دین کی دعوتی و اصلاحی خدشات میں مطالبہ حکومت کو شریک کر دینا۔ خصوصاً اس زمانہ میں حکومت و سیاست کی طلب و تحصیل کا جو مفہوم و مدعا ہو گیا ہے۔ دین کی دعوت کے ساتھ دراصل فتنہ و فساد کی دعوت کو شریک کر دینا ہے۔ انبیائی دعوت کے مزاج شناسوں کو تو بالخصوص جب تک کوئی معتدبہ آبادی یا ملک و قوم عملاً ایمانی زندگی کو اپنی زندگی نہ بنائے حکومت و سیاست کا نام بھی نہ لینا چاہئے۔ پاکستان جو ایمان و عمل صالح کی زندگی سے نہیں بلکہ غیروں کے لئے اور سکھائے ہوئے فساد فی الارض والے حکومتی و سیاسی نعروں اور مطالبوں سے غیروں ہی کے صدقہ میں بنا تھا وہ نام کا پاکستان ہو کر بھی جیسے ناپاک یا غیر صالح تخم سے پیدا ہوا ہے دین و دنیا دونوں کے حق میں ویسے ہی ناپاک ثمرات بھی پیدا کر رہا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر غیروں کے سیاسی مصالح و اغراض کا آلہ کار بن کر۔ اس نام کے "اسلامی پاکستان" کی بنیادی کمزوری یہی الٹی منطق ہے کہ ایمان و عمل صالح والی اسلامی زندگی کی اندرونی طاقت کے بجائے محض بیرونی نعرہ بازیوں کی پیداوار ہے اگر وہاں کے صحیح دینی علم و بصیرت رکھنے والے حضرات نے اب بھی اس حقیقت کو نہ سمجھا



یعنی حکومت و سیاست کے شر و فساد میں الجھ رہنے کی جگہ ایمان و عملِ صالح دونوں کی ہمدوش تبلیغی و اصلاحی جدوجہد سے مسلمان عوام یا شہریوں کو مسلمان بنانے کا کام دعوتِ خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کے اسلامی نظام کے ذریعہ ایسے وسیع و مستحکم پیمانے پر نہ شروع فرمایا کہ ہر مرحلہ و تشریح کا ہر سطر اس کے دائرہ میں آجائے، تو یہ نام کا پاکستان بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس دن اپنوں پر ایوں کے ناپاک اغراض و مقاصد کی پھینٹ چڑھ کر رہ جائے اے اللہ خیر حافظا و هو ارحم الراحمین۔

تبلیغی جماعت جیسی ہی جماعت سے کہاں کہاں سے کہاں نکل گئی اور بے موقع نہیں نکلی۔ غرض صحیح اسلامی حکومت پیدا ہوگی | تبلیغی جماعت کی نسبت کچھ ہو رہا تھا کہ اس یا اس جیسی

دوسری دعوتی و اصلاحی جماعتوں ہی سے صحیح اسلامی حکومت بھی پیدا اور پیدا ہو کر پائیدار رہ سکتی ہے خصوصاً عصر حاضر میں جبکہ عوام ہی عوام کے نام کا کلمہ کم و بیش ہر حکومت کا دین و ایمان بن گیا ہے تو خود حکومت اور اربابِ حکومت کو مسلمان بنانے اور بنائے رکھنے کا تدریسی کارگر راستہ بھی تو یہی ہے کہ سب سے زیادہ زور عوام کو مسلمان بنانے پر لگایا جائے تاکہ کچھ اور نہ سہی تو ان عوام کے دوٹوں ہی کی خاطر خواہں اپنے کو مسلمان بنانے پر مجبور ہوں۔

ہر اعتبار سے ہر کچھ کر مقدم کام عوام میں دینی دعوت اور ان کے ایمان و عملِ صالح کی اصلاحی تربیت ٹھہرتا ہے خصوصاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کتاب و سنت پر مبنی نظامِ ہدایت کا احیاء کہ عوام کی ہمہ گیر دینی تعلیم و تربیت کا مدار تمام تر

اسی پر ہے۔ البتہ دعوت و اصلاح کی یہ عمومی خدمت خصوصیت کے ساتھ خواص اہل علم و اصلاح کی ذمہ داری ہے۔ عوام کو زیادہ تر خود اپنی اور اپنے اہل و عیال یا زینگرانوں کی اصلاح یعنی ان کے ایمان و عمل صالح کے تمام احکام کی نگرانی و خبر گیری کے فرض کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ہر عامی کو داعی و مبلغ یا انبیاء کا وارث بنا دینے میں نہ صرف اس سے افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں اور بد عنوانیوں کا قوی اندیشہ ہے بلکہ نفسیاتی طور پر اپنے کو مصلح و مقتدا جان بیٹھنے کی ہلاکتوں میں مبتلا ہو جانے اور اپنی اور گھر والوں کے بجائے دور دور کے دوسروں کی اصلاح کو سارا دین سمجھنے لگنے کا بھی۔ یہ نرا قیاس نہیں اس کس میں تک کے تجربے میں ایسی مثالیں آتی رہتی ہیں۔

ثم الحمد لله کہ الفرقان ہی میں اور خود مولانا (محمد منظور) نعمانی سلمہ ہی کے "دین و شریعت" کے عنوان سے موعود تربیتی ہفتہ کی تقریروں کو پڑھ کر اس مایوس کو تو گویا کوئی بڑی کھوئی ہوئی دولت مل گئی۔ گو ۹۶ صفحات کی ان بے حدود لٹین تقریروں میں معاملات اخلاقی اور معاشرت کا حصہ صرف سات صفحے کا رہا۔ تاہم جن اعمال و اخلاق کا تعلق صبح اٹھنے سے لیکر رات کے سونے تک بیداری کی کم و بیش ساری سرگرمیوں سے رہتا ہو، ان کی طرف اس جماعت کے اکابر کی مستقل توجہ ہو جانا، انشاء اللہ مستقبل کے لئے بہت امید افزا ہے۔ بے کہے رہا نہیں جاتا کہ یہ پرکت تھانوی تجدیدات کی ہمہ گیری

لہ ان اللہ کہ یہ امید بھی امید ہی رہی! حتیٰ کہ ابھی ان اوراق پر نظر ثانی کے دوران میں نئی تعلیم کے ایک پرانے شریک جماعت اپنی اس سے کنارہ کشی کی وجہ ہی بتائی کہ اخلاق و اعمال کی اصلاح سے بڑی بے پرواہی ہے۔

ہی کی ہے، جس نے عقائد و عبادات کے ساتھ اخلاق و معاملات اور معاشرت سب کو  
 ”دین و شریعت“ میں ان کا پورا پورا حق و حصہ از سر نو دلا لیا۔ انسانی روح کو اس تا سوتی  
 زندگی میں بچھنے کا مقصد و نشانہ ہی سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ پوری زندگی کے ہر طرح  
 کے معاملات و مشاغل کو عبادت بنا کر اس کے کمالات عبادت کی تربیت و تکمیل فرمائی  
 جائے۔ ورنہ خالی تسبیح و تقدیس کی عبادت کے لئے فرشتوں کے علاوہ کسی دوسری مخلوق  
 کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور یہی راز ہے کہ خدمتِ خلق کی چھوٹی باتوں کا بھی  
 اجر نماز روزہ کی نفلی و استجابی عبادتوں سے کتنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

دعوتِ خیر کے ساتھ معروف و منکر پر ابھی ایک اور بڑی کسر کی طرف توجہ کرنے کی بڑی ضرورت  
 ہے یعنی یدعون الی الخیر میں تو ایمانیات و عبادات سے

امر و نہی بھی ضروری ہے؟

ترقی فرما کر معاملات و اخلاق اور معاشرت کی دعوتِ خیر کو شریک کرنے کا ارادہ فرمایا گیا  
 ہے لیکن ”یا مرون بالمعروف وینہون عن المنکر“ کا حکم بھی تو ”یدعون الی الخیر“  
 کے بالکل ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جاتا رہا کہ دعوتِ الی الخیر  
 کے ساتھ خیر پر عمل اور اس کی عملی نگرانی معاشرہ میں معروف و منکر کے امر و نہی کے  
 پورے قرآنی نظام کو از سر نو برپا کرنے بغیر ناممکن ہے۔ دین کی اہمیت کی بھی کوئی دعوت  
 اس وقت تک پھل پھول نہیں سکتی جب تک معاشرہ میں عملاً اس کو عزت و وقعت اور  
 اس کی مخالفت کو ذلت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے کسی سو سائٹی یا سماج میں  
 وہی باتیں جڑ بکرتی اور پروان چڑھتی ہیں جن کے کرنے پر پسندیدگی اور نہ کرنے پر ناپسندیدگی کا

اظہار زبان و عمل دونوں سے کیا جاتا ہو۔ یہی عام سماجی پسند و ناپسند پیدا کرنا حقیقت ہے  
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی۔

بعض لوگ اس تحریک کو محض کلمہ و نماز کی جانتے ہیں مگر جہاں تک محروف و  
منکر کے امر و نہی کا تعلق ہے نماز کے ترک یا اس کے منکرات تک پر کوئی روک ٹوک  
دیکھنے سننے میں مشکل سے آئے گی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مسجدوں کے جو منکرات  
گنائے ہیں اور جن پر روک ٹوک کو واجب ٹھہرایا ہے، ان میں بعض بعض تو ہمارے زمانے  
میں اس درجہ عام ہیں کہ سیکڑوں میں شاید دو چار ہی کو ان کی پرواہ کیا علم بھی ہو مثلاً گتے  
ہیں جو نماز میں کلام مجید صحیح پڑھتے ہوں۔ امام صاحب نے لکھا ہے کہ نماز میں قرآن  
غلط پڑھنے والوں کو نہ صرف ٹوکنا بلکہ ان کی تصحیح یا صحیح پڑھنے کی تعلیم بھی واجب ہے  
اسی طرح کتنوں کو دیکھو گے کہ سکون و اطمینان یا تعدیل ارکان کے ساتھ نماز ادا نہیں  
کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ اچھے اچھے علماء کو دیکھو گے کہ دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں اتنا  
بھی کہتے کسی کو نہیں سنا کہ بھائی مسجد آئے وضو کیا اتنا وقت دیا پھر دو چار منٹ کی  
جلد بازی سے کیوں کی گرائی محنت اکارت کر لیتے ہو۔ حالانکہ بحر خفیہ کے جیسا کہ امام  
صاحب نے لکھا ہے دوسرے تمام ائمہ کے نزدیک ایسی نماز صریح حدیث کی رو سے ستر  
سے ہوتی ہی نہیں۔ اس طرح نماز اکارت کرنے والوں کو دیکھ کر جو لوگ خاموش رہتے ہیں  
وہ بھی شریک گناہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ

”اگر کوئی شخص مسجد میں متکلف ہو اور اس طرح کے منکرات کی روک ٹوک میں اس کو

اتنا معروف رہنا پڑے کہ خود اپنی نفل نمازوں اور ذکر وغیرہ تک کا موقع نہ ملے تو بھی ان منکرات پر روک ٹوک بھی میں لگا رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ روک ٹوک ایسی عبادت ہے جس کا نفع دوسروں کو پہنچتا ہے اور واجب ہے بخلاف نفل و ذکر کے کہ اس کا نفع خاص اپنی ذات تک محدود ہے۔“

حدیہ کہ واقعی و واجب ضرورت سے زیادہ معاشی فکر و تدبیر پر بھی معروف و منکر کا امر و نہی مقدم و واجب ہے۔ اور واجب ضرورت و حاجت کی حد خود امام صاحب نے یہ لکھی ہے کہ کسی کے پاس اگر ایک دن کھانے کا انتظام بھی نہ ہو تو البتہ وہ معاش کی فکر و تدبیر میں منکر پر روک ٹوک سے معذور سمجھا جائے گا۔ کہاں ”دین و شریعت“ کے مزاج شناس اور امام غزالی جیسے امت کے مسلم مجدد و مصلح کی نگاہ اور فہم ”دین و شریعت“ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی یہ اہمیت و اقدیمیت اور کہاں ہمارے عوام کیا خواص علما بلکہ ان حضرات تک کی اس معاملہ میں غفلت و مسامحت جنہوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں دعوت و اصلاح کی خدمت میں لگا دینے کی سعادت حاصل فرما رکھی ہے۔ مگر چونکہ بظاہر زیادہ کیا سارا زور و دراز تبلیغی سفروں، دوروں اور گشتوں پر نظر آتا ہے، اس لئے لازماً خود اس خدمت میں عملی حصہ لینے والوں پر بھی یہی پہلو غالب رہتا ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس غلو کی خرابی پر خود ان پر اس خدمت کے اساطین کی نظر پڑ گئی ہے کہ

”یہ پہلو ہماری اس دعوت میں اتنا غالب ہے کہ بعض اوقات لوگوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد اور اس جماعت کا کام بس جدوجہد اور دوڑ

وصوب ہے۔ اس کے سوا کوئی متعین مقصد یا اصلاحی و تربیتی کام ان لوگوں کے سامنے

نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو اصل کام کے لئے صرف ذریعہ ہے۔ ورنہ اصل مقصد

اور اصل کام تو حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی (وہی تمام اعمال صالحہ والی) کا

پیدا کرنا اور عام کرنا ہے یعنی مومن کے لئے جن حقیقتوں پر یقین ضروری ہے، ان کا

یقین مسلمانوں میں عام ہو اور مومن کی جیسی (تمام اعمال زندگی کے اعتبار سے)

علمی و اخلاقی و دعوتی زندگی ہونی چاہئے، وہی مسلمانوں کی عمومی زندگی ہو۔

ماشاء اللہ، جزاک اللہ، بارک اللہ! بس زیادہ دوڑدھوپ پر زور لگانے کے بجائے یہی

عمومی زندگی مسلمانوں کی کسی محدب آبادی یا معاشرہ میں پیدا کرنا، وہ ٹھوس کام ہو گا کہ

اس کے بعد ہر فرد کی چلتی پھرتی "علمی و اخلاقی" زندگی خود ہی ٹھوس اور مجسم "دعوتی

زندگی" ہوگی اور اس کا پیدا ہونا معروف و منکر کے امر و نہی کے پورے عمومی و خصوصی

قرآنی نظام و انتظام کے بغیر عملاً ناممکنات سے ہے۔

ایک اور گننام | یادش بخیر! ایک اور نسبت گم نام جماعت کیا فرد فرید کے مد نظر دونوں پہلو

اصلاحی جماعت | نظر آئے۔ مراد ہر دوئی (یوپی) کے اشرف المدارس والے حضرت مولانا

ابراہیم سلمہ ہیں۔ ماشاء اللہ اپنی ذات ہی سے ایک چھوٹا موٹا مدرسہ بھی ہیں، جس میں عمل

اور عملی نگرانی پر علم سے کم نہیں زیادہ ہی زور ہے۔ طلباء ہی نہیں اساتذہ وغیرہ دیگر متعلقین مدرسہ کے

لے زیرِ خط راقم آتم نے جن الفاظ کو کر دیا ہے وہ حرف حرف خود اس کے دل کی آواز اور آرزو ہے جو خود

سرایانا کارہ ہونے کی بدولت دل ہی دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔

معاملہ میں بھی اس کا پورا اہتمام رہتا ہے کہ ان کی صورت و سیرت عملی و اخلاقی زندگی دینی مدرسہ کے شایانِ شان ہو۔ عام دینی مدرسوں میں ایک بڑا دینی روگ ہے کہ مجلس شوریٰ و انتظامیہ وغیرہ کے ارکان و اعضاء کا معنی خود اساتذہ اور خاص مدرسہ کے متعلقین بلکہ ان تک کی عملی و اخلاقی حالت کی پرواہ کم ہی کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک نامی گرامی دارالعلوم کے متعلق یہ معلوم ہو کر انگشت بدندان رہ گیا کہ ایک معلم صاحب کہنا چاہتے تھے کہ رشوت و خیانت کی بھی تعلیم اپنے شاگردوں کو باقاعدہ دیتے ہیں۔ حیرت بالائے حیرت کہ اس کی خبر بھی اہل اہتمام و اختیار کو پوری طرح اور مدتوں سے ہے باقی معمولی دینی و اخلاقی کمزوریوں کا سبق تو خود اپنے نمونوں سے ہمارے دینی مدارس و تنظیمیں، ارکان و اعیان کم بیش سب ہی دیتے رہتے ہیں۔ اشرف المدارس میں ایسے مدرسین وغیرہ کی قطعاً کوئی جگہ نہیں جو خود صورت و سیرت صالح یا کم از کم اپنی اصلاح کے لئے پوری طرح تیار نہ ہوں۔

مدرسہ ہی کی طرح مولانا سلمہ کہنا چاہتے تھے کہ اپنی ذات ہی سے دعوت الحق نام کی ایک سرپا دعوتی و اصلاحی تحریک بھی ہیں۔ اس کی بھی خاص خصوصیت یہی ہے کہ نفس و عیونِ حیر کی حد تک ایمان و عمل صالح کے تمام شعبوں کی طرف بلایا اور متوجہ کیا جاتا ہے۔ معروف و منکر کے امر و نہی کو پورے قرآنی و اسلامی مذکورہ صدر نظم و

اسے یہ کام بڑے خلوص و لہیت کے ساتھ حضرت حکیم الامت کے ایک قدیم فیض یافتہ پختہ سن پختہ مزاج اور شائستہ مذاق بزرگ حضرت میرا نام الدین صاحب حیدرآبادی بھی اپنی عمر کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

نظام کی طرف ذہن کو التفات نہیں۔ تاہم خطاب خاص و عام دونوں سے اس کا حق بھی بہت کچھ ادا ہوتا رہتا ہے۔

اس جماعت کی ایک خاص غفلت | البتہ ایمان و عمل صالح کی پوری اسلامی زندگی کا کوئی نمونہ کا معاشرہ پیدا کرنے کے صبر آزما کام کی طرف دعوت الحق کی تحریک کو بھی کوئی توجہ نہیں۔

اس کے خدمتگزاروں میں | توسیع و تعمیم کے حق میں بھی اس دعوت میں سب سے بڑی کمی یہ ہے ایک بڑی کمی | کہ اس کے خدمت گزار عصری اسلحے سے عملاً بالکل غیر مسلح ہیں،

نہ عصری علوم و معلومات نہ عصری رنگ کی انشا و خطابت نہ کتابیں نہ رسائل اخبارات غرض عصری پروپگنڈے کے جائز و ضروری سامان بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لازماً وسعت و کمیت یا پھیلاؤ کے لحاظ سے تحریک کی رفتار بہت دھیمی ہے لیکن اسی نسبت سے کیفیت کا رنگ خاصا گہرا بھی ہے یعنی اس دعوت سے جو دراز زیادہ قریب و مانوس ہوتا ہے نماز روزہ

دقیقہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) آخری دس پندرہ سال انجام دیتے رہے (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً) اور ان کے حدود تبلیغ و ارشاد ریاست حیدرآباد سے گذر کر ایک طرف ضلع شولا پور (بہائی) دوسری طرف بھوڑا (صوبہ مدراس) اور تیسری طرف بنگلور تک پھیل گئے تھے۔ حضرت موصوف کے کام میں "جویش" امر وہی سے زیادہ "جذبہ شفقت" کا قربانتھا۔ (ض۔م)

۱۰ (حاشیہ صفحہ ہذا) بلکہ اس سے بھی مقدم چیز کی طرف سے غفلت ہے یعنی یہ کہ خود حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے خلفائے کرام میں تنظیم و اتحاد اور مرکزیت کے ساتھ اس نظام کو برپا کرنے کی کوشش! اکاش اس سلسلہ میں خانوادہ چشتیہ کے آفتاب ہدایت حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی قدس سرہ کی تبلیغی مساعی پر غائر نظر ڈال کر اپنی رہبری کا سامان فراہم کیا جائے۔ (ض۔م)



علاوہ اس کے معاملات و اخلاق اور معاشرت میں بھی خاصی اسلامیت نمایاں ہوتی ہے۔ باطن و سیرت کا انقلاب قدرۃ ظاہر و صورت پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ یوں بھی دعوتِ خیر کے ساتھ معروف و منکر کے امر و نہی کے امتزاج و اہتمام سے مسلمان صدیوں سے اتنے اجنبی ہو چکے ہیں کہ دونوں کی جامع دعوت میں طول و عرض کی زیادہ وسعت پیدا ہونا بہت دیر طلب اور بڑی جدوجہد کا طالب ہوگا۔

دونوں جماعتوں میں | احقر کے علم و نظر میں بس یہی دو جماعتیں ہیں جو سیاست و حکومت  
اتحاد کی ضرورت | سے یک قلم قطع نظر کر کے دعوت و تبلیغ کے خاص و خالص انبیائی ورتہ کے کام کو مخلصانہ طور پر خالص دینی نقطہ نظر سے انجام دے رہی ہیں۔ اسی لئے بڑی تمنا رہی کہ کچھ نہیں تو ان دونوں ہی میں اگر پورا پورا تعاون نہیں تو کم از کم اتنا تباعد بھی نہ رہتا جو ایک دوسرے سے "خدا صفا" کے اخذ و استفادہ میں حاجب ہو چندے یہ صورت رہی بھی۔ اور یہ ناکارہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا رہا کہ دونوں ایک ہو کر دعوت و اصلاح کے معیاری نمونے کو انشاء اللہ امت کے سامنے کر ہی دیں گی۔ مزاج و مذاق کا کچھ نہ کچھ اختلاف و تفاوت ہر دو آدمیوں میں بالکل قدرتی امر ہے۔ یہ بھی بالکل ضروری نہیں کہ بڑے بڑے مخلص افراد یا جماعتیں بھی ایک کام کو ایک ہی رنگ و طرز سے انجام دیں۔ یا سب کی سب کسی ایک نظم و تنظیم کے تابع ہو جائیں۔ گو اسلام کا مطالبہ ایک ایسی وسیع تنظیم ہی کا ہے۔ تاہم دین کے مخلص خادموں میں اتنی بیگانگی تو کسی طرح روا نہیں کہ ایک دوسرے سے مخلصانہ اخذ و

استفادہ کے مواقع تک میسر نہ ہوں۔ ایسا بعد وسیگانگی بجائے خود ہی قطعاً غیر اسلامی اور  
 اسلامیت کی روح کے سراسر متافی ہے۔ اپنے مرضِ دخلِ در معقولات سے مضطر ہو کر  
 دونوں سے ایک آدھ بار عرض بھی کیا۔ مگر کس مہرس کی کون سنتا ہے اس لئے ”داشتہ آید بکار“  
 کے مقولہ پر عمل کر کے ”نوشتہ آید بکار“ ہی سے اپنی بھڑاس کچھ نکال رہا ہوں کہ شاید  
 کبھی کسی کی نظر قائل کی تالائقیوں سے قطع نظر کر کے قول پر پڑ جائے۔ ورنہ اپنی توساری  
 ناپکار زندگی کا خلاصہ ہی پس ”یک کاش بود کہ صد جا نوشته ایم“

علماء اپنی ذمہ داری کو سمجھ لیں احاصل معروضات اور بار بار عرض کرنے کی بات یہی ہے کہ  
 امت کی ہریگری کو بنانے کی تدبیر فقط ایک ہی ہے کہ منکم افتوا لے علمائے  
 امت جو اس امت کے راعی و نگہبان پارکھوالے قرار دیئے گئے ہیں، وہ اپنی  
 رکھوالی کی دونوں ذمہ داریوں کا حق ساتھ ساتھ اسی طرح ادا کریں جس طرح خود  
 قرآن ہی میں وہ ساتھ ساتھ ان پر عائد فرمائی گئی ہیں۔ (۱) یعنی خیر کی طرف لوگوں کو بلانا  
 جس سے مراد ظاہر ہے کہ کامل خیر یا ”دین کامل“ کی ایمان و عمل صالح والی زندگی  
 کے ہر شعبہ — عقائد و عبادات، معاملات و اخلاق اور معاشرت — کے احکام  
 کی دعوت ہے۔ (۲) اور ساتھ ہی ساتھ معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ ان احکام کی  
 عملی ترویج و نگرانی۔ ان ہی دونوں کی ہم آہنگی دعوت اور اصلاح دین کی وہ بنیاد  
 ہے کہ جتنی زیادہ یہ استوار و مستحکم ہوگی اتنے ہی زیادہ مسلمان اپنے ایمان و عمل میں راسخ  
 و ختم ہوں گے۔ اس طرح ایک طرف نہ قادیانی و پرویزی وغیرہ گھر کے بھڑیلوں کے لئے

ان مستحکم و راسخ ایمان و عمل والوں کو شکار کرنا آسان ہوگا اور نہ ایسے پختہ ایمان و عمل والے مسلمان والدین کی گود اور گھر میں پرورش پائی ہوئی اولاد کو غیر اسلامی — نام بہاد سکولر — جبری تعلیم کے ذریعہ اسلام سے اس طرح اور اس آسانی سے گمراہ و دور کرنا آسان ہوگا جس طرح آج اسکول میں جاتے ہی وہاں کارنگ چڑھ جاتا ہے تاہم تاہم امکان ابتدائی تعلیم میں ان کو خالص سرکاری اسکولوں سے بچانا بھی ضروری ہے ان کی عملی حیثیت جاگتی اسلامی زندگی خود باہر والوں یا غیر مسلموں کے لئے کانوں سنی تقریری و تحریری تبلیغ سے کہیں زیادہ کارگر یہ آنکھوں دیکھی دعوت و تبلیغ ہوگی۔ زبان آوری کی باتیں دلوں میں اترنے سے زیادہ ہوا میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

احتیاط کے ساتھ عصری | البتہ اب جس نئے عہد و عصر میں "دعوت الی الخیر" اور امر بالمعروف مطالبات کا حق ادا کریں | وہی عن المنکر کے قرآنی و اسلامی نظم و نظام کو از سر نو اٹھانا اور کھڑا کرنا ہے اس کے نئے تقاضوں اور عصری مطالبوں کا اس حزم و احتیاط کے ساتھ مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ تجدید کے مطالبات کا حق بھی ادا ہو اور تجدید کی بے راہ رویوں سے حفاظت بھی ہو۔ ان ہی دونوں باتوں کے پیش نظر تجدید تعلیم و تبلیغ میں مجدد وقت کا ہاتھ پکڑ کر کچھ تجاویز عرض کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ اس "گودک نادان" کی ان میں بھی بعض باتیں قابل توجہ ہوں گی۔

نظام دعوت و تبلیغ | ہمارے ائمہ دین نے کتاب و سنت اور اپنے علم و فراست تقویٰ و مدون ہو جانا چاہئے | طہارت کی روشنی میں جس طرح دینی تعلیمات کے ہر شعبہ کے کلیات و

تربیات کو مستنبط و مرتب فرمادیا ہے، اسی طرح دعوتِ خیر یا تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول و فروع کو بھی بڑی کاوش و دانش سے منضبط فرمادیا ہے۔ ہمارا کام زیادہ تر بس ان کو بدلے ہوئے عصری ظروف و وواعی کے قالب میں ڈھال لینا ہے۔ خاص طور پر حکمت و فراست اور تدریس و تدریس سے کام لینے کی ضرورت معروف و منکر کے امر و نہی کی تجدید و ترویج میں ہے کہ یہ امت کے عوام کیا خواص و علمائے تکمیل و پیش بالکل پیہ متروک ہو جانے کی بدولت اس کے اصول و آداب سب ہی فراموش ہو چکے ہیں۔ شاذ و نادر کوئی اس فرض کو گھربا ہوا بھی کرتا ہے تو دیکھا کہ اکثر اندھے کی لالٹھی چلائے لگتا ہے حالانکہ اسلام کی بڑی خصوصیت اعتدال و توازن ہے۔ اس کے تمام اوامر و نواہی ہی تعدیلی حدود و قیود سے مقید ہیں۔ ایک اچھا عالم ہی میں معروف و منکر کے امر و نہی کے ان حدود و قیود اصول و آداب کے تمام اطراف و جوانب پر بڑی سیر حاصل بحث موجود ہے۔ ذرا صحیح ذوقی تجدید سے کام لے کر ان کو جدید احوال و ظروف کے مطابق بنالینا ہے۔

عملی رہنمائی کے لئے اصل الاصول اس باب میں ایک ہی بات ہے۔ حضرت مجدد و تھانوی علیہ الرحمہ کے ہاں اس پر خاص زور تھا کہ معاصی و منکرات کی نوعیت تمام نردینی و اخلاقی و روحانی بیماریوں کی ہے لہذا ان کے بیمار کے ساتھ معاملہ بالکل وہی کرنا چاہئے جو جسمانی بیماریوں کے بیمار کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی معاصی سے نفرت اور معاصی پر شفقت۔ جسمانی بیماری میں ہمارا معاملہ اپنوں پر ایوں

دوستوں عزیزوں چھوٹوں بڑوں سے کیا ہوتا ہے؟ یہی ناکہ بیمار پر تو ہم کو ترس و رحم ہی آتا ہے لیکن بیماری کو دور کرنے میں حسب تعلق اپنی والی کوئی جانی و مالی ترغیبی و ترہیبی سعی و تدبیر اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ نہ بیمار کی کسی بیجا خوشی و خواہش یا رعایت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ گڑوی سے گڑوی دوا، بڑے سے بڑے آپریشن، سخت سے سخت پریسکریپشن ہی کچھ کرنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ مستقل و دیرپا تکلیف یا ہلاکت سے بچانے کے لئے یہ ظاہری سختیاں بھی عین ہمدردی و خیر خواہی ہی یا شفقت ہی شفقت ہوتی ہیں۔

پھر آخرت کی زندگی سے بڑھ کر کون زندگی مستقل و دائمی ہوگی اور اس کی ہلاکت و بربادی سے بڑھ کر کون سی ہلاکت و بربادی ہوگی۔ آخرت پر اگر ایمان و یقین ہے، تو وہاں کی چھوٹی سی چھوٹی راحت و مصیبت کو یہاں کی بڑی سے بڑی راحت و مصیبت کے مقابلے میں بھی نظر انداز کرنا کیسے جائز ہوگا۔ اسی طرح موقع و مناسبت اور شہادتی و مسئولیت کے لحاظ سے جہاں نرمی و ترغیب کا کام نہ چلے منکرات کو روکنے کے لئے اختیاری جبر و سختی کو بھی کام میں لینا جائز ہی نہیں واجب ہوگا۔ حدیث میں تغیر بالید سے اسی کو تعبیر فرمایا گیا ہے کہ جہاں بس چلے منکر کو یا تھ یا قوت سے مٹانا بھی فرض ہے۔

البتہ اس جبر و سختی و ترغیب کا بھی رنگ وہی ہمدردانہ و خیر خواہانہ ہو جو ایک مہربان معالج یا تیمار دار کا بیمار کے ساتھ حسب ضرورت دوا و علاج اور پریسکریپشن کے معاملے میں سختی و زبردستی کا ہوتا ہے، نہ کہ نفرت و حقارت یا بے ضرورت غصہ و

گرمی کا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ چہرہ زبردستی میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ تیسرے خود امر وہی کرنے والے کو جانی و مالی ایسا شدید ضرر نہ پہنچے جس کو وہ صبر کے ساتھ برداشت یا مدافعت کی قوت نہ رکھتا ہو۔ لیکن اگر برداشت کر سکتا ہو تو سبحان اللہ عین عزیمت و جہاد ہے! اسی لئے حدیث میں منکر کو روکنے کے لئے حسب استطاعت و برداشت تین درجات رکھے گئے ہیں، ایک ہاتھ یا قوت سے جہاں اس کی قوت ہو۔ دوسرا زبان سے۔ اگر اتنے کی بھی ہمت یا موقع نہ ہو تو آخری درجہ جس کو ایمان کا کمزور سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے یہ ہے کہ کم از کم دل سے بُرا جانے جس کا لازمہ یہ ہے کہ خود کو جہانت تک ہو سکے دور و نفور رکھے۔

گو ہمارے اندر اب اتنی دینی حمیت و حرارت ہی کتنوں میں ہے کہ دین و ایمان کے معاملات یا معاصی و منکرات پر غصہ آتا ہو۔ دل سے بُرا جانے والے اور برائیوں سے دور و نفور یا ان میں شرکت سے گریز کرنے والے بھی خال خال ہی ہوں گے۔ تاہم تصورِ بہت ہر طرح ہی کے لوگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اوپر معروف و منکر کے امر وہی کی دینی اہمیت پر چڑھ کر دیا گیا ہے، اس سے متاثر ہو کر کوئی بندہ خدا الٹی سیدھی لاشی چلائے لگے اس لئے احتیاطاً چند اصولی قیود و شرائط بھی آخر میں عرض کر دیئے گئے۔ باقی جس طرح حضراتِ علما کا کام دعوتِ نیر کے سلسلہ میں ایسے احکام کی تعلیم و تبلیغ ہے جن سے روزمرہ کی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، اسی طرح معروف و منکر کے نفسِ امر وہی کے حکم کی تعلیم و تبلیغ کے ساتھ اس کے وجوب و استحباب اور جواز کے ضروری ضروری

احکام یا قیود و شرائط بتلاشے رہتا بھی ضروری ہے۔ اور پڑھے لکھوں کو مناسب کتابوں کے نام۔

باقی بار بار عرض کرنے کی اصل بات ایک ہی ہے کہ جب تک ایمان و عمل صالح کے تمام ابواب — عقائد و عبادات، دیانات و معاملات، اخلاق و معاشرات — سب ہی کے معروفات و منکرات کے امر و نہی کو اہم و اہمیت میں زندہ و رائج نہ کیا جائے گا، اس وقت تک اجتماعی طور پر نہ کوئی چھوٹی بڑی مسلمان آبادی اسلامی یا اسلامی سماج اور سوسائٹی بنے گی اور نہ اسلامی زندگی کے اجتماعی ثمرات و برکات رونما ہوں گے۔ نہ دینی و دنیوی، نہ معاشی و معاوی، نہ سیاسی نہ سماجی۔ نماز روزہ سے بڑھ کر دین اور دینی زندگی پیدا کرنے والی کون سی چیز ہوگی۔ نماز کی خاص خصوصیت و خاصیت یہی توتانی گئی ہے کہ وہ فواحش و منکرات سے روک دیتی ہے۔

— إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْفَعُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹) — اسی طرح روزہ کی خاص غرض و غایت تقویٰ یا پرہیزگاری و پاکبازی کی زندگی پیدا کرنا ہی تو ہے۔ — لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ — لیکن کیا کسیر سے کسیر و ابھی اپنی خاصیت و اثر کو پوری طرح ظاہر کر سکتی ہے، جب تک ایک طرف اس کے اجزا اور ترکیب استعمال وغیرہ پوری طرح درست نہ ہوں اور دوسری طرف اس کے اثر و خاصیت کو خفیف و نازل کرنے والی پرہیزگیوں سے پوری طرح پرہیز یا بچنے بچانے کا اہتمام نہ ہو۔

عام مسجدوں کو جانے دیں، عام خانقاہوں اور درسوں کی مساجد تک میں

جا کر دیکھ سکتے ہیں کہ حضور قلب یا خشوع و خضوع کا ذکر نہیں معمولی تعدیل  
 ارکان تک کی کوتاہیوں پر بھی کوئی اتنا کہنے والا مشکل سے ملے گا کہ میاں تمہاری نماز  
 یہ ٹھیک نہیں ہوئی، ٹھیک طریقے سے پڑھا کرو۔ اسی طرح روزہ کو لوگ طرح طرح  
 کے منکرات سے پیٹ کا خالی فاقہ بناتے رہتے ہیں۔ لیکن علماء و مشائخ کی مجالسوں میں  
 بھی ان پر نکیر کا کوئی لفظ کسی زبان سے کم ہی نکلتا ہوگا۔ اور ایسی مثالوں کی تو۔  
 کہتے شرم آتی ہے۔۔۔ ایسے علماء و مشائخ میں بھی کمی نہیں جو تہجد و اشراق اور  
 ایام بیض و غیرہ کے نفلی صوم و صلوة کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ معاملات اخلاق  
 اور معاشرت کی بہتری موٹی موٹی بدر پھریوں تک سے پرہیز نہیں فرماتے۔ قدرۃ عام  
 طور سے شہر خاںقاہوں میں مریدوں کو ان کی ایمان و عمل صالح کی کوتاہیوں پر  
 روک ٹوک کرتے دیکھے جاتے ہیں نہ دینی درسوں کے استاد شاگردوں کو تفسیر و  
 حدیث اور فقہ سب کے سبق پڑھا دینے کے علاوہ ان پر عمل کی تاکید و نگرانی کرتے پائے جاتے ہیں



ایک اور بات مسلمانوں کے خالص دینی اداروں، درسوں یا جماعتوں کا بھی کسی ایک  
 اجتماعی نظام پر مجتمع ہونا تو بظاہر اب ان ہونی بات ہے۔ تاہم دین کی سب سے  
 بڑی سہولت اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے کسی فرد و جماعت کو  
 بھی خود اپنی استطاعت و وسعت سے زیادہ کا مکلف و مسئول نہیں ٹھہرایا ہے۔  
 لیکن اپنی اپنی وسعت و اختیار کی حد تک ہم مسئولیت و مواخذہ سے چھوٹ بھی



نہیں سکتے جس فرد یا جماعت سے یہی دامن درے، قدمے سخن، جس طرح اور جس قدر بھی مسلمانوں کی دینی اصلاح کی دین ہی کے احکام و مطالبات کے مطابق جو سعی و تدبیر اپنی والی ہو سکے اس میں کوتاہی بہر حال بڑی مجربانہ کوتاہی ہوگی۔ سوال صرف مقدور تدبیر سعی و تدبیر ہی کا ہوگا۔

لہذا جن افراد یا جماعت، ادارہ و مدرسہ کے اہل بست و کشار کی سمجھ میں معروضات بالا کچھ آجائیں ان کی طرف عملی قدم اٹھانے کے لئے اپنی ذات یا جماعت کی بساط تک کسی مزید انتظار و عذر کی گنجائش قطعاً نہیں۔ راقم عاجز کی سمجھ میں دینی مدارس کے ذمہ دار حضرات کو خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ فرمانا آسان بھی ہے اور مقدم بھی۔ اور ان ہی کی توجہ انشاء اللہ مستقبل کے لئے مستقل و مستحکم بنیاد کا کام دے گی۔ امت کے دینی راعی و نگہبان یا رکھوالے ڈھلتے ان مدرسوں ہی میں ہیں، ان مدرسوں کا قالب اگر درست ہو جائے یعنی اس میں ڈھلنے والے اگر سالانہ درس ہیں فی صد بھی "منکرامتہ" والے مطالبات کو پورا کرنے والے ہوں جو "دعوة الی الخیر" اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی لگن رکھتے ہوں اور ملک میں پھیلنے رہیں تو انشاء اللہ اصلاح کی یہ بالکل فطری راہ اپنوں پر ایوں سب میں دین کی حفاظت و اشاعت دونوں کے لئے کافی و کارگر ہوگی۔

اول و آخر یہ کہ نیت تمام تر اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی فلاح ہو، اپنی بھی دوسروں کی بھی۔ دنیا براہ راست و بالذات مطمح نظر نہ ہو۔ اعتماد کی نظر بھی

دعوتی اسباب و تدابیر پر نہیں، مسبب الاسباب پر سہو ورنہ بالعموم دیکھا جاتا ہے کہ دین و دعوت کے مخلص خادم بھی نفس تدابیر میں اتنا الجھ جاتے ہیں کہ حدود کا لحاظ نہیں رہتا۔ خدا و رسول کی رضا و ناراضی پسند و ناپسند یا احکام و شریعت کا لحاظ و اہتمام مقاصد ہی میں نہیں وسائل و اسباب میں بھی لازم ہے۔

جماعت سازیوں، انجمن بازیوں یا طرح طرح کے اداروں کی کثرت، عملی ہذا تمدن و تہذیب، علم و ادب، ثقافت و انسانیت، سیاست و معیشت، جمہوریت، حریت وغیرہ کی گونا گوں بے شمار الگ الگ دعوتوں یا تحریکوں کا ایک بڑا مضر اثر معاشرہ میں فکر و عمل دونوں کے حق میں شدید انتشار و پرالگندی کا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ہر جماعت و تحریک والے نفسیاتی طور پر حق کو کم و بیش اپنے ہی دائرہ میں دائر جان کر تعصب و تنگ نظری کے مفاسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف آج کل کی سی مصنوعی تحریکوں یا جماعتوں میں ان کے مقاصد کے ساتھ فقط اخلاص و وفاداری رکھنے والوں ہی کا جمع ہونا عملاً ناممکن ہوتا ہے بلکہ جیسے جیسے کوئی جماعت پھیلتی جاتی ہے غیر مخلصین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ یہ جماعت کے اندر داخل ہوتے ہیں لازماً ان کے اثر سے پوری جماعت کی للہیت و عملیت متاثر ہوتی ہے۔

یہ اجمالاً عام ایسے مفاسد ہیں جن سے جدید طرز کی کسی صحیح سے صحیح مقصد پر مبنی جماعت اور تحریک کا محفوظ رہنا بھی عملاً ناممکن ہے۔ انبیائی تاریخ میں ایسی مصنوعی رنگ کی جماعت سازیوں کا قطعاً کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اگر ان میں خیر کا پہلو غالب ہوتا

تویہ کوئی ایسی دور کی کوٹری یاد قیق بات نہ تھی جس کو انبیا جیسی ایمانی فراست پانہ لیتی اور جاہلیت جدیدہ کی فرنگی رہنمائی کا انتظار کرنا پڑتا۔ یا اگر ایسا ہی فوق الفہم معاملہ ہوتا ساتھ ہی دعوتی و اصلاحی کاموں کے لئے مفید و موثر یا شرکے مقابلے میں خیر کاکم از کم غالب عنصر رکھنے والا تو خود وحی کے ذریعہ صراحتہ یا اشارہ کوئی نہ کوئی رہنمائی ضرور ہو جاتی۔

باقی اسلامی توحیدی مرکزیت کے حق میں تو یہ فرنگی جماعت ساز یوں کی و با صرف زہریلی ہی زہریلی ہے۔ مسلمان کے لئے تو دراصل ایک ہی دعوت، ایک ہی تحریک "توحید" کا ایک ہی نعرہ ہے۔ اس کے بعد اس کا سارا کام اسی توحیدی ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی زندگی اپنے اختیار و مقدر بھروسہ یا وراستہ کرتے رہنا۔ تہذیب و تمدن، قومیت و وطنیت، جمہوریت و اشتہالیت (سوشلزم) یا اشتراکیت اور آرٹ و کلچر وغیرہ کے نئے نئے معبودوں کا اس عنوان و اہتمام سے زام لینا بھی کہ یہ زندگی کے کوئی خاص مقاصد ہیں، مومن کو مشرک بنانے والی نادان کی دوستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی بیدار و پائدار زندگی اپنی عین حقیقت و خاصیت ہی کی رو سے زندگی کے باقی تمام دوسرے شعبوں کو صالح بنا کر رہے گی۔

# عملی اشارات

قصہ کوتاہ:-

۱۔ انسان کو کائنات و مخلوقات میں پیدائشی و خلقی طور پر احسن تقویم کا جو سب سے اونچا مقام و منصب عطا ہوا ہے اس کے بقا و تحفظ کی ذمہ داری تمام تر ایمان و عمل صالح کی اپنی اختیاری زندگی پر ڈالی گئی ہے۔ ورنہ پھر اسی انسان کی جگہ ساری پستیوں سے پرت۔۔۔ اسفل السافلین۔۔۔ تحت الثریٰ ہے۔ انفرادی و اجتماعی ایمان و عمل صالح کے بغیر اس انتہائی گراؤٹ یا "اسفلت کے زیان و خسران سے" انسان و انسانیت کو نہ اس کی عقل و دانش بچا سکتی ہے، نہ علوم و فنون، نہ تہذیب و تمدن، نہ سائنسی اکتشافات و ایجادات، نہ حریت و حکومت اور نہ جمہوریت و اشتراکیت، نہ منصوبہ بازی اور سوشلزم۔

۲۔ البتہ ایمان و عمل صالح کی اختیاری زندگی کو اختیار کرنے اور اس پر آسانی سے چلنے چلانے کے لئے انسان کی "احسن تقویم" والی فطرت ہی کے مناسب "تواصی" یا حق "کا نہایت کارگر تدبیری نظام بھی عطا فرمادیا گیا ہے۔ یعنی ایمان اور عمل صالح کی

لقد خلقنا الانسان في احسن تقویم ثم رددناه اسفل سافلین الا الذین امنوا و عملوا الصالحات۔

صحیح یا "برحق" تعلیمات و احکام کی تفہیم و تاکید اور فہمائش کا انفرادی، قومی و بین اقوامی ہمہ گیر نظام۔ اس کے ہم آہنگ دو جز ہیں :-

(۱) ایک توحق و خیر یا سچائی اور بھلائی کی باتوں کی نفس دعوت و تبلیغ، اپنے علم و بساط کے مطابق لوگوں تک اُن کو پہنچانا اور ان پر عمل کی طرف بلانا۔ اس کا نام خصوصیت سے "دعوت خیر" ہے۔

(۲) دوسرے اپنے محل و منصب، وسعت و قوت کے موافق ہر بھلائی برائی کا امر و نہی روک ٹوک، بالفاظ دیگر ہر برائی سے ہر اپنے پر ایسے کو مقدر و بھر روکتے اور بھلائی پر عمل کراتے رہنا تاکہ بھلائی معاشرہ میں خوب جانی پہچانی (معروف) بن جائے اور برائی لوگوں میں نفرت و حقارت یا رد و انکار کی چیز (منکر) بن جائے۔ حتیٰ کہ لوگوں کو اس کے علاوہ ارتکاب یا اس پر اصرار کی ہمت نہ رہے۔ یہی حقیقت "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی ہے۔

انفرادی "امنوا و عملوا الصالحات" کے ساتھ توصیٰ بالحق کی اصطلاح "دعوت الی الخیر" اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو جامع ہے۔ اور عملاً دونوں زیادہ تر ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور چلنا چاہئے۔

۳۔ بڑا سوال یہ ہے کہ عوام میں حق و خیر کا یہ علم یا معروف و منکر پر یہ امر و نہی کیسے پیدا و رائج ہو۔ جواب جیسا کہ بار بار دہرایا جا چکا ایک ہی ہے کہ ایک خاص پوری جماعت کا خاص فرض و فریضہ یہی ہو کہ ایک طرف وہ خود لوگوں میں حق و خیر کی

دعوت و تبلیغ اور معروف و منکر کا ہاتھ زبان یا دل سے جس جس طرح جس حد تک ممکن ہو  
 امر وہی کرتی رہے اور دوسری طرف دوسروں کو بھی بتلاتی رہے کہ تمہارے لئے حق و خیر  
 یا برائی بھلائی کا خود جان مان لینا اور عمل کر لینا کافی نہیں۔ بلکہ اپنی واقفیت و  
 حیثیت کے مطابق اپنے اپنے بال بچوں رشتہ داروں دوستوں، پڑوسیوں بلنے جلنے  
 والوں کو واقف کرانے اور مقدر بھر عمل کراتے رہنا بھی دینی فریضہ ہے۔

۴۔ اس طرح قال و حال زبان و عمل کی جدوجہد سے جب کسی ملک و معاشرہ میں  
 معروف و معتدبہ درجہ میں اپنی معروفیت و عزت یا پسندیدگی کی جگہ حاصل کر لے گا  
 اور منکر انکار و نفرت یا ناپسندیدگی و بیزاری کا سزا وار بن جائے گا تو لازماً اس کے افراد  
 میں نہ معروف کا ترک عام و آسان ہوگا نہ منکر کا ارتکاب یہی معاشرہ صحیح معنی میں  
 اسلامی معاشرہ ہوگا جس سے غیر مسلموں کا مسلسل و یکسر غیر متاثر رہنا بھی غیر ممکن ہی  
 ہوگا۔ ایسا ہی معاشرہ یا امت "خیر امت" ہو کر دوسری امتوں قوموں یا پوری انسانیت  
 (الناس) کے حق میں معروف و منکر کے امر وہی کا حق ادا کر سکے گی۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ  
 لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ**

۵۔ پھر ہی خیر امت بہ حیثیت امت اپنے ایمان و عمل صالح کی طاقت سے  
 دنیا کی بھی ہر طرح کی اجتماعی — سیاسی و معاشی اور سماجی — خیر و برکت  
 یہاں تک کہ اقتدار حکومت جو کسی قوم کی سب سے بڑی قومی رفعت و عظمت جانی  
 جاتی ہے، اس کا قطعی و حتمی وعدہ بھی اسی ایمان و عمل صالح ہی کی زندگی سے پورا ہوگا۔

كما قال الله تعالى وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ...

ہدیکن اس خلافتی اقتدار و حکومت کی غرض بھی جاہ و مال کی شخصی یا قومی سامراجی یا اشتراکی لوٹ کھسوٹ قطعاً نہیں، بلکہ ایک طرف وہی خود اپنی ایمان و عمل صالح کی زندگی کی تقویت اور دوسری طرف معروف و منکر کے ذریعہ دنیا میں بھلائی یا خیر و صلاح کو پھیلانا اور برائی یا شر و فساد کا مٹانا۔ الَّذِينَ آمَنُوا فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَعَنِ الْمُنْكَرِ

بسیوں صفحے کے معروضات بالا اور ان کی طرح طرح سے بار بار کی تاکید و تکرار کا حاصل و مدعا دو لفظوں میں اتنا ہی ہے کہ خود مسلمانوں کی کیا پوری انسانیت کی دین و دنیا کی فلاح و نجات کا دار و مدار تمام تر خود مسلمانوں کا ہے حیثیت امت ایمان و صلاح کی اسلامی زندگی اختیار کرنا اور معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ اس کو ساری دنیا میں برپا کر کے کفر و فساد کی زندگی کو مٹانا ہے۔ لہذا انسان کے دینی و دنیوی ہر طرح کے زیان و خسران سے بچنے بچانے کی صحیح سیدھی راہ بالآخر ایک ہی ٹھہرتی ہے — خود مسلمانوں کا مسلمان بننا پنانا — یہی دو لفظی مطالبہ مسلمانوں سے خود اسلام کی کتاب کا بھی ہے کہ "مسلمانو! بس مسلمان ہو جاؤ! يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا" لیکن خود مسلمان پہلے مسلمان کیوں بنیں بنائیں؟ جواب وہی ایک ہی ہے کہ ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی ظاہری و باطنی زندگی پیدا کریں، ایسی زندگی پیدا کرنے کی تدبیر بھی فقط وہی ایک ہی ہے کہ

”دعوتِ خیر“ اور معروف و منکر کے امر و نہی کے لئے خود کتابِ اسلام کے بتلائے ہوئے نظامِ ہدایت کو از سر نو زندہ و برپا کریں۔

اس تدبیر کا پہلا قدم بھی وہی ایک ہی ہے کہ امت میں جو جماعت یا ”امت در امت“ (منکرافتہ) خاص طور پر ”داعی الی الخیر“ اور ”آمر بالمعروف و نہی عن المنکر“ کے منصب کے لئے موزوں ہے، وہ اپنے اس خصوصی مقام و منصب کو پہچانے اور اس کے حقوق و فرائض کو عملاً ادا کرے۔

ظاہر ہے یہ خصوصی جماعت وہی ہو سکتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ خیر اور معروف و منکر کے اصول و فروع کا اتنا معتد بہ علم حاصل کرتی اور رکھتی ہے کہ ایمان و عمل صالح کے ضروری احکام کی ”دعوتِ خیر“ کے ذریعہ تعلیم اور معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ ان کی عملی ترویج و تربیت کر سکتی ہو۔

الحمد للہ کہ نفسِ علم کی حد تک اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہمارے چھوٹے بڑے سیکڑوں دینی دارالعلوم ایمان و عمل صالح کے علومِ دین کی نفسِ تعلیم کا حق بقدر ضرورت ادا کر رہے ہیں اور ہزاروں علمائے دین فراغ و تکمیل کی سندیں لے لیکر ان سے نکلتے رہتے ہیں۔ کمی ان میں بالعموم دوہی باتوں کی ہوتی ہے، ایک ایمان اور اعمالِ صالحہ میں معتد بہ رسوخ و استقامت کی دوسرے اپنے دعوتی خصوصی مقام و منصب کے شعور و احساس کی خیر بادین کے جس علم کو انھوں نے بھرپور جوانی تک حاصل کیا ہے اسی کی ”دعوت“ اور اسی کی معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ دوسروں میں



عملی ترویج و اشاعت مرتے دم تک زندگی کے ہر حال و ماحول میں ان کا واحد منصبی فریضہ ہے۔ ایمان ان کا بالعموم ”لتأید خل الايمان في قلوبكم“ کے درجہ تک رہتا ہے، اس کو شعوری طور پر داخل قلب یا راسخ بنانے کی تربیت مقدم ہے یعنی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے قلبی و قلبی عملی مطالبات کی نگرانی جس قدر آدمی اپنے کسی علم و خیال یا اصول پر عمل کرتا ہے، اسی قدر وہ راسخ یا پختہ و پائدار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے دینی دارالعلوموں میں معمولی وہ بھی بے جان نماز روزہ کے علاوہ اخلاق و معاملات اور معاشرت کے ان اعمال صالحہ پر توجہ نہ ہونے ہی کے برابر فرمائی جاتی ہے، جن کا تعلق بندوں کے باہمی حقوق و فرائض سے ہوتا ہے۔ حالانکہ دراصل ہمارے ایمان و ایمانیات کی کسوٹی یہی حقوق و فرائض ہیں۔ مثلاً اگر ہم آخرت کی ابدی جزا و سزا، جنت و جہنم پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، پھر بھی دنیوی جاہ و مال وغیرہ کے فانی سووڑیاں کے مقابلہ میں اس ابدی نفع و ضرر کی پرواہ نہیں کرتے، تو ہمارے ایسے ایمان کی حقیقت ایک بے دلیل دعوے سے زیادہ نہیں رہتی۔ اپنوں پر ایوں کسی کی نظر میں بھی بڑے زبانی دعوے کا محض کلامیاتی انشا پردازوں یا انشا گفتاریوں سے دل میں کتنا وزن پیدا ہوگا معیار یہ ہے کہ جب دنیا و آخرت کے کسی نفع و ضرر کا مقابلہ ہو تو ہم بلا اضطرابی صورتوں کے آخرت کو دنیا پر قربان کرنے یعنی خدا و رسول کی نافرمانی و ناراضی خریدنے پر آمادہ نہ ہوں۔ سچ پوچھتے تو دین کو دنیا پر قربان کرتے کرتے رہنے کی ہماری حرصی دنیا طلبی ہی ہماری تمام دینی بیماریوں ہی کی نہیں خود دنیا کی ساری بریادیوں کی بھی

جڑ ہے۔ اسی کی بدولت ہم ایمان و عمل صلح والی زندگی کے ان انفرادی و اجتماعی معاشی و سیاسی ثمرات و برکات کو بھی جو اس دنیا کے حق میں منصوص و موعود ہیں کھوتے رہتے ہیں۔

دنیا نام ہے اصل میں دوہی چیزوں جاہ و مال کا۔ ان ہی کے ناہانزونا واجب یا حرصی مطالبہ و مقابلہ سے اخلاقی، معاشی اور معاشرتی سب ہی طرح کے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں۔ دینی درس گاہوں کی تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ اس سرچشمہ مفسد پر نگاہ رکھنا اہم و اقدم ہے۔ ان سے فارغ ہو کر باہر آنے والے ہمارے علماء کی بیشتر کمزوریوں کی بنیاد حب جاہ و مال کے جذبات ہوتے ہیں، اور یہی ان کو "لا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اجْرًا اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کی اپنی انبیائی سطح سے قدم قدم پر گراتے رہے ہیں۔ اونچے اونچے مشاہیر تک میں شاذ و نادر ہی کوئی ان گراؤوں سے پاک ملے گا۔

اس لئے دینی تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کو ان میں تعلیم پانے والوں کی عام اخلاقی و عملی تربیت کے ساتھ اس پہلو پر بہت خاص توجہ فرمانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ دنیاوی تعلیم کے اسکولوں کالجوں کی نقالی میں ان ہی کی طرح محض کتابی امتحان

لہ من يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب ومن يتوكل على الله فهو حسبه. تقویٰ نام ہی ہے ایمان و عمل صلح کی جامع زندگی کا اور جو فریادِ جماعتِ خدا پر بھروسہ کر کے ایسی زندگی کو اپنالے گا خدا کا وعدہ ہے کہ اس کے ہر قسم کے معاشی و غیر معاشی مسائل و مشکلات کو بے شان و گمان راہوں سے حل فرماتا رہے گا اور بھی کثیر آیات میں انفرادی و اجتماعی ہر طرح کی دنیوی کامیابیوں کا راز ایمان و عمل صلح کی اسلامی زندگی ہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔

اور اس کے پاس فیل کے کچھ مقررہ نمبر کو جو الٹی سیدھی کسی طرح حاصل کر لے، اس کے ہاتھ میں عالم و فاضل کی سند پکڑا دینا دینی مدرسوں کی بڑی الٹی مہلک راہ اور ان کے ذمہ داروں کے حق میں بڑے مواخذہ کی بات ہے۔ امت کے تھاٹوی حکیم و صلح نے تو اخلاقی و عملی معتد بہ اصلاح کے بغیر اس طرح عطاءئے سند یا دستار بندی کو صریح خیانت اور چھوٹی شہادت قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ سند مدرسہ والوں کی طرف سے دراصل اس بات کی سند و شہادت ہوتی ہے کہ یہ مسلمانوں کے مقتدر ہونے کے لائق ہیں۔ وہ ان کے علم و عمل اخلاق و معاملات پر کھروسہ کر کے ان کی پیروی کریں۔

اخلاقی و عملی تربیت کے لئے ایک اور بڑی عملی و مفید ساتھ ہی آسان تدبیر بھی حضرات مدارس کے لئے قابل توجہ ہے۔ بہت سے دینی مدرسوں میں طلباء و اساتذہ کی تعداد سیکڑوں تک جاتی ہے۔ ان کی ضروریات کا ایک ذخیرہ (اسٹور) اگر دوکان کی صورت میں خود مدرسہ کے اندر مدرسہ ہی کے انتظام میں ہو جس میں باری باری خود طالب علموں سے کام لیا جائے، تو نہ صرف ان میں لین دین میں لطفی مواقع کی اصلاح سے ان کی عام امانتی و دیانتی بلکہ ساتھ ساتھ کاروباری تربیت بھی ہوگی۔ اس دوکان کی نوعیت طلبہ و اساتذہ کے بقدر استطاعت حصوں پر مبنی مشترک سرمایہ کے امداد یا ہی کے سے اسٹور کی ہو جس کی وجہ سے ہر ایک کی دلچسپی اس میں ذاتی و شخصی بھی ہوگی۔

۱۰ اصلاح الرسوم۔ ص

راقم ناکارہ کے دل و دماغ میں ایسی کتنی بالکل آسان عملی باتیں بھری پڑی ہیں مگر خود عملاً اپنا بیج ہونے کی بدولت شیخ جلی کی اسکیب میں ہو کر رہ گئیں! "داشتہ آید بکار" کی طرح شاید "نوشتہ آید بکار" پر کسی صاحب عمل کی نظر اس اشارہ سے پڑ جائے۔

غرض مسلمانوں کو مسلمان بننے بنانے یا اسلامی امت و معاشرہ کو اسلامی خطوط پر از سر نو تعمیر کرنے کے لئے سب سے پہلے "منکہ امتہ" والے معماروں کو صحیح معمار بنانے کی فکر ناگزیر ہے۔ ورنہ ہر تعمیر تخریب ہی کے نتائج زیادہ پیدا کرتی رہے گی جیسا کہ صدیوں سے کر رہی ہے۔ پھر انشاء اللہ ان معماروں یا علماء حق کی ذرا مستحکم تنظیم ہر ملک کے معاشرہ کے مسلمانوں کو — خواہ وہ مسلمان حکومت کے باشندے ہوں یا غیر مسلمان کے، اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں — مسلمان بننے بنانے کا حق ادا کر سکے گی۔ اور مسلمانوں کا کما و کیف کسی معتدبہ درجہ میں ایمان و عمل صالح والی اسلامی زندگی اختیار کر لینا ہی بجائے خود ایمانی و تدریسی دونوں رتھوں سے ان کے دین و دنیا کے تمام مسائل و مشکلات کا حل ہوگا۔ ایمانی تو اس لئے کہ دین و دنیا کی — جیسا کہ بار بار عرض کیا جا چکا — فلاح و نجات، صلاح و سعادت کا خدائی حتمی وعدہ ایمان و عمل صالح کی توأم جامع زندگی ہی پر ہے۔ تدریسی اس لئے کہ عقلی طور پر بھی دیکھا جائے تو دنیا کے سارے معاشی و معاشرتی سیاسی و تمدنی، قومی و بین الاقوامی فسادات زیادہ تر

سب سے زیادہ آجکل معاشی یا غریبی و بے کاری وغیرہ کے مسائل ہی نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے ان کے متعلق اسلام کی متوازن و مستقیم راہ پر تجدید معاشیات میں کچھ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

افراط و تفریط کی گمراہیوں کا خمیازہ ہیں اور انسانی زندگی کی اسلامی متوازن و مستقیم راہ بجائے خود بالخاصہ اسی طرح دنیاوی زندگی کے ہر شعبہ کی صحت و سلامتی کی ضمانت ہے جس طرح متوازن غذا جسمانی صحت و سلامتی کی کیسی عجیب و غریب ایمانی فراست و حکیمانہ نظرامت کے تھانوی حکیم کی تھی کہ جہاں خالص ایمانی وثوق و یقین کے ساتھ یہ ارشاد ہے کہ "خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے قسم کھاتا ہوں کہ اگر سب مسلمان احکام حق پر عمل پیرا ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کی سعی و کوشش میں لگ جائیں تو چند روز میں انشاء اللہ کا پاپٹ ہو جائے" وہاں ساتھ ہی ساتھ چیلنج ہے کہ وہ خدا اور رسول پر ایمان یا ان کی رضا و اتباع کی نیت سے نہ سہی، دوسری دنیاوی تدبیروں کی طرح محض دنیا کی :-

"ایک تدبیر ہی کا درجہ سمجھ کر کر دیکھیں۔ آخر اور بھی تدابیر کر رہے ہو، ایک یہ بھی سہی . . . . (خصوصاً) جب تمہاری ساختہ پر داختہ تدابیر میں اب تک کامیابی نہیں ہوئی تو اللہ و رسول کی بتلائی ہوئی تدابیر کو تدابیر ہی کی نیت سے کر کے دیکھ لو۔ . . . اگر کامیابی نہ ہو چھوڑ دینا . . . لیکن کر کے دیکھو تو۔ کرتے ہی پھانسی کیوں لگتی ہے، مرے کیوں جہاتے ہو۔ بہت دنوں بتوں کی پرستش کر کے تجربہ کر لیا اب ذرا خدا کو بھی پوج کر دیکھ لو"

۱۔ تجدید دین کامل ص ۲۰۲ و ۲۰۵ -

اس از سر نو تعمیری تنظیم کا آغاز ہمارے دینی بڑے مدارس کے اکابر چاہیں تو آج ہی فرما سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے فارغ التحصیل یا قریب بفرغت طلباء میں دو چار فی صد اب ایسے نکل آئیں گے جن کی اخلاقی و معاملاتی حالت نسبتاً بہتر ہو، خصوصاً جاہ و مال کے حرص سے مغلوب نہ ہوں۔ معاشی ضروریات میں بقدر ضرورت پر قانع ہوں یا رہ سکیں۔ اگر اتفاق سے متوکل یا خود مستغنی ہو تو کیا کہنا، ورنہ مدرسہ ہی کی طرف سے اس کا انتظام ہو، تاکہ جن لوگوں میں دعوت و اصلاح کا کام کرے ان سے قطعاً کسی طرح کی مالی و جانی خدمت کا طالب نہ ہو، نہ ہدیہ کچھ قبول کرے۔ اس باب میں ضروری ہدایات کی تفصیل تجرید تعلیم و تبلیغ میں کر دی گئی ہے۔

اب ایسے داعی و مصلح کے ذریعہ کام کی ابتدا مسلمانوں کے چاہے جتنے چھوٹے سے چھوٹے حلقے یا آبادی سے ہو لیکن ہو ہمہ گیر کمابھی اور کیفاً بھی یعنی نہ آبادی کا کوئی گھراؤ فرد اس سے باہر رہے اور نہ اسلامی تعلیمات کو صرف کلمہ و مناسبات یا عبادات تک محدود رکھا جائے، بلکہ عقائد و عبارات کے فرائض و واجبات کی تعلیم و اصلاح کے ساتھ ساتھ ہی پورا زور اخلاق و معاملات اور معاشرت میں زیادہ سے زیادہ اسلامیت پیدا کرنے پر لگایا جائے۔ تاکہ اسلامی اعمال صالحہ والی زندگی کے نقدانقد فوائد اور برتری کا تجربہ اپنوں پر ایوں مسلمان غیر مسلمان سب کو ہو، عقائد و ایمانیات دل اور باطن کی چیزیں ہیں اور عبادات زیادہ تر اخروی و انفرادی نفع کی۔ اسلام و اسلامیت کے ظاہری و دنیوی ثمرات و برکات کا علانیہ ناقابل تردید مظاہر

جب ہی ہوگا کہ اسلامی عقائد و عبادات کی روح خدا و رسول کی خوشنودی و پسند اور آخرت کی فکر و غیبت قدم قدم پر مسلمانوں غیر مسلمانوں سب کے ساتھ ہمارے لین دین کے معاملات اور اخلاقی و معاشرتی تعلقات میں دن دو پہر گھر باہر بازار و دفتر ہر جگہ محسوس و متحرک نظر آئے۔

راستہ اس کا وہی ایک ہے "تواصی باحق وبالصبر" یا معروف و منکر کے احرو نہی کی انفرادی ذمہ داریوں کا عملی شعور پیدا کرنا۔ مثلاً ایک گاؤں یا محلہ مسلمانوں کی پانسو آبادی کا ہے جس میں گھروں کی تعداد سٹو ہے پہلے ان گھروں کے سردھروں یا حدیث کی زبان میں راعی و نگرانوں کو ذہن نشین کرایا جائے کہ تمہاری مسلمان ہونے کی ذمہ داریاں نہ صرف کلمہ اور نماز روزہ کی عبادتوں پر ختم ہو جاتی ہیں اور نہ صرف اپنی شخصی ذات تک ان کی پابندی سے۔ عبادات ہی کی طرح اور تعداد میں ان سے بہت زیادہ اخلاق و معاملات اور معاشرت کے اسلامی فرائض و واجبات ہیں جن کو خود ادا کرنے کے ساتھ اپنے اہل و عیال یا زیر نگرانوں سے ادا کرائے بغیر نہ دنیا میں اپنی دینی ذمہ داریوں سے ہم عہدہ برآ ہو سکتے ہیں نہ آخرت میں ان کی باز پرس سے۔ تم پر جس طرح اپنے زیر نگرانوں بال بچوں وغیرہ کی ذمہ داری چند روزہ زندگی کی آرام و راحت کے لئے کھانے پٹے، بیماری آزاری کی فکر اور دیکھ بھال واجب ہے، اس سے ہزاروں درجہ زائد ان کی آخرت کی ابدی زندگی کے بناؤ بگاڑ کی نگرانی و خبر گیری بھی تمہاری عین دینی و اسلامی ذمہ داری ہے۔ ورنہ تم ان کے اس سے بڑھ کر دشمن ہو گے

جیسے کوئی اپنی اولاد کی جوانی اور بڑھاپے کے مستقبل سے بے فکر ہو کر جوان ہونے تک اس کو خالی طفلانہ مشاغل یا کھیل کود میں لگا رہنے دے جس کی بدولت آگے چل کر زندگی بھر وہ بیکاری و فاقہ کشی کی مصیبت جھیلتی رہے۔

پھر جس طرح تم خود اپنی زندگی کے سارے دنیوی معاملات کو اسلام کی نگرانی میں دیئے بغیر خالی کلمہ و نماز سے سچے پکے مسلمان نہیں بن سکتے اسی طرح اپنی زندگیوں کی بھی پوری زندگی کو اسلامی بنانے کی اپنی والی کوشش کے بغیر ان کی نگرانی کی جوابدہی سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور جس طرح ان کی دنیا کو ہر طرح بنانے اور اس کو ہر بگاڑ سے بچانے کے لئے تن من و دھن کی کسی کوشش میں کوئی اپنی والی کسر نہیں اٹھا سکتے اسی طرح بلکہ اس سے ہزاروں گنی بڑھ کر فکر و تدبیر ان کے دین کو بہتر سے بہتر بنانے اور چھوٹے بڑے بگاڑ سے بچانے کی، خصوصاً جب تک وہ تمہاری نگرانی میں ہیں تمام تر تمہاری ذمہ داری ہے۔

جب تک دینی و اسلامی ذمہ داری کے اس شعور و احساس کو بیدار و پائدار کر کے خود مسلمان گھروں کو مسلمان نہ بنایا جائے گا اس وقت تک نہ گھر سے باہر مسلمانوں میں اسلامی زندگی اپنے موثر و کارگر مظاہر کے ساتھ رونما ہوگی اور نہ خالی گھر کے باہر کے محض کتابی نکتوں، مدرسوں اور کاغذی دستروں کی خارجی کوششوں سے خارجی و ماحول کے دین دشمن زہریلے اثرات سے ان کا محفوظ رہنا الا ماشاء اللہ ممکن ہوگا۔ یہ نرے خارجی وقتی علاج ہیں جو نہ مرض کی گہرائی تک



جاتے ہیں نہ ان کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں پختہ اسلامیت نام کے اسلامی مکتبوں، مدرسوں، کتابوں، رسالوں، تقریروں، تحریروں، گشتی دعوتوں وغیرہ برونِ خانہ تدریروں سے اس وقت تک ہرگز ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ان کے ساتھ اور ان سے بہت زیادہ زور درونِ در یا گھر کی زندگی کو پختہ اسلامی بنانے کی فکروں پر نہ ہو۔ پھر انشا اللہ خارجی تدریس بھی سونے میں سہاگے کا کام دیں گی۔ دین کے حق میں گھر کی بے دینی و بددینی کی غیر اسلامی زندگی سے بڑھ کر خطرناک و مہلک باہر کا کوئی زہر نہیں۔ مہلک سے مہلک جرائم کا حملہ کامیاب زیادہ تر ایسوں ہی پر ہوتا ہے جو مدافعت کی اندرونی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔

اس گھریلو زندگی کی از سر نو تعمیر میں بھی نماز روزہ کے فرائض و واجبات کے ساتھ ساتھ ہی سب سے زیادہ توجہ مال و جاہ کے معاملات پر ہو کہ واجبی حقوق کے سوا کوئی کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے کیا معنی پوری خوش دلی کے بغیر لینا گوارا نہ کرے۔ نہ بیوی میاں سے، نہ میاں بیوی سے، نہ بھائی بھائی سے، نہ بیٹا باپ سے، نہ باپ بیٹے سے۔ اسی طرح ماں باپ کی اولاد پر بڑے بھائی بہن کی چھوٹے بھائی بہن پر، بڑائی میں بجز اسلامی آداب معاشرت کے حقوق و خدمت کی رعایت کے جاہی جذبات کی پرورش نہ ہونے پائے۔ اور یہ حقیقت خوب ذہن نشین کی کرانی جاتی رہے کہ اسلامی معاشرت کی روح یہ ہے کہ بے سبب کسی انسان کیا کسی جانور کو بھی ہم سے ذرا سی بھی اذیت نہ پہنچے کسی ظلم و زیادتی کا انتقام جائز

بیشک ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ جائز حدود سے تجاوز نہ ہو، ورنہ عفو و درگزر اور اصلاح سے کام لے تو کیا کہنا۔

گھر کے راعی یا نگراں کو دونوں باتوں کی نگرانی میں بھی کوتاہی نہ کرنی چاہئے نہ گھر کے افراد میں کسی کسی سے بلا وجہ کوئی چھوٹی سی چھوٹی تکلیف پہنچے اور اگر پہنچ جائے تو مظلوم کی طرف سے انتقام میں زیادتی نہ ہونے پائے۔ ورنہ تنبیہی و تادیبی ضرورت سے زیادہ خود نگراں کی اصل کوشش اپنے زیر نگرانیوں میں عفو و اصلاح کی تربیت اور عادت پیدا کرنے کی ہو۔ مثلاً بھائیوں بہنوں میں آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا یا ناچاقی ہو تو ایک طرف جس کی زیادتی ثابت ہو اس کو تدارک اور عفو خواہی پر آمادہ کرے اور جس پر زیادتی ہوئی ہو اس کو عفو و درگزر پر اور دونوں کو "اصحوا ذات بینکم" کی تعلیم کے مطابق اپنی طرف سے اصلاح میں پہل پر آمادہ کرے اور جو پہل کرے اس کی تحسین و تعریف سے ہمت افزائی ہو۔ اگر اس پر کوئی آمادہ نہ ہو تو پھر "اصحوا بین اخیکم" کے حکم کے مطابق خود معاملہ کی تحقیق کر کے ان میں انصاف و اصلاح جلد از جلد کرادے۔

ورنہ ہوتا بالعموم یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دلوں میں میل پیدا ہوتے ہوتے مستقل گرہ پڑ جاتی یا قرآنی اصطلاح میں غل پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دو سنگ بھائیوں کے دل بھی شاذ و تادیبی کسی گھر میں ایک دوسرے سے ملے یا صاف نظر

۱۔ جزء سیئۃ سیئۃ مثلہا من عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ (شوری ۴۷)

آتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اخلاق و معاملات کی موٹی موٹی بد عنوانیوں ہی سے نہیں ناگواری کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بچنا بچانا چاہئے۔ قرض یا عاریت کے لین دین میں جن لوگوں کی نیت خراب نہیں ہوتی ان کی بھی عام عادت یہ ہوتی ہے کہ وقت و وعدہ پر نہ قرض ادا کرتے ہیں نہ عاریت یا مانگے کی چیز واپس کرتے ہیں۔ بار بار کے تقاضے اور یاد دہانیوں سے قدرۃ فریقین کو ناگواری ہوتی ہے۔ اکثر مانگے کی چیز کی حفاظت کا حتیٰ بھی پوری طرح نہیں ادا کیا جانا اور خراب حالت میں واپس کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک عام بے پرواہی لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ چاقو، قلم، پنسل وغیرہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو نہ صرف مالک کی اجازت و اطلاع کے بغیر اٹھالے جاتے ہیں بلکہ کام نکل جانے کے بعد فوراً اپنی جگہ پر پہنچا بھی نہیں دیتے۔ غریب مالک اپنی ضرورت پر ڈھونڈھتا پھرتا اور پریشان ہوتا ہے۔ ایک اور بد انتظامی و بد سلیقگی ہم میں اور ہمارے گھروں میں کم و بیش و باہمی کی طرح پھیلی ہوئی ہے، نہ چیزوں کی جگہ مقرر ہوتی ہے نہ کاموں کا وقت، جس کی بدولت وقت ضائع اور چیزیں رواں دواں بھی بہت ہوتی ہیں اور بار بار وقت اور جگہ پر چیز نہ ملنے سے پریشانی بھی ہوتی ہے اور نقصان بھی، پس بظاہر یہ باتیں جزئیاتی، لیکن ان سے نفس و قلب دین و دنیا سب کے بڑے بڑے کلیاتی اخلاقی و معاشرتی مفاسد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کو ہلکا اور حقیر جاننا خود ہماری عقل و فہم کے ہلکے پن کی دلیل ہے۔

عرض کرنا ہی ہے کہ جس طرح ہم مسلمانوں کے دین دنیا سب کے فساد دیا

بگاڑ کا سب سے بڑا سرچشمہ ہمارے گھر ہیں، اسی طرح ہماری اصلاح یا بناؤ کی کارگرو پائیدار صورت بھی گھروں ہی سے اس کی ابتدا ہے۔ مسلمان معاشرہ یا امت میں کوئی گھر عمومی و اصلاحی انقلاب بے اس کے برپا نہیں کیا جاسکتا کہ اصل توجہ گھروں کی زندگی یعنی معاشرہ کے ہر واحد یا اکائی (گھر کی) کی اصلاح و انقلاب پر ہو۔

ان سطروں کو لکھ ہی رہا ہوں کہ جماعت اسلامی (ہند) کے آرگن دعوت کا ایک اقتباس سامنے آگیا۔ احمدی حضرات کو ان سے اختلاف کے باوجود یورپ افریقہ میں اسلام کی خدمت پر داد دی گئی ہے کہ:-

”یہ لوگ کرہ مریخ سے وارد نہیں ہوئے، انھوں نے اپنے خاص نظام کے تحت

اپنے نظریات و عقائد کی تربیت حاصل کی اور اپنے کردار کو پختہ کیا اور مذہب

کی جو دولت انھوں نے پائی اس کو لے کر وہ افریقہ اور دوسرے ممالک میں پہنچے

اور ایقان کے سہارے اس کی دکانیں وہاں سجائیں جہاں دین کا نام لینا بھی

دوسروں کے لئے باعث شرم ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ احمدی حضرات کا اس طرح دور دراز ملکوں تک پہنچ کر اپنی جیسی

دین کی دعوت و خدمت کی جد جہدان کے کردار و ایقان کی تربیتی پختگی ہی پر مبنی ہے

اور یقیناً وہ اپنے گھروں یا اہل و عیال میں اپنے نظریات کی ایقانی تعلیم و تربیت

کا اہتمام اس سے بہت زیادہ کرتے ہیں جس کا ہمارے اچھے اچھے علماء و مشائخ کے

گھرانوں میں کم ہی ہوتا ہے نتیجہ معلوم ہے کہ ہمارے

”جو لو جوان گھری پر اسلام سے واقف نہیں جن کے پاس نہ خزانہ ہے نہ اس کی کنجی، وہ مغربی ممالک میں جا کر یہی کر سکتے ہیں کہ انھیں اپنی اسلامیت پر شرم آئے اور مغربی افکار سے متاثر ہوں اور فیصلہ یہ کریں کہ مغربی قوموں نے مذہب سے آزادی حاصل کر کے ترقی کی اور اس کی وجہ سے انھیں مشرق پر برتری حاصل ہوئی۔ گویا اصل مسئلہ تربیت کا ہے اسلام اور کفر کا نہیں ہے۔ گھر کے ماحول میں جو رنگ چڑھ جائیگا خواہ اسلامی رنگ ہو یا غیر اسلامی، اسے مغربی ممالک میں جا کر نکھرنے کا موقع ملتا ہے جو شخص گھر میں اسلام کی تربیت سے محروم رہا وہاں جا کر اور اضافہ ہوگا، اور جس نے یہ نعمت گھر پر حاصل کر لی وہ کہیں بھی چلا جائے اپنی پونجی کی حفاظت ضرور کرے گا۔“

سوال فقط یہ ہے کہ گھر میں یہ رنگ چڑھنا یا اس نعمت کا حاصل کرنا خالی گھر کے باہر کی تقریروں، تحریروں، رسالوں، جلسوں، کانفرنسوں، کنونشنوں، مدرسوں، اداروں وغیرہ سے ممکن ہے؟ یا خود گھر کے اندر کسی نظام و انتظام کی ضرورت ہے؟ اور کیا ایسا کوئی انتظام ”کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ“ والے خود گھر کے راعی یا نگران کا اپنی مسئولیت و مواخذہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے سوا کافی و کارگر ہو سکتا ہے؟ غرض اصل مسئلہ اگر کفر و اسلام کا بھی نہیں بلکہ اسلامی تربیت کا ہے، تو اس مسئلہ کا اصل حل بھی ایک اور صرف ایک ہے کہ اصل زور اصلی تربیت کا ہوں یعنی

۱۶ جون ۱۹۷۱ء

مسلمان گھروں کو مسلمان بنانے یا ان کی اصلاح و انقلاب پر لگانا چاہئے۔ پھر ان واحدوں یا اکائیوں سے جو معاشرہ مرکب ہوگا وہ آپ سے اسلامی معاشرہ اور اسلام کی خیر امتزاور دنیا کی بہترین قوم ہوگی۔

ایسے ٹھوس گھریلو انقلاب و اصلاح کی تدبیر بھی ایک ہی ہے کہ طول و عرض کے پھیلاؤ سے قطع نظر کر کے بہتر ہوگا کہ زیادہ نہیں کم و بیش پانسوی مسلمان بستی یا آبادی کو کوئی معتدبہ درجہ میں علم و عمل کی مخلصانہ و مصلحانہ صلاحیتیں رکھنے والا لے کر بیٹھ جائے اور اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک اس آبادی کے گھروں کی بہت بڑی اکثریت کم از کم ۷۵ فی صد کی مطلوب اصلاح نہ ہو جائے۔ مرکز اس کا مسجد ہو جس میں دو چار چار گھر کے سردھروں یا راعیوں کو ان کی فرصت کے مناسب وقت میں جمع کر کے یا خود ان کے گھر جا کر بار بار ان کی ایمانی و اسلامی راعیانہ ذمہ داریوں کو ذہن نشین کرائے۔ اور ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ ضروری ضروری احکام یا اوامر و نواہی کی عام وعظ و تقریر کے ذریعہ مردوں عورتوں سب کو یک جا کر کے تعلیم و ترغیب ہو۔ جس میں حقوق اللہ کے فرائض و واجبات کے بعد سب سے زیادہ اور حقوق عباد کے فرائض و واجبات اور خصوصاً ایسے نواہی پرہیزوں سے ذرا بھی ایک سے دوسرے کو کوئی جانی و مالی اذیت پہنچ کر آپس میں بے لطفی یا دلوں میں کدورت پیدا ہوتی ہو۔ بچوں کے لئے جو مکتب ہو اس کے نصاب میں بھی ایمانیات و عبادات کے فرائض و واجبات کے بعد خصوصی توجہ بندوں کے باہمی معاملاتی و اخلاقی اور

معاشرتی چھوٹے بڑے حقوق و فرائض پر ہو۔ اور بڑی کتابی تعلیم کی تشویق و ترغیب سے بڑھ کر انعامات وغیرہ کے ذریعہ بچوں میں اخلاق و معاشرت کی عملی باتوں کا ذوق و شوق بڑھایا جائے کہ کھیل کود ہر چیز میں آپس میں ان کا خیال رکھیں۔

بچوں سے بھی بڑھ کر ہر گھر کے بڑوں کو اس کی تعلیم و تاکید ہو کہ گھر کے اندر کی طرح گھر کے باہر پاس پڑوس والوں، اپنوں، پرانیوں، مسلمانوں غیر مسلمانوں سب کے ساتھ لین دین کے معاملات ہی میں نہیں، میل جول یا اخلاق و معاشرت ایسے اسلامی اوامر و نواہی کا بھی پورا خیال رکھیں، جن سے دوسروں کو راحت زیادہ سے زیادہ پہنچے اور اذیت سرے سے نہ ہو کہ دلوں کا ملنا اس کے بغیر ممکن نہیں۔ ان باہر والوں مسلمانوں میں آپس میں جو چھوٹی بڑی نزاع پیدا ہو، مسلمان اپنے اسلامی حکم ہی کی رو سے اس کی اصلاح میں خود پیش قدمی کرے (اصححو اذات بینکم) بلکہ موقع آنے پر غیر مسلمانوں کی دشمنوں تک کے ساتھ انصاف و احسان کرے کہ اسلام جس تقویٰ کا مطالبہ کرتا ہے اس کا تقاضا یہ بھی ہے (لا یجرمنکم شتان قوم الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقویٰ)

اگر کسی نزاع کے فریقین خود اصلاح میں کوتاہی کریں تو مسلمان معاشرہ کا ہر فرد حسب موقع مامور ہے کہ وہ درمیان میں پڑ کر اصلحوابین اخویکم کے حکم کے مطابق نزاع کو دور کرنے کرانے یا مصالحت کی سعی و تدبیر میں اپنی والی کوئی کمی نہ کرے مسلمانوں کے متعلق تو ہر مسلمان پر اسلامی اخوت ہی کی بنا پر اس اصلاح کا فرض

عائد ہے لیکن راقم ہڈانے تو ایک بڑے صاحب حال و قال بزرگ کو دیکھا، جو عرصہ تک سٹن جج بھی رہ چکے تھے کہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان فریقین میں صلح ہی زیادہ تر کر دیتے تھے اس زمانے کی عدالتوں سے کسی مسلمان یا انسان کو بچالینا اس کی دنیا و دین کی بہت بڑی خیر خواہی ہے۔ اس لئے کہ ان میں قدم رکھنے کی پہلی شرط اسلامیت و انسانیت سب کو خیر باد کہہ دینا ہے۔ اور اسلامیت یا مسلمان ہونے کے تو اس کے سوا کوئی معنی نہیں کہ "زندگی کے تمام معاملات و منازعات میں خدا و رسول یا ان ہی کے مطابق حکم کرنے والوں کے احکام کے آگے سر ڈال دیا جائے۔ پھر اگر ان میں بھی کوئی اختلاف ہو تو اس کی بھی زیادہ علم والوں سے تحقیق کر کے بالآخر خدا و رسول ہی کے حکم کو مرجع بنایا جائے، یہی خدا و آخرت پر ایمان لانے کے معنی ہیں۔ باقی جو لوگ ایمان و اسلام کا دعویٰ کر کے بھی غیر خدائی احکام کو قبول کرتے ہیں وہ دراصل خدا کے بجائے شیطان یا طاغوت کو اپنا خدا بتا لیتے ہیں، جن کی سرشت ہی خدا سے طغیان و بغاوت ہے تو گویا شیطان جس سے ہم کو کفر کا حکم دیا گیا تھا، اُلٹے اس پر ایمان لابیٹھتے ہیں، ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ "شیطان نے ان کو گمراہ کر کے ایمان کی راہ سے بہت دور جا پھینکا۔" یا زبان سے اسلام کے دعوے اور عمل سے اس کے انکار کو صریح کفر نہیں کفر سے بدتر نفاق کہہ لو۔ جیسا کہ آگے ہی اسی سلسلے میں ہے کہ "ایسے مدعیانِ ایمان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم اپنے ایمان کے دعوے

۱۔ حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ



میں سچے ہو، تو آؤ خدا و رسول کے حکم کو قبول کرو، تو صاف پہلو تہی پر اتر آتے ہیں اور ذرا آگے کیسی لرزادینے والی تثبیہ و تہدید رسول اسلام ہی کو خطاب فرما کر ہے کہ قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ اس وقت تک مومن (یا مسلمان) نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑوں میں آپ سے (یعنی شریعت کے مطابق) تصفیہ نہ کرائیں پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور پوری پوری طرح اس کو تسلیم کر لیں۔

اگر گھروں میں اپنی اپنی جگہ اسلامی زندگی پیدا ہو گئی تو یا ہر بھی آپ سے آپ ایسے مسلمانوں میں اول تو جھگڑے رونما ہی کم ہوں گے اور جو ہوں گے ان کے فیصلہ میں آسانی سے فریقین کو شریعت کا حکم ماننے پر آمادہ کیا جاسکے گا۔ اور جب تک کوئی مجبوراً واضطرار نہ ہو معاشرہ کے دباؤ کے خلاف انشاء اللہ عدالت کا رخ کرنے کی کوئی ہمت نہ کرے گا۔ کیونکہ ایسے اسلامی معاشرہ میں جمہورٹی گواہیوں وغیرہ سے درد دینے والے اس کو قدم قدم پر آج کل کی طرح کہاں ملیں گے۔ تاہم اس نظم و نظام کے تحت اصلاحی کام کرنے والوں کو اپنے اپنے حلقہ یا واحدہ میں اس کا خصوصی اور پورا اہتمام رکھنا چاہئے کہ آپس کا کوئی جھگڑا عدالت کے دروازہ تک نہ جانے پائے۔ الا انکہ فوجداری وغیرہ کی کسی غیر معمولی صورت میں خود حکومت ہی دخل ہو جائے

لے یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم . . . .  
 یصدون عنک صدودا . . . . فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر  
 بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت ویسلطوا تسلیماً۔ (نساء ع ۹۰۸)

اور معاملہ باہمی تصفیہ و مصالحت کے اختیار سے باہر ہو جائے۔

مسلمانوں کے قریباً تمام طبقوں جماعتوں وغیرہ میں ایک خدا ایک رسول اور ایک کلمہ توحید والی وحدت رکھ کر بھی جو ہر جگہ تمام انفرادی و اجتماعی زندگی میں بنیاد مہرصوص "والے اتفاق و اتحاد کے بجائے کہنا چاہئے کہ افتراق و انشقاق ہی کے کلمہ کا دور دورہ ہے، اس کا بھی واحد علاج غیر اسلامی گھربلو زندگی ہی سے اصلاح کا آغاز ہوگا۔

اصل میں اسلام کی روح و مزاج آج کل کی خودداریوں نفسانیوں پر مبنی نام نہاد آزادی نہیں بلکہ خدا و رسول یا شریعت کی بے چون و چرا غلامی ہے، اس غلامی یا اطاعت کو تعلیم و تربیت سے گھروں میں اس طرح پیدا کرنا کہ گھر کے راعی یا نگران کی اطاعت بھی اسلامیت و شریعت یا خدا و رسول کی رضا و نارضی ہی کے ماتحت ہو اور پھر ایسے گھروں سے مل کر معاشرہ کی جو اکائیاں یا واحدے وجود میں آئیں گے، ان میں بھی آپ سے آپ شریعت کے دائرے سے نکل کر تفرق و تشتت کی گنجائش کم سے کم ہی نکل سکے گی۔ اسلامی مزاج کی رو سے جس طرح ہر گھر کا ایک مطلع راعی و نگران ہونا ضروری ہے، جس کے گھر والے سب کے سب شریعت کے ماتحت احکام میں بے چون و چرا مطیع ہوں، اسی طرح تنظیم کے لئے ایسے گھروں کے جو مثلاً پانچ پانچ سو آبادی کے حلقے یا اکائیاں بنائی جائیں ان کا بھی ایک صاحب امر راعی و نگران یا سردھرا ہو۔

اور ایسے حلقوں میں اصلاح کا کام کرنے والے اہل علم و صلاح (یا دینی دارالعلوموں کے صالح تربیت یافتہ) جہاں ایک طرف ہر حلقہ کے ہر گھر کی اصلاح کریں وہاں دوسری طرف پورے حلقہ میں جو دینی اصلاح کے قبول کرنے کی صلاحیت و قابلیت سب سے زیادہ رکھتا ہو، اس کو ضروری تعلیم و تربیت سے معتد بہ درجہ میں اس کا اہل بنایا جائے کہ وہ اس پورے حلقہ کا سردار یا راعی ہو۔

اس کی استعدادی اہلیت و صلاحیت کی سب سے اہم و اقدم شرط بھی وہی ہوگی کہ جاہلی و بالی حرص و طمع کا مادہ اس میں نہ ہو، یا اتنا کم ہو کہ تربیت سے اس کو حدود میں لایا جاسکے، ایسے ہی شخص پر لوگ قدرۃً زیادہ اعتماد و اتفاق کر سکیں گے خصوصاً جب تربیت کے بعد اس کی بے غرضی و انصاف پسندی کے تجربات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ عملی تربیت کے ساتھ ساتھ ضروری دینی معلومات کی جو کمی اس میں ہو وہ بھی پوری کرائی جائے۔ جس کے لئے عربی داں کیا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں۔ تاہم آج کل سہولت اسی میں زیادہ ہے کہ کوئی ایسی جامع کتاب اس کو سبقاً سبقاً سمجھا کر پڑھا دی جائے جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد و اخلاق و معاملات اور معاشرت سب کے ضروری ضروری روزمرہ پیش آنے والے مسائل اور ان کے اصلاحی معلومات پر حاوی ہو۔ اب یہی مقامی

۱۔ بہشتی زیور کے سوا ایسی کتاب کسی دوسری زبان یا عربی تک میں معلوم نہیں۔ البتہ اس کی زبان کو ذرا عصری بنا کر ایک عصری ایڈیشن کی ضرورت ہے۔ ۱۲۔

شخص اپنے پورے واحدہ کے تمام گھروں کا مستقل نگران پارا عی و امیر ہوگا۔  
 جس دین نے اپنی امت و معاشرہ کو بات بات میں اختلاف و خود رانی یا  
 تفرق و انتشار کے مفاسد سے بچانے اور اجتماعی انضباط (ڈسپلن) پیدا کرنے کے لئے سفر  
 کی عارضی رفاقت تک میں اطاعت پر اتنا زور دیا ہو کہ تین آدمی بھی اگر ساتھ سفر کریں  
 تو ایک کو اپنا امیر یا مطلع بتالیں، وہ یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ کسی چھوٹی بڑی  
 مستقل آبادی کے افراد "شتر بے ہمار" زندگی کے لئے چھوڑ دیئے جائیں . . . . .  
 اور جس طرح ایسے ہم سفروں کا یہ عذر لایا جاتا ہے کہ بلا اسلامی حکومت کے ایسا امیر  
 سفر کیسے بتایا یا منتخب کیا جائے، اسی طرح نام کی مسلمان یا غیر مسلمان کسی حکومت  
 میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے انتشار و پراگندگی کی زندگی بسر کرنے کا خود اسلام  
 کی نگاہ میں قطعاً یہ کوئی معقول و مقبول عذر نہیں ہو سکتا کہ جب تک سیاسی و حاکمانہ  
 اقتدار رکھنے والا کوئی مسلمان امیر و حاکم نہ ہو ہم جاہلیت کی موت مرتے ہیں۔ اسلامی  
 زندگی کا تو اولین مطالبہ اپنی وسعت و اختیار بھر اس کے احکام پر ہر موافق و مخالف  
 ماحول میں عمل کرنے کرانے کی جو صورتیں پیدا کی جاسکتی ہوں ان کے بہر حال ہم  
 مکلف ہیں۔ صاحبِ اقتدار حقیقی اسلامی حکومت ہر جگہ ہر وقت قائم کر کر لینا  
 ہمارے اختیار میں نہیں لیکن ہمارے تھوڑے بہت جو معاملات مسلمان یا غیر مسلمان  
 حکومت کی قانونی گرفت و مداخلت سے باہر ہیں کم از کم ان میں اسلامی احکام کے مطابق  
 اجتماعی زندگی بسر نہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لازماً اختیار بھر اس کی

تکمیل ہم پر لازم ہے کہ کسی نہ کسی نظم و نظام کے تحت اپنا کوئی امیر یا راعی و نگران بنالیں  
 پھر خدا کو راضی کرنے کی مخلصانہ نیت کے ساتھ چھوٹی سی چھوٹی مسلمان آبادی بھی اپنے  
 اختیار کی حد تک اپنے کو اسلام کی منضبط نگرانی و اطاعت میں دیدے گی تو مزید وسعت  
 کا آگے راستہ "إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ" کے وعدہ کے تحت قدرتی طور پر خود ہی  
 انشاء اللہ کھلتا چلا جائے گا۔ اور اس راستہ سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا، سیاسی اقتدار  
 والے حقیقی اسلامی غلبے کے ظاہری اسباب بھی پیدا ہو کر رہیں گے۔ باقی آج کل  
 جو زیادہ تر غیروں کی ریس میں مسبب الاسباب سے عملاً قطع نظر کر کے حاصل  
 اسبابی راہوں پر زور دیا جا رہا ہے تو یہ ایمانی و اسلامی منطق کی رو سے ایسی الٹی  
 راہ ہے کہ مسلمانوں کے حق میں بالخصوص اس خدا چھوڑی راہ کے نتائج بھی جس طرح  
 صدیوں سے روز بروز اٹنے لگے ہیں آئندہ بھی اٹنے ہی سکتے رہیں گے۔ یہی سبق و  
 شہادت چودہ سو سال کی پوری اسلامی تاریخ کا ہے۔

۱۵ اس کا ایک عملی تجربہ بہار کی انارٹ شرعیہ کی صورت میں وقت کے مستند و مسلم صلحا و علما فرما بھی  
 چکے ہیں اور اس پر کافی تخریری مواد بھی موجود ہے جو قابل مطالعہ و توجہ ہے نظری و عملی دونوں  
 اعتبار سے۔ آگے نہ بڑھنے کا سبب ٹھوس عملی خدشات کا ہمارے اندر روز افزوں قحط ہے،  
 دوسرے اس تنظیم کے حضرات کی نظر میں آبادیوں کی چھوٹی چھوٹی محدود مذکورہ طرز کی اکائیاں بنا کر  
 ان میں اس نظم و انتظام کو پختہ فرمانے کی طرف نہیں گئی جس کی وجہ سے کوئی ہمت افزا اچھا  
 عملی نمونہ ایک بھی سامنے نہ آسکا، نہ علماء خواص کے، نہ عام مسلمانوں کے۔ سراپا نابکار و تباہ کار  
 راقم ہذا کے نزدیک ضرورت اسی کی ہے کہ ابتدا خواہ محدود آبادی سے ہو لیکن ہو وہ نمونہ کا بار آور  
 صلح تخم۔

پہر حال واحدہ دار مضبوط و منضبط طریق کا جو ایک سرسری نقشہ اوپر پیش کیا گیا ہے  
 ایسے ہی عملی نقشہ کے تحت ان واحدوں کی تعداد جیسی جیسی بڑھتی جائے تو مثلاً قریب  
 قریب کے پانچ واحدوں کو بلا کر ان کے مقامی راعیوں یا امیروں میں جو اپنے صدق  
 و اخلاص علم و عمل فہم و تدبیر کے لحاظ سے بہ حیثیت مجموعی زیادہ اہل ہو، اس کو ان  
 پانچوں واحدوں کے راعیوں کا ذمہ دار راعی و نگران یا امیر قرار دیا جائے۔ و قس علی ہذا۔  
 اس سلسلہ کو ضلع وارا اور اضلاع کو صوبہ یا ریاست وارا اور ریاستوں کو ملک گیر  
 بنایا جاسکتا ہے۔

بیشک ہے یہ شیخ چلی کی بلکہ اس، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس شیخ چلی کو

۱۰ آج کل کی نام نہاد جمہوریت و عوامیت میں اور اس کے انتخابی لاکھوں کروڑوں ووٹروں کے  
 لاکھوں کروڑوں کے مصارف (امریکہ کے نئے صدر کے انتخاب میں ۸۱ کروڑ خرچ ہوئے) کے علاوہ طرح  
 طرح کے مفاسد اور ہڑ بونگ، تو سرے سے اسلامی مزاج و روح کی ضد ہی ضد ہیں۔ اس کو بھی  
 اسلامی نقشہ میں اگر جگہ مل سکتی ہے تو ہر بالغ کی ہڑ بونگی رائے دہندگی کی صورت میں نہیں، بلکہ  
 ہر واحدہ کے معتمد راعیوں کی نمائندگی کے واسطے سے۔ اس طرح کہ مثلاً ایسے پانچ پانچ سو والے  
 بیسٹ واحدوں کے نمائندے اپنے میں دس ہزار کے لئے ایک راعی و نمائندہ منتخب کریں۔ اور پھر ایسے  
 دس ایک لاکھ کے لئے۔ اور وہ دس ایک کروڑ کے لئے یہاں تک اوپر جاتے جاتے اخلاص و عمل  
 علم و فہم ہر اعتبار سے ملک کے چیدہ چیدہ و معتمد نمائندے اسلامی خلیفہ کو اپنے ہی میں سے منتخب  
 کریں۔ اس کی تفصیل شاید کچھ تجدید سیاست میں ہو سکے۔ گونرے کاغذی "سلسلہ تجدید" کی کتابوں  
 نے اب اس سے بھی دل سرد کر دیا ہے۔ صرف یہ خیال کچھ ہمت بندھا دیتا ہے کہ شاید "کودک ناداں"  
 کے قلم کا یہ تیرا اتفاقاً اگر صحیح نشانہ پر پڑ گیا ہو، اور کسی صاحب عمل و اخلاص کی نظر اس پر پڑ جائے تو  
 وہ کچھ کام لے لے۔

عقلاً و نقلاً ہر طرح پورے شرح صدر کے ساتھ اس امر پر اطمینان و اصرار ہے کہ مسلمانوں کا دین و دنیا کا بیڑا صرف اور صرف ایمان و عمل صالح کی زندگی پیدا کرنے سے پار ہوگا اور یہ بار بار دہرانے کی بات ہے کہ عمل صالح سے صرف روزہ تہا ز وغیرہ کے عبادات ہرگز مراد نہیں۔ حقوق عباد کی اہمیت تنظیم کے ہر مرحلہ پر مد نظر رہنا لازم ہے۔ اس اطمینان و اصرار پر اکھنڈ امام غزالیؒ جیسے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مسلم امام مصلح و مجدد کی ایسی تحریر و تجویز نے ہر لگادی جس کی تفصیل اوپر ص— پر گذر چکی۔ باقی زیادہ تر عصری و فرنگی رنگ میں شراہور جیسی تحریکوں اور تدبیروں یا کاغذی دفتروں کے بیڑوں پر بیڑے بناتے چلے جانے سے ہماری دین و دنیا کا کوئی بھی بیڑا ہرگز ہرگز پار نہ لگے گا۔ ان کی قسمت تو دیر سویر ڈوبنا ہی ہے جس کے آنے دن تجربات مسلمانوں کے حاکم و محکوم سب ہی ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں۔



۱۷ آج کل جلیپور کے انتہائی وحشیانہ و جارحانہ اور خونیں فسادات سے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو بھڑپور تینبھی تازیانہ لگا ہے تو اس سلسلہ میں بھی کہنا چاہئے کہ توجہ تمام تر صرف کنونشنی راہوں پر ہے۔ اور ایک کنونشن کے جوڑ پر آج ہی (۲۱ جون ۱۹۷۷ء) کے اخبار میں دوسرے کنونشن کی تیاری کی خبر پڑھی انا للہ ثم انا للہ۔

## مَقْدِمَةٌ

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مسلمان کیا کریں؟

مسلمان اپنے مسلمان ہونے کا مطلب کچھ سمجھیں تو یہ سوال حیرت ناک و عبرتناک ہی نہیں انتہائی شرمناک بھی ہے! اسلام کے حق میں خود سراپا رسوائی راقم نابکار اپنے بھائیوں کی جن باتوں کو دیکھ سُن اور پڑھ کر گڑھتا ہے، ان میں اس سوال و بحث کا نمبر شاید سب سے بڑھ گیا۔ جب تک ہمارے بعض اخبارات و رسائل میں اس کا چرچا رہا جب کہیں نظر پڑ جاتی دل و دماغ پرتازہ ہم بھٹتا۔

غضب خدا کا جس اسلام پر ہم کو ایمان کا دعویٰ ہے اور جس کا دعویٰ یہ ہے کہ "دین" و "نعمت" ہر حجت سے کامل و مکمل فرما کر رہتی دنیا تک انسان کی صلاح و فلاح کے لئے اپنی رضا مندی کو بالکل خدائے اس کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، وہ معاذ اللہ چودہ سو سال کے اندر ہی ایسا فرسودہ و ناکارہ نکل گیا کہ خود اس کے نام لیوا بڑھواس پوچھتے پھر میں کہ مسلمان کیا کریں؟ اور جواب کے لئے اپنی ہی نہیں پرائیوں تک کا منہ نکتے پھر میں کاش زمین بھٹ جاتی اور اسلام اور اس کے خدا و رسول کو رسوا کرنے والے ہم مسلمان اس میں دھنس جاتے۔

پھر جب سوال یہ ہے کہ مسلمان کیا کریں؟ تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جاسکتا ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر یا اپنی اسلامیت کے انفرادی و اجتماعی